ایک شریف زادی کی کہانی جو دشمنوں کے لیے آندھی ثابت ہوئی۔ ہر صفحے پر ایک نیا ڈرامہ، ہر سطر حیرت انگیز، نان سٹاپ ایکشن۔ ایک خونچکاں آپ بیتی۔

آندھی

اوّل

طاہر جاوید مغل

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔فون ۷۲۳۴۷۴۱۴

1168

بار اول ـــــ ۱۹۹۸ء
مطبع ـــــ یُو اینڈ می پرنٹرز لاہور
قیمت ـــــ ۱۵۰/۰ روپے

اسٹاکسٹ
علی بُک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال
لاہور فون: ۷۲۲۳۸۵۳

انتساب............

خالہ مرحومہ مریم بیگم کے نام.......... جنھوں
نے ماں سے بھی زیادہ پیار دیا۔ خدا انہیں اپنی
رحمت کے سایے میں رکھے۔

طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

میری پہلی کتاب "پرستش" کی آپ نے جس طرح پذیرائی کی اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ "پرستش" کے بعد "آندھی" کے عنوان سے یہ دوسری کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ ایک طویل ناول ہے۔ ہمارے اور آپ کے آس پاس کی کہانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پنجاب کے دیہی ماحول میں پروان چڑھتی ہوئی یہ داستان آپ کو اپنے سحر میں گرفتار رکھے گی۔ آپ خود کو مرکزی کردار شاہ محمود کا ہمسفر پائیں گے۔ آپ اس کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں سے گزریں گے' پگڈنڈیوں پر دوڑیں گے اور پُراسرار حویلیوں میں اُتریں گے......... آپ کو اِس کہانی میں حیوان صفت جاگیردار بھی نظر آئیں گے۔ دوہرے چہروں والے سیاستدان بھی ملیں گے' عیار صنعت کار بھی اور وہ لوگ بھی جو کچھ نہیں ہوتے صرف انسان ہوتے ہیں۔

یہ اُس لڑکی کی کہانی ہے جو پُرسکون زندگی گذار رہی تھی مگر آناً فاناً آندھیوں کی زد میں آ گئی۔ واقعات اور حادثات کے تند بگولے اُسے تنکے کی طرح اڑاتے چلے گئے.......... وہ اُڑتی رہی' بھٹکتی رہی' یہاں تک کہ خود بھی آندھی بن گئی.......... اور کیوں نہ بنتی.......... وہ ایک بچے کی ماں تھی اور اُس کے دل پر پاتال سے گہرا زخم تھا۔

ماں اور بچے کا اٹوٹ رشتہ اِس کہانی کا محور ہے.......... عورت کتنی بھی کمزور ہو لیکن ماں کبھی کمزور نہیں ہوتی اور جب سوال اُس کے بچے کا ہو تو وہ فولاد سے سخت اور ہمالیہ سے زیادہ ثابت قدم ہو جاتی ہے۔ وہ وقت کے بڑے سے بڑے فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے اور کہتی ہے "مجھے معمولی مت سمجھو' میں غیر معمولی ہوں' میں ماں ہوں۔"

یہ کہانی لکھتے ہوئے کئی بار میری آنکھیں بھیگی ہیں۔ میں نے اُس درد کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محسوس کیا ہے جو شاہ محمود کے حصے میں آیا تھا۔ اُس بے کراں درد کو اپنے سینے میں سمیٹ کر وہ نازک اندام لڑکی' انسانوں کے جنگل میں برہنہ پا بھٹکتی رہی اور مجھے بھی بھٹکاتی رہی۔ وہ کہاں کہاں نہیں گئی؟ اُس نے زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے۔ وہ

ضرورت کے تحت مسکرائی بھی، ہنسی بھی، زندہ لوگوں سے مل کر "زندوں" کی طرف نظر
بھی آئی بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اُسے اپنے محبوب سلیم کے زخموں پر مرہم رکھنا
پڑا.......... لیکن پھر بھی اُس کے روز و شب پر وہی ایک دلخراش لمحہ محیط رہا جس کا تعلق
اُس کے معصوم فرحان سے تھا.......... ہاں یہ اُس لمحے کی کہانی بھی ہے جب انسان ٹوٹ
کر ریزہ ریزہ ہوتا ہے اور اُس کے اندر سے ایک نیا انسان نمودار ہوتا ہے۔

قارئین کرام! یہ کہانی فیملی میگزین میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہے۔ کتابی شکل میں
اس کی اشاعت کی اجازت دینے پر میں فیملی میگزین کے محترم مدیر اعلیٰ جناب مجید نظامی
اور مدیر جناب علی سفیان آفاقی کا شکرگزار ہوں۔

اِس کہانی کے آغاز سے لے کر کتابی شکل میں آنے تک آفاقی صاحب کے قیمتی
مشورے میرے شاملِ حال رہے ہیں۔

بھائی غفار صاحب نے اِس کہانی کو کتابی شکل دینے اور سجانے سنوارنے میں کوئی
دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ایک اچھی کہانی ایک اچھی کتاب میں محفوظ ہو کر قاری کے
لئے مستقل ساتھی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اِس اُمید کے ساتھ یہ کتاب آپ کی
خدمت میں پیش کی جا رہی ہے کہ یہ آپ کے "مستقل ساتھی" کی حیثیت اختیار کرے
گی اور آپ اِسے شیلف میں جگہ دے کر خوشی محسوس کریں گے۔

طاہر جاوید مغل

سلیم سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں مقامی گورنمنٹ کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ کالج کی عمارت کے سلسلے میں انتظامیہ سے ہمارے کچھ مطالبات تھے جن کے لئے ہم نے کلاسوں کا بائیکاٹ کرتے ہوئے گیٹ پر ایک چھوٹا سا احتجاجی مظاہرہ کیا۔ مظاہرے کے سلسلے میں ہم نے سڑک بلاک کر رکھی تھی۔ دفعتاً اینٹیں ڈھونے والا ایک ٹرک آیا اور ہم سے راستہ مانگنے لگا۔ ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ متبادل راستہ اختیار کرے لیکن وہ بھی کوئی خردماغ شخص تھا۔ اڑ گیا کہ گزرے گا تو یہیں سے گزرے گا۔ میں نے اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ ایک قطار بنائی اور ہم ٹرک کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ صورت حال ایک دم ہی ڈرامائی ہو گئی تھی۔ ٹرک والا ہارن کے ساتھ مسلسل انجن کو ریس دے رہا تھا اور ہم چھ سات لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ ڈرائیور ٹرک کو کھسکاتا عین ہمارے اوپر لے آیا۔ ایک دو لڑکیوں نے ذرا کمزوری دکھائی اور پیچھے کو سرکیں۔ ٹرک والے کو حوصلہ ہوا اور وہ ٹرک ایک دم بڑھا کر ہمارے اوپر لے آیا۔ لڑکیاں چیختی ہوئی دائیں بائیں بھاگیں اور وہ ہمارے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ کچھ لڑکیاں کھسیانی ہنسی ہنسنے لگیں کچھ ٹرک ڈرائیور کو صلواتیں سنانے لگیں۔ اپنے طور پر ہمیں سخت پشیمانی بھی ہو رہی تھی کہ سڑک کے اطراف کھڑے کافی لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ٹرک والا فاتحانہ انداز میں چند ہی گز آگے گیا ہوگا کہ ایک نوجوان لڑکا سڑک کے کنارے سے کود کر اس کے سامنے آگیا۔ ٹرک والے کو مجبوراً بریک لگانا پڑے۔ وہ ایک بیس بائیس سالہ دبلا پتلا لیکن غیر معمولی چوڑے کندھوں والا لڑکا تھا۔

اس کے لمبے بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ وہ اچک کر کیبن کے پائیدان پر چڑھا اور دروازہ کھول کر ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا۔ اس وقت میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ زندگی کے ایک موڑ پر یہ لڑکا میرے لئے ان گنت ہنگاموں کا سبب بننے والا ہے۔ ڈرائیور اور لڑکے میں تلخ کلامی ہوئی پھر میں نے دیکھا کہ اچانک لڑکے نے ڈرائیور کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے ڈرائیونگ سیٹ سے سڑک پر لے آیا۔ اس سے پہلے کہ فربہ اندام ڈرائیور اپنے دفاع میں کچھ کرتا دو زوردار گھونسے اس کے منہ پر پڑے اور وہ حواس باختہ ہوگیا۔ لوگ جو ابھی تک خاموش تماشائیوں کی طرح کھڑے تھے ڈرائیور کو پٹتے دیکھ کر لڑکے کے حمائتی بن گئے۔ ٹرک کے وہ مزدور جو ڈرائیور کی اعانت کے لئے آگے بڑھے تھے مخالفین کا جمگھٹا دیکھ کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ سب لوگوں نے حسب توفیق ٹرک ڈرائیور کو برا بھلا کہا کہ وہ اپنی "چھپنے خانی" میں لڑکیوں کی جان سے کھیلنے لگا تھا۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر ڈرائیور اور اس کے ساتھیوں نے معذرت کی اور بمشکل جان بچا کر وہاں سے نکل سکے۔

ٹرک روکنے والا لڑکا سلیم تھا۔ یہ واقعہ اسی محلے کا ہے جہاں میں رہتی تھی۔ ہمارا کالج گھر سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ یہ ایک ملی جلی آبادی ہے۔ موہنی روڈ کی ایک ذیلی سڑک اس آبادی کو دو واضح حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ جنوبی حصہ زیادہ گنجان آباد ہے اور یہاں نسبتاً کم آمدنی والے لوگ رہتے ہیں۔ شمالی حصہ متوسط لوگوں کا ہے۔ یہاں کوٹھی نما مکانوں کی کثرت ہے۔ دو تین کوٹھیاں گلبرگ اور شاہ جمال کے پائے کی ہیں اور اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق' کچھ زیادہ ہی عالی شان نظر آتی ہیں۔ ہماری کوٹھی بھی انہی میں سے ایک ہے۔ ہمارے والد مرحوم نے یہ کوٹھی بڑے اہتمام اور شوق سے بنوائی تھی۔

میں سلیم کا ذکر کر رہی تھی۔ سلیم کے متعلق میں نے پہلے بھی ایک دو دفعہ سنا تھا۔ آبادی کے جنوبی حصے میں لوکل روٹ پر چلنے والی ویگنوں کا ایک اڈا تھا۔ سلیم کے والد کی چند ویگنیں تھیں اور ان کی رہائش بھی اسی علاقے میں تھی۔ محلے میں کہا جاتا تھا کہ رفیق لوہار کا لڑکا سلیم بڑا تیز نکلا ہے۔ بہت ہتھ چھٹ اور لڑاکا ہے۔ ہماری نوکرانی نوری اکثر اس کی مار دھاڑ کی خبریں سناتی رہتی تھی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ وہ سودا لینے بازار گئی۔

دکانوں پر کولڈ ڈرنک کی بوتلیں پہنچانے والا ایک ٹرک مسجد والے چوک میں کھڑا تھا۔ جولاہوں کے دو لڑکے بوتلیں اٹھا کر بھاگ نکلے۔ سلیم نے انہیں پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا ٹرک والوں کے پاس لے آیا۔ بوتلیں برآمد کروادیں اور لڑکوں کو پکڑ کر بٹھالیا۔ اتنے میں ٹرک والوں میں سے ایک کی زبان سے نکل گیا کہ یہ محلّہ ہی چوروں کا ہے۔ بس اس بات پر سلیم سیخ پا ہوگیا۔ اس نے نہ صرف لڑکوں کو چھوڑ دیا بلکہ ٹرک والوں کی خوب دھنائی کی اور طیش میں ان کی دس بیس بوتلیں بھی توڑ ڈالیں.......... ایک روز نوکرانی نے بتایا کہ آج ویگنوں کے اڈے پر ایک لڑکی کو چھیڑخانی کرنے پر جھگڑا ہوگیا۔ سلیم نے دو آدمیوں کو بری طرح مارا۔ وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتی ہوئی بولی۔

"توبہ باجی! وہ کوئی لڑکا ہے۔ مجھے تو طوفان لگتا ہے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے' دونوں یہ اتنے بڑے بڑے ڈشکرے تھے۔ پہلے تو میں سمجھی آج سلیم کی خیر نہیں لیکن جب ان میں سے ایک نے سلیم کو مکا مارا تو اس نے اپنی بکل اتار کر ایک طرف پھینکی اور دونوں کے گریبان پکڑ لئے۔ پھر بڑی تسلی سے انہیں ایک طرف لے گیا اور دھاں دھاں ٹکریں مارنے لگا۔ قسم خدا کی دونوں بچوں کی طرح رونے لگے۔ لوگوں نے مشکل سے جان چھڑائی ان کی۔"

ایسی باتیں نوری عموماً سناتی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے کالج کے سامنے سلیم کو ڈرائیور سے الجھتے دیکھا تو مجھے لگا جیسے میں اسے پہلے سے جانتی ہوں۔ اس کی دلیری نے دل پر عجیب سا اثر کیا۔

میرا خیال ہے میں کچھ بھی آگے کہنے سے پہلے آپ کو اپنے بارے میں بتادوں۔ میں نے امتیازی حیثیت سے گریجویشن کی ہے۔ نفسیات اور ادب سے گہرا لگاؤ رکھتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ کالج کے ابتدائی زمانے میں بھی میرا شعور عام لڑکیوں کی نسبت پختہ تھا۔ اچھے برے کی تمیز تھی اور سب سے اہم یہ کہ اپنے بزرگوں کی عزت کا پاس تھا۔ مگر جو کچھ ہوا وہ اتنا بتدریج اور غیرمحسوس تھا کہ ناقابل مزاحمت بن کر رہ گیا۔ میں سیدھے سیدھے لفظوں میں آپ سے بات کروں گی کیونکہ منافقت مجھے ہمیشہ ناپسند رہی ہے۔ کالج کے سامنے پیش آنے والے واقع کے بعد میں سلیم میں دلچسپی محسوس کرنے لگی۔ وہ منظر بار بار میرے تصور میں آجاتا جب وہ ہماری توہین پر غصے سے بے قابو ہو کر

ٹرک پر چڑھا تھا اور ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ میرا دل چاہنے لگا کہ میں پھر سلیم کو دیکھوں۔ آخر چوتھے پانچویں روز میں اس کوشش میں کامیاب رہی۔ میں چھت پر کھڑی تھی کہ وہ چند لڑکوں کے ساتھ سڑک سے گزرا۔ لمبا نکلتا ہوا قد' کھلے ہاتھ پاؤں اور چال میں عجیب بانکپن۔ وہ ساتھی لڑکوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہمارے دروازے کے سامنے سے گزر گیا۔

اس روز مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرے دل میں کوئی چور دروازہ دھیرے دھیرے کھل رہا ہے۔ مجھے اپنے رویے پر از حد پشیمانی ہوئی۔ میں کیوں ایک ناپختہ ذہن لڑکی کی طرح چھپ چھپ کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ میں جانتی بھی تھی کہ ایسے مشغلے اکثر اوقات سنگین صورت اختیار کر جاتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اب کبھی اس طرح کا خیال دل میں نہ لاؤں گی۔ اس کے بعد میں کبھی سلیم کو دیکھنے چھت پر نہیں گئی۔ مگر اس کے باوجود اس سے اکثر آمنا سامنا ہوتا رہا۔ ہمارے کالج کے راستے میں ایک نیا ویڈیو سنٹر کھلا تھا۔ وہ اکثر وہاں کھڑا ملتا تھا۔ میرے بڑے بھائی جو اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہیں۔ ہاسپٹل جاتے ہوئے مجھے گاڑی پر کالج چھوڑ جاتے تھے۔ واپسی پر میں کلاس فیلوز کے ساتھ پیدل آ جاتی تھی۔ عموماً میں کن انکھیوں سے سلیم کو دیکھتی۔ وہ حسب عادت ساتھی لڑکوں سے دھول دھپے میں مصروف ہوتا تھا۔ اس کے اندر جیسے ہر دم کوئی پارہ مچلتا رہتا تھا مجھے یاد نہیں پڑتا میں نے کبھی اسے سکون سے کھڑے پایا ہو۔

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سلیم کو میرے ذہن پر بری طرح سوار کر دیا۔ جہاں سے ہماری آبادی کا گنجان آباد حصہ شروع ہوتا تھا وہاں ایک میدان تھا۔ عموماً لڑکے بالے یہاں کرکٹ کھیلتے نظر آتے تھے۔ ایک روز میں چھت پر گئی تو وہاں ٹینٹ لگا دیکھا۔ ٹینٹ کے گرد ایک دائرے کی شکل میں تماشائی کھڑے تھے۔ ہائی فائی پر انڈین اور پاکستانی گانے بھی بجائے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں ایک سائیکلسٹ چھ روز مسلسل سائیکل چلائے گا۔ محلے والوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ بچے بوڑھے ذوق و شوق سے یہ تماشا دیکھنے آنے لگے۔ ان میں اکثریت جنوبی حصے کے رہائشیوں کی ہوتی تھی۔ ایک روز میں صحن میں امی کے ساتھ بیٹھی تھی کہ باہر سے بھگدڑ کی آوازیں آئیں۔ ہماری نوکرانی باہر سے بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے بتایا کہ میدان میں لڑائی ہو گئی ہے۔ میں امی جی کے

آگے آگے سیڑھیاں چڑھتی چھت پر پہنچی تو ٹینٹ کے اردگرد زبردست ہلچل نظر آئی۔ تین چار آدمی ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ تب میری نظر سلیم پر پڑی اور جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس ہلچل کا مرکز وہی تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ لڑائی ہمارے پڑوسی "اعوانوں" سے ہوئی تھی۔ وہ پانچ بھائی تھے اور پانچوں ایک سے ایک بڑھ کر لمبے چوڑے اور صحت مند' محلے میں ان کا کافی رعب تھا۔ میرا چھوٹا بھائی پرویز جس کی اٹھارہ انیس سال تھی ان کا گہرا دوست تھا۔ ہوا یہ تھا کہ اعوانوں کے ایک لڑکے "مانی" نے سائیکل سوار کو تنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تماشائیوں کے پیچھے چھپ کر اسے کنکریاں مارتا رہا تھا۔ اس بات پر جھگڑا بڑھ گیا۔ سلیم بھی وہیں موجود تھا۔ اس نے مانی کو منع کیا کیوں غریب کو تنگ کرتے ہو' اس کی روزی کا معاملہ ہے۔ جہاں پانچ روز اسے برداشت کیا ہے ایک روز اور کر لو۔ سلیم کی سرزنش پر مانی آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے کہا میں یہ سائیکل یہاں نہیں چلنے دوں گا۔ اتنے میں مانی کے دو بڑے بھائی بھی آ گئے۔ انہوں نے سائیکل سوار کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ معاملہ بگڑ گیا۔ سلیم' مانی اور اس کے بھائیوں عاصم' قاسم وغیرہ سے الجھ گیا۔ جب میں نے چھت سے دیکھا کم از کم پانچ لڑکے سلیم سے گتھم گتھا تھے۔ ان میں میرا بھائی پرویز بھی شامل تھا۔ شاید آپ کو محسوس ہو کہ میں کسی فلم کا سین بیان کر رہی ہوں لیکن یقین جانیے میں وہی کہوں گی جو میں نے اس روز اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اکیلے سلیم نے اپنے پانچ مدمقابل لڑکوں کی اس بری طرح پٹائی کی کہ موقع پر موجود بیسیوں افراد دنگ رہ گئے۔ اس کی خوفناک ٹکر جس کو لگ جاتی اس کے کس بل نکل جاتے۔ میرے سامنے میرے بھائی پرویز نے ہاکی سے اس پر حملہ کرنا چاہا مگر پرویز کی ہاکی ابھی ہوا میں تھی کہ وہ کسی تیندوے کی طرح جھپٹا اور کھٹاک کی آواز سے ایک ساتھی پر جا گرا۔ میرے اور امی کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں۔ اس دوران عاصم اور قاسم خون تھوکتے اور گالیاں نکالتے ہوئے کوئی ہتھیار لینے کے بہانے گھر کی طرف بھاگ آئے۔ سلیم نے باقی ماندہ دو بھائیوں کو گریبانوں سے پکڑ لیا اور اتنی تیزی اور پھرتی سے انہیں ٹکریں ماریں کہ انہیں جان بچانا مشکل ہو گئی۔ انجام کار وہ بھی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے گھر کی طرف بھاگے۔ کچھ لوگوں نے بپھرے ہوئے سلیم کو پکڑ لیا اور اسے کھینچتے ہوئے موقع پر سے ہٹا لے گئے۔

ہمارے پڑوس میں کہرام مچا ہوا تھا۔ قاسم اور اس کے بھائی اپنے دوستوں
ساتھ سلیم کو مزا چکھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کبھی کوئی بھائی اندر سے پستول نکال
کبھی کوئی ہاکیاں تھامے باہر نکل آتا تھا۔ ان کی والدہ اور بہنیں چیخ چیخ کر انہیں روکنے
کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ انتقام میں اندھے ہو رہے تھے۔ میرا دل انجانے خوف
دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا آج کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم چھت
دیکھ رہے تھے کہ قاسم' اس کے بھائی اور دوست ایک بڑے جلوس کی شکل میں جن
آبادی کی طرف جا رہے ہیں سائیکلسٹ کو دیکھنے والے تماشائیوں کی شمولیت سے یہ جلو
اور بھی بڑا ہو گیا تھا۔ ہر ایک چہرے پر سنسنی نظر آ رہی تھی۔ اس کے بعد کے واقعا
میری نظروں سے اوجھل رہے جو کچھ سنا اس سے پتہ چلا کہ جب قاسم وغیرہ پستولوں او
خنجروں سے مسلح سلیم کے گھر پہنچے تو اتفاقاً وہ اندر موجود نہیں تھا۔ اس وقت وہ ایک قر
مسجد کے غسل خانے میں اپنے خون آلود کپڑے دھو رہا تھا۔ قاسم اور اس کے ساتھیو
نے اس کے گھر کا دروازہ توڑ دیا اور اندر گھس گئے۔ گھر میں صرف عورتیں تھیں یا سلیم
ایک چھوٹا بھائی تھا۔ اعوانوں نے اس کے بھائی کو اتنا مارا کہ اس کا بازو دو جگہ سے ٹوٹ
گیا۔ عورتوں کو بھی پتھر مارے گئے اور گالیاں دی گئیں۔ اس کے بعد یہ لوگ للکارتے اور
خنجر لہراتے ہوئے واپس آ گئے۔ لیکن یہ لڑائی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ سلیم کے بھی چار پانچ
بھائی تھے۔ انہیں اپنی عورتوں کی بے عزتی اور بھائی کی حالت پر کوفت ہونا لازمی تھی۔ وہ
اکٹھے ہوئے اور اعوانوں پر جوابی حملے کا پروگرام بنانے لگے۔

اسی شام سلیم پھر سائیکل کا تماشا دیکھنے جا پہنچا۔ اعوانوں کے لڑکے اس کی تاک میں
تھے انہیں معلوم ہوا کہ سلیم تماشائیوں میں کھڑا ہے تو وہ اکٹھے ہو کر پہنچ گئے۔ ان کا بڑا
بھائی ہاشم جو دوپہر کی لڑائی میں شریک نہیں تھا۔ کچھ زیادہ ہی غصیلا اور خردماغ تھا۔ ویسے
بھی بھائیوں میں اس کا ڈیل ڈول سب سے اچھا تھا۔ وہ عقب سے گیا اور اس نے سلیم کو
پیچھے سے اس طرح جکڑا کہ اس کے بازو بھی گرفت میں آ گئے۔ باقی اسے مارنے لگے۔
شور غل سن کر جب ہم چھت پر پہنچے تو لڑائی اپنے عروج پر تھی۔ ہاشم نے سلیم کو عقب
سے جکڑ رکھا تھا اور دوسرے اسے آہنی مکوں اور ڈنڈوں سے پیٹ رہے تھے' وہ ساتھ
ساتھ چلا رہے تھے۔ معافی مانگو زمین پر ناک رگڑ کر لکیریں نکالو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ مجھے چھوڑ

دیں' جو تم کہتے ہو وہی کرتا ہوں۔ لیکن وہ اسے چھوڑ بھی نہیں رہے تھے۔ پھر پتہ نہیں
کس طرح وہ خود کو ہاشم کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ یکایک دوپہر والا منظر
پھر دوہرایا جانے لگا اتنے میں سلیم کا والد اس کے بھائی اور دوسرے رشتے دار چھریوں سے
مسلح ہو کر موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے ہاشم' قاسم اور مانی کو پکڑ لیا اور چھریوں کے زور پر
دھکیلتے ہوئے اپنے محلے کی طرف ہانک لے گئے۔ پھر گھر کے سامنے بجلی کے ایک پول سے
باندھ کر ان کی زبردست پٹائی کی گئی۔ ہاشم کا سر پھٹا اور کندھا اتر گیا جبکہ قاسم کی پنڈلی
ٹوٹی۔ یہ تمام باتیں ہماری گلی کے ہی ایک شخص نے آ کر بتائیں۔ اب دو ہی صورتیں
تھیں یا تو اعوان خود اپنے آدمیوں کو چھڑانے کے لئے جائیں یا پولیس کی مدد حاصل کریں
مزید نقصان سے بچنے کے لئے انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ ویسے بھی یہ لوگ
اچھے پولیس کے ذریعے انہوں نے اپنے آدمی برآمد کروائے اور سلیم اور اس کے دو
بھائیوں کو گرفتار کروایا۔ بعد میں ساتویں آٹھویں روز ان کی ضمانتیں ہو سکیں۔ معلوم ہوا
تھانے میں سلیم کو بری طرح مارا گیا تھا۔ اس جھگڑے میں میرا چھوٹا بھائی پرویز بھی
ہوا تھا۔ اس کی پیشانی اور ابرو پر دو گہری چوٹیں آئیں۔ میں اپنے ہاتھ سے دو روز
ٹکور کرتی رہی اور دل ہی دل میں سلیم کو بددعائیں دیتی رہی' لیکن ذہن کا ایک گوشہ
تھا جہاں اس کی پسندیدگی جڑ پکڑتی جا رہی تھی۔ جب آٹھ دس روز بعد معلوم ہوا
تھانے میں سلیم کو بری طرح مارا گیا ہے تو اس کے لئے ایک بے نام سی ہمدردی
ہونے لگی۔ بہرحال میں خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتی کہ یہ کیفیت کچھ میری ہی نہیں
اس واقعہ نے سلیم کو چپکے سے پوری آبادی کا ہیرو بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ میری امی بھی جو
پرویز کے غم میں برابر کی شریک رہتی تھی دبے لفظوں میں سلیم کی طرفداری کر چکی
تھیں۔ وہ لڑکا مانی' جس کے کنکریاں پھینکنے کی وجہ سے یہ جھگڑا کھڑا ہوا واقعی بے حد
جھگڑالو تھا۔ میری والدہ پرویز کو اس کے ساتھ گھومنے سے اکثر منع کیا کرتی تھیں۔

میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے کہ جو کچھ کہوں گی برملا کہوں گی۔ میری جو بھی ذہنی
کیفیات تھیں میں درجہ بدرجہ آپ کو بتاتی جا رہی ہوں۔ اس واقع کے بعد میں سلیم کے
لئے دل میں ہلکی سی آنچ محسوس کرنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک روز جو چور دروازہ
میرے سے کھلا تھا اس کے راستے ایک اجنبی دل کی زمین پر قدم رکھ چکا ہے۔ میں نے

تنہائی میں بیٹھ کر اپنے ذہنی رویے کا تجزیہ کیا اور لرز گئی۔ نادیدہ ڈور مجھے کھینچ کر طرف لے جا رہی تھی۔ سلیم ایک ان پڑھ، بے کار اور کسی حد تک آوارہ لڑکا تھا۔ کی اور میری معاشرتی حیثیت میں ناقابل عبور فاصلے حائل تھے۔ نہ ہمارا ماضی ایک تھا حال اور نہ مستقبل ہو سکتا تھا۔ اس کے بارے سوچنا ایسا ہی تھا جیسے کسی ایسے شخص رفاقت کے بارے میں سوچا جائے جو سینکڑوں برس قبل پیدا ہو چکا ہو یا سینکڑوں برس پیدا ہونے والا ہو۔ ہم دونوں ہم عصر ہونے کے باوجود ہم عصر نہیں تھے۔ میں اس نتیجے پہنچی کہ میری جذباتی کشمکش سراسر نادانی کے زمرے میں آتی ہے اور کسی طور قابل نہیں۔ خود کو اس گمراہ کن اور شرمناک کیفیت سے نکالنے کے لئے میں نے نئے حوالے سے منصوبہ بندی کی اور فیصلہ کیا کہ اپنے کزن میں دلچسپی لوں گی جو کہ میڈیکل کالج میں فورتھ ایئر کا طالب علم تھا اور جس سے میری منگنی متوقع تھی۔ وہ ہمارے گھر آتا تھا۔ اشاروں کنایوں میں وہ بار بار مجھ میں دلچسپی کا اظہار کر چکا تھا۔ لفظوں میں اس کی شخصیت کا احاطہ کرنا ہو تو میں کہوں گی کہ وہ ایسا لڑکا تھا جس کی دلچسپی مرکز بننا ہر لڑکی اپنے لئے باعث فخر سمجھ سکتی تھی۔ پہلے پہل اُسی کی آنکھوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ لوگ میرے بارے میں جو کہتے ہیں وہ درست ہے۔ میں واقعی پرکشش شخصیت کی مالک ہوں۔

وہ مجھ سے بے تکلفی چاہتا تھا مگر ایسی باتوں کا سوچ کر میری طبیعت الجھ سی جاتی امی کے بہت کہنے کے باوجود میں نے کبھی اس سے ہنس کر بات نہیں کی۔ مگر اب میں سوچا کہ اس کی حوصلہ شکنی نہ کروں گی۔ اس کے علاوہ دلی سکون کے لئے میں نے نماز باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دی اور قرآن شریف بھی پڑھنے لگی۔ اب میں اپنا تجزیہ کرتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میں کسی بے نام خوف کے تحت ایک خول میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ پھر ایک روز میں نے سلیم کو دوبارہ اپنے سامنے پایا۔ زندگی کی شاہراہ پر اتفاقات کے ایسے اندھے موڑ آتے رہتے ہیں۔ جن حالات کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا انہیں ہم روبرو پاتے ہیں۔ وہ ستمبر کی ایک خنک دوپہر تھی۔ ہم اپنے تفریحی دورے کے آخری مرحلے میں ایبٹ آباد سے "ٹھنڈیانی" روانہ ہوئے۔

"ٹھنڈیانی" کا فاصلہ ایبٹ آباد سے شاید بیس پچیس میل ہے۔ یہ بلندی پر واقع ایک پرفضا ب ہے۔ میرے بہنوئی جو لاہور میں قالینوں کا کام کرتے ہیں اپنی نئی سوک ہنڈا کو خطرناک ترین چڑھائیوں پر آزمانے کا ارادہ کئے ہوئے تھے۔ ایبٹ آباد میں انہیں کسی نے بتایا کہ ٹھنڈیانی دیکھنے کے لائق جگہ ہے۔ وہ مکمل معلومات حاصل کئے بغیر ہمیں لے کر روانہ ہو گئے۔ خیال تھا کہ تین چار روز وہاں قیام کریں گے۔ جب ہم ٹھنڈیانی پہنچے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ایک سرد کہرا دھیرے دھیرے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ پہنچ کر ہم پر انکشاف ہوا کہ ادھر ہوٹلوں کا رواج نہیں۔ مختلف محکمہ جات کے ریسٹ ہاؤس ہوتے ہیں جہاں قیام کرنے کے لئے ایبٹ آباد سے اجازت نامہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے کہ اس تاریکی میں انتہائی خطرناک اترائیوں میں سفر کرتے ہوئے ہمیں واپس جانا پڑے گا۔ ہمارے مختصر قافلے میں میری بہن، بہنوئی والدہ اور میرے منجھلے بھائی تنویر بھی شامل تھے۔ ہم سب سخت پریشان تھے۔ اس وقت ایک کار ہمارے پاس آ کر رکی اور اس میں سے سلیم برآمد ہوا۔ میرے بھائی تنویر پہچانتے تھے۔ دونوں نے مصافحہ کیا اور بات چیت کرنے لگے۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے سیٹھ منان نامی ایک معروف کاروباری شخص کی ملازمت اختیار کر لی ہے اور اسی ملازمت کے سلسلے میں وہ یہاں آیا ہوا ہے۔ کوئی پراپرٹی کی خرید و فروخت کا جھگڑا نبٹانا تھا اسے۔ وہ بے حد اصرار کے ساتھ ہمیں اپنے ٹھکانے پر لے گیا۔ یہ اس کے سیٹھ کی کوٹھی تھی مگر سیٹھ چونکہ وہاں نہیں تھا لہٰذا ہم تین چار روز اطمینان سے وہاں قیام کر سکتے تھے۔ میں نے سلیم کو پہلی دفعہ اتنے قریب سے دیکھا۔ وہ اب بہت بدل چکا تھا۔ لباس ڈھنگ کا تھا اور دانت بھی پان سے رنگے ہوئے نہیں تھے۔ چہرا تو اس کا پہلے بھی درشت نہیں تھا۔ ایک شریر سی مسکراہٹ ہمہ وقت اس کی آنکھوں کو روشن رکھتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ مسکراہٹ اس وقت کافور ہوتی تھی جب اسے کسی بات پر طیش آتا تھا اور وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔

ہم نے اس نہایت پرفضا اور حسین ماحول میں کوئی تین دن گزارے۔ سلیم ہماری مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ میں نے خود کو پابند کیا ہے کہ ہر قلبی واردات کھول کر آپ کے سامنے بیان کروں گی۔ لہٰذا یہ بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ ان چند دنوں

سلیم سے میری پرانی وابستگی پھر تازہ ہوگئی اور میں بتدریج اور غیر محسوس طور پر اس کی
دار مردانہ شخصیت کی اسیر ہوتی چلی گئی۔ تاہم یہ ساری کشمکش میرے دل و دماغ تک
ود تھی اور میں نے سلیم پر اپنی کسی کمزوری کا مطلق اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں کوئی
ن بچی نہیں تھی۔ میں خود کو سنبھالنے کی مسلسل کوشش کر رہی تھی مگر سنبھالنے سے
ئی خود کو سنبھال سکتا تو لوگ پاگل نہ ہوتے' خودکشی نہ کرتے' سنگین جرائم کی سزا میں
سی نہ پاتے۔ حالات انسان کا "ہانکا" کرتے ہیں۔ کسی کی عجیب و غریب شخصیت میرا بھی
انکا" کر رہی تھی۔ مجھے لگتا سلیم دنیا کا سب سے قابل اعتماد شخص ہے' اس کا ہاتھ تھام کر
ں ہر مصیبت سے ٹکرا سکتی ہوں۔ ہر حادثے کا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ اب سوچتی ہوں
اید......... شاید اس کا سبب یہ تھا کہ ہمارا خاندان شرافت آمیز بزدلی کا امین تھا۔ ہم
ھے لکھے لوگ تھے۔ ہوشیار سمجھدار مگر فطرتاً بزدل بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ بزدلی ہمارے
اندان میں فیشن سمجھی جاتی تھی۔ جو مرد جتنا نازک اندام اور "دابو" ہوتا تھا اتنا ہی لائق
ائق سمجھا جاتا تھا۔ خدا نے فطری طور پر مرد کو محافظ بنایا ہے۔ وہ اپنے اہل خانہ کی حفاظت
کرتا ہے اور حفاظت کے لئے طاقت و جرات درکار ہوتی ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ کہیں
کہ یہ طاقت و جرات ضروری نہیں کہ جسمانی ہو' اخلاقی بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس
حقیقت سے انکار نہیں لیکن زندگی میں بے شمار مواقع ایسے آتے ہیں جب صرف اور
صرف جسمانی طاقت ہی کام دیتی ہے۔ دنیا میں برائی زیادہ ہے اور اچھائی کم۔ افہام و تفہیم
کا راستہ اختیار کرنے والے تھوڑے ہیں اور زور آزمائی کرنے والے زیادہ اور اس
ثبوت وہ کھربوں روپے کے دفاعی بجٹ ہیں جو دنیا کی حکومتیں ہر سال پاس کرتی ہیں۔
اور طرف نکل گئی۔ میں کہنا یہ چاہ رہی تھی کہ میرے اندر جیسے سلیم جیسے شخص کے
ایک خلا تھا اور تھنڈیانی میں گزارے ہوئے چند سازگار دنوں نے اس خلا کو وسیع کر
میرے وجود کو ایک نئے امتحان سے دوچار کر دیا۔

لاہور آ کر عجیب عجیب سوچیں آنھوں پہر مجھے گھیرے رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ
میں بیمار ہوگئی۔ کھلے لفظوں میں کہوں گی کہ سلیم کی جان لیوا محبت نے مجھے چارپائی سے لگا
دیا۔ گھر والے پریشان ہوگئے۔ امی کی تو مجھ میں جان تھی۔ ڈاکٹروں کے پاس لئے لئے
پھرتی رہیں لیکن روگ کچھ اور تھا۔ میری ایک ہمراز سہیلی فرخندہ تھی۔ میری کلاس فیلو

بھی تھی۔ ایک متمول اور آزاد خیال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی وہ بیماری کے دنوں میں
اکثر میرے پاس آتی تھی۔ تنہائی میں گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتی رہتی۔ اس کا خیال تھا کہ
مجھے سلیم سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے وہ
کہتی۔

"جان! اپنی ہی نانی اماں نہ بن جاؤ۔ اتنی دقیانوسیت ٹھیک نہیں۔ زمانے کے ساتھ
چلو۔ تمہارا اور سلیم کا ملن کوئی ایسی بعید از قیاس بات بھی نہیں۔ اور اب تو وہ کافی بدل
چکا ہے۔ ڈھنگ کے کپڑے پہنتا ہے۔ اسکوٹر پر گھومتا ہے۔ ایک بڑی فرم کا ریکوری مینجر
ہے۔ شکل سے نہیں لگتا تو کیا ہوا' ذرا عمر ہو جائے گی تو مینجر بھی لگنے لگے گا۔
عشق کا بھوت اس کے سر پر سوار ہوگیا تو دیکھنا ایک دم جنٹل مین بن جائے
..."

میں ایسی باتوں کے جواب میں اکثر فرخندہ کو جھڑک دیتی لیکن وہ بھی ہٹ کی پکی
تھی۔ اس سے میرا دن بدن کمزور ہوتا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس نے کہیں سے ایک
ٹھیک معالج کا کھوج لگایا۔ اس کی دوائی سے مجھے نیند آنے لگی اور بخار میں بھی افاقہ
ہوا۔ ایک روز میں لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ وہ اپنی سفید سوزوکی کار پر آگئی کہنے
لگی "چلو' کہیں گھومنے چلتے ہیں" میرے انکار کے باوجود وہ مجھے کھینچتی ہوئی کمرے میں
لے آئی اور باتھ روم میں دھکیل کر باہر سے دروازہ بند کر دیا اس نے خود ہی میرے لئے
لباس منتخب کیا اور بنا سنوار کر گاڑی میں بٹھالیا۔ پروگرام تھا کہ نہر کے کنارے
ڈرائیونگ کریں گے لیکن وہ گاڑی لبرٹی کی طرف لے گئی اور کہنے لگی کہ پہلے کسی
ریسٹورنٹ میں ٹھنڈا پی لیں۔ ہم ریسٹورنٹ میں داخل ہوئیں۔ ایک فیملی کیبن کا پردہ ہٹا
کر جب میں اندر داخل ہوئی تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی
بصارت پر یقین نہیں آیا۔ میری پھٹی پھٹی نگاہیں سلیم پر جمی تھیں جو میز پر کہنیاں ٹکائے
بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا پھر تعظیماً اٹھ کر اس نے مجھے نشست پیش کی۔ میں نے گھبرا
کر پیچھے دیکھا۔ فرخندہ مجھے کیبن میں پہنچا کر غائب ہو چکی تھی۔ ایک لمحے میں اس کی
سازش مجھ پر کھل گئی۔ میں نے "شکریہ" کہہ کر واپس مڑنا چاہا لیکن سلیم کی پراعتماد آواز
نے جیسے قدم پکڑ لئے۔ وہ بولا۔

"ثناء صاحبہ! اس ہل اسٹیشن پر ہم ایک گھر کے افراد کی طرح رہ چکے ہیں۔" میں خیالوں میں گم تھی کہ سلیم کی آواز پھر کانوں سے ٹکرائی۔

"ثناء صاحبہ! آپ کا یوں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔ بیٹھ جائیے۔"

اس کی آواز نے جیسے مجھے پکڑ کر بٹھا دیا۔ میرا دل نہایت شدت سے دھڑک رہا تھا۔ حالت یہ تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ میں نے خود کو کسی شرمیلی لڑکی کی طرح انگلیاں مروڑتے ہوئے پایا۔ سلیم نے ویٹر کو بلا کر کسی چیز کا آرڈر دیا پھر وہ سگریٹ سلگا کر دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا اس کی باتیں کچھ زیادہ خوبصورت نہیں تھیں۔ ان میں ترتیب تھی اور نہ پڑھے لکھوں والی شائستگی لیکن وہ باتیں تصنع اور منافقت سے پاک تھیں۔ وہ کھرے دل اور بے تکلف لہجے میں بول رہا تھا۔ مجھے وہ سب کچھ کسی خواب کی طرح یاد ہے۔ اس نے کہا تھا۔

"ثناء صاحبہ! مجھے یاد ہے جس روز لڑکیوں نے کالج کے سامنے سڑک بند کی تھی آپ بھی موجود تھیں۔ جب ٹرک والا اوپر چڑھ آیا تھا تو آپ ہی آخر تک اس کے سامنے کھڑی رہی تھیں۔ شاید ٹرک کا بمپر آپ کے گھٹنے سے ٹکرایا تھا۔ آپ واقعی.......... دلیر ہیں۔"

میں کہنا چاہتی تھی کہ اپنی دلیری کا حال اس وقت کچھ مجھے ہی معلوم ہے، لیکن خشک گلے نے مجھے بولنے سے باز رکھا۔ میرے ہاتھ میز پر تھے اور ان ڈرے ہوئے کبوتروں کی طرح نظر آ رہے تھے جو خود بلی کو دعوت دے رہے ہوں کہ وہ انہیں دبوچ لے۔ اگر سلیم ان ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیتا تو شاید میں معقول مزاحمت بھی نہ کر سکتی۔ کسی ایسی صورت حال سے بچنے کے لئے میں نے ان ہاتھوں کو گود میں سمیٹ لیا۔

نہ جانے سلیم کے انداز گفتگو یا اس کی قربت میں کیا بات تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں میرا خوف زائل ہو گیا اور میں اس کی کمپنی میں خود کو نسبتاً پرسکون محسوس کرنے لگی۔ میں نے "نسبتاً" کا لفظ استعمال کیا ہے ورنہ گھر پہنچنے تک یہ حالت تھی کہ میرے قدم ڈگمگا رہے تھے اور ہتھیلیاں پسینے میں تر تھیں۔ وقت رخصت سلیم نے مجھ سے وعدہ لینا چاہا کہ اگلی جمعرات ٹھیک اسی وقت میں اس سے اس جگہ ملوں گی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکی اور بمشکل خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ باہر پہنچی تو فرخندہ کو ائر کنڈیشنڈ سوزوکی میں آئس

کریم کھاتے پایا اسے دیکھ کر میرا پارہ چڑھ گیا۔ میں اس سے بغیر کچھ کہے چپ چاپ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ راستے بھر مجھے منانے کی کوشش کرتی رہی مگر میرا موڈ آف ہی رہا۔

دوسرے تیسرے روز وہ پھر گھر پہنچ گئی اور مختلف حیلے بہانوں سے مجھے منا کر ہی چھوڑا۔ ملاقات کا حال پوچھنے لگی۔ میں نے مختصراً بتایا اور یہ ذکر گول کر دیا کہ اگلی جمعرات سلیم نے پھر آنے کو کہا ہے۔ دراصل میں ابھی تک خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ لیکن وہ بھی ایک آفت کی پرکالی تھی۔ کہنے لگی۔

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اتنے اہم مذاکرات ہوں اور کسی مشترکہ اعلامیے کے بغیر ختم ہو جائیں۔ آئندہ کی کچھ منصوبہ بندی تو ہوئی ہوگی۔

وہ کسی بلا کی طرح مجھے چمٹ گئی۔ آخر مجھے بتانا پڑا کہ سلیم نے اگلی جمعرات ملنے کو کہا ہے۔ بس پھر تو اس نے گردان ہی شروع کر دی کہ مجھے ضرور جانا چاہئے۔ ہماری اس انتہائی پرائیویٹ گفتگو کے دوران امی جی اندر چلی آئیں۔ فرخندہ سے بولیں۔

"بھئی کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟"

فرخندہ کسی ڈپلومیٹ کی طرح بولی "سیاست کی باتیں ہو رہی ہیں۔ دیکھیں خالہ جان دونوں سپر پاورز جب تک ایک دوسرے سے دور رہیں گی، ایک دوسرے کے بارے میں ان کے وسوسوں میں اضافہ ہوگا.......... دونوں سوچیں گی۔ فریق ثانی کے پاس نہ جانے کون کون سے ہتھیار ہیں ان کے ماہرین کیا کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ دونوں طاقتیں آپس میں مل بیٹھیں ایک دوسرے کی بات اطمینان اور تحمل سے سنیں تو یقیناً دونوں کے اندیشے دور ہوں گے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ عزت اور زندگی کی خواہش تو دونوں طرف سے ہے۔ رسوائی اور موت کا خریدار کوئی بھی نہیں۔ کیا اس سے بقائے باہمی کے جذبے کو فروغ نہیں ملے گا؟"

"یقیناً ملے گا" امی جی نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

فرخندہ بولی۔ "اب آپ بتائیے اگر ایک سپر پاور باہمی گفت و شنید سے گریز کرے اور دعوت کے باوجود مذاکرات کی میز پر نہ بیٹھے تو کیا ہوگا؟"

امی جی نے کہا.......... "بھئی جو کچھ تم کہہ رہی ہو اس سے تو ظاہر ہے، بدگمانی بڑھے گی ایک دوسرے کے بارے میں خوف پیدا ہوگا اور امن و امان کی حالت بدتر

نہیں سکے گی۔"

فرخندہ نے میرا منہ ہاتھ میں لیا اور بولی "اور نہ ماننے والی سپر طاقت کی حالت ہ جل کر اور سڑ سڑ کر ایسی ہو جائے گی۔"

امی جی نے کہا! "ہائے ہائے اسے کیا ہوا۔ اب تو اللہ کے کرم سے کافی بہتر ہے ج ابھی بھرنے لگا ہے۔"

"نہیں بھرے گا........ نہیں بھرے گا خالہ جان' اگر یہ ایسے ہی چارپائی توڑ رہی تو ایک چارپائی بھی نہیں رہے گی آپ کے گھر۔ پلیز اس کا علاج دواؤں سے نہ ہواؤں سے کریں' کھلی اور تازہ ہواؤں سے۔ اسے نکالئے باہر گھر سے' اور اپنی دوائیا اور چارپائیاں بچائیے۔"

آخری الفاظ فرخندہ نے بھاگتے ہوئے کہے کیونکہ میں جوتی لے کر اس کے پیچ لپکی تھی۔ اگلے تین چار روز میں نے اذیت ناک کشمکش میں گزارے۔ سارا سارا دا کمرے میں بند سوچتی رہتی کہ کیا کروں۔ دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ بہرحا مجھے اطمینان تھا کہ دماغ کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ میں چاہوں بھی تو یہ سب کچھ نہ کر سکو گی۔ بدھ کے روز حسب توقع فرخندہ پھر آدھمکی۔ اس نے جیسے پہلے سے کیا ہوا فیصلہ مج پر تھوپ دیا۔

"دیکھو جان! میں تمہاری "ایفی شینسی" جان گئی ہوں تم اکیلی اس سے ملنے ، جاسکو گی۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مشیر خاص کی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے تمہار ساتھ رہوں گی۔ بس اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ کل ٹھیک تین بجے میں گھر پر تمہار انتظار کروں گی۔ میں نے پرویز سے کہہ دیا ہے وہ گاڑی پر تمہیں میرے ہاں لے آئے گا وہاں سے چائے وغیرہ پی کر پانچ بجے روانہ ہوں گے۔"

پورا پروگرام خود ہی بتا کر اور خود ہی فائنل کر کے وہ واپس چلی گئی۔ میں ایک ب پھر سوچ کی سولی پر لٹک گئی۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ رات ہوئی اور پھر جمعرا کا مضطرب دن طلوع ہوا' میں اب کافی حد تک مطمئن تھی۔ کیونکہ آج گھر سے کہیں نہ جانے کا میں حتمی فیصلہ کر چکی تھی۔ دل و دماغ میں ہونے والی جنگ کا فیصلہ دماغ کے حق میں ہو چکا تھا۔ دماغ اپنی فتح پر مطمئن ہتھیار کھولے بیٹھا تھا اس لئے جب دل نے کلاو

کاٹ کر اچانک حملہ کیا تو اس کا دفاع لرزہ بہ اندام ہو گیا۔ یہ ساڑھے چار کا وقت تھا۔ میں کمرا بند کئے لیٹی تھی۔ چھوٹا بھائی پرویز دو دفعہ آکر پوچھ چکا تھا کہ مجھے فرخندہ کے ہاں کیوں نہیں جانا؟ میں نے کہا تھا' بس میری طبیعت خراب ہے۔ امی جی کی خواب آور گولیاں کھا کر میں ساڑھے چار بجے تک سونے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اچانک میں نے فیصلہ کیا کہ فرخندہ کے پاس چلوں گی........ صرف فرخندہ کے پاس' اس سے آگے نہیں۔ اگر یہ دل کا فیصلہ تھا تو دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"ہوشیار شاء بی بی! تمہیں ورغلایا جا رہا ہے۔ تم فرخندہ کے پاس نہیں' اس سے آگے بھی جاؤ گی" لیکن یہ آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے بال سنوارے اور چادر لے کر باہر نکل آئی۔ پرویز وڈیو پر کوئی تازہ فلم دیکھنے کی تیاری کر رہا تھا' میرے کہنے پر اس نے گاڑی نکالی اور مجھے فرخندہ کے ہاں اتار آیا۔

فرخندہ بالکونی میں کھڑی میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے نیچے آکر دروازہ کھولا۔ میں نے اندر جانے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے دھکیلتی ہوئی باہر لے آئی۔

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بس اب چپ رہو" وہ سرگوشی میں غرائی "پہلے ہی اتنی دیر کر دی۔"

"فرخندہ میری بات تو سنو" میں روہانسی ہو کر بولی۔ لیکن اتنی دیر میں وہ ایک رکشے کو رکنے کا اشارہ کر چکی تھی۔ دو جوان لڑکیوں کو دیکھ کر رکشے والے نے بڑے اسٹائل سے بریک لگائے اور عین ہمارے سامنے رکا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہمیں لے کر لبرٹی کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

بعض واقعات بڑے معمولی ہوتے ہیں لیکن مخصوص حالات میں ان کی اہمیت غیر معمولی ہو جاتی ہے۔ اگر پہاڑی ڈھلوان پر رکی ہوئی ایک چٹان شدید عدم توازن کا شکار ہو تو ایک ننھے بچے کی ٹھوکر بھی اسے نیچے لڑھکا سکتی ہے۔ کئی ٹن وزن اٹھانے والے ویٹ لفٹر کے لئے ایک مرحلے پر مزید ایک گرام وزن اٹھانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ ڈوبنے والا بعض اوقات گھاس کی چند پتیوں سے سہارا پا جاتا ہے میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی واقعہ ہوا شاید اس روز اگر جین مندر سے مزنگ چونگی پہنچانے والی

سڑک خراب نہ ہوتی اور رکشے والا ہمیں بہاول پور روڈ سے مزنگ چونگی کی طرف نہ لے
جاتا تو صورت حال بہت مختلف ہوتی۔ ممکن تھا کہ راستے کی یہ غیر اہم تبدیلی میری زند
کے راستوں کو کتنا مختلف کر دیتی جو ہوتا تھا اس کے بارے تو قیاس ہی کیا جا سکتا ہے مگر
ہوا وہ ٹھوس حقیقت ہے اور میں اسے بیان کر سکتی ہوں۔ رکشا مزنگ چونگی سے کچ
فاصلے پر تھا کہ میری نگاہ بائیں جانب اٹھ گئی یکایک جیسے کسی نے میرا کلیجہ مٹھی میں لے ل
سڑک سے چند گز کے فاصلے پر میرے والد کی قبر تھی ان کی وفات کے تین چار سال بع
تک ہم اکثر یہاں آیا کرتے تھے مگر اب انہیں دیکھے ایک برس بیت گیا تھا۔ وہ اپنی زند
میں موت وحیات کا تذکرہ کرتے اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے کہتے تھے میں لوگوں ک
لاپرواہی پر حیران ہوتا ہوں۔ یہ جو شہر کے درمیان میانی صاحب کے نام سے ایک شہ
خموشاں آباد ہے اس میں روزانہ کچھ نہیں تو پندرہ بیس جنازے تو آتے ہوں گے۔ سوچ
ہوں پرسوں جو پندرہ بیس افراد لوگوں کے کندھوں پر سوار اس گورستان میں پہنچیں گے و
آج اس وقت زندہ ہوں گے کوئی چارپائی پر ہوگا۔ کوئی دفتر یا کارخانے میں ہوگا کوئی کس
میلے ٹھیلے میں ہوگا۔ سب زندہ ہوں گے۔ رکشے کے دروازے سے میری نگاہ ابو کی سفی
سنگی قبر پر پڑی اور دل سے ہوک نکل گئی۔ باپ کو بے بس جان کر میں کتنی دلیری سے
اپنے راستے پر گامزن تھی۔ اچانک میری آنکھوں کے سامنے اجالے کی چادر تن گئی۔

"رکشا روکو" میں نے نہایت مستحکم لہجے میں کہا۔

رکشے والے کے ساتھ ساتھ فرخندہ بھی مجھے گھوم کر دیکھنے لگی۔ میرے لہجے نے
اسے چونکا دیا تھا۔ رکشا روکو میں نے پھر کہا رکشا آہستہ ہوا اور سڑک کے کنارے رک گ
رکشے والے واپس چلو میں نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ثناء!" فرخندہ بولی۔

"فرخندہ مجھے کچھ نہیں سننا اگر میری دوست ہو تو پلیز کوئی ضد نہ کرنا۔" میرے
تیور دیکھ کر فرخندہ کو چپ لگ گئی۔ رکشے والے نے رکشا موڑا اور مختلف سڑکوں سے
ہوتا ہوا ہمیں گھر واپس لے آیا۔

وہ اکتوبر کی ایک چمکدار صبح تھی میں کمرے میں بیٹھی اپنے چھوٹے بھتیجے کو نو
کھیلنا سکھا رہی تھی فرخندہ کمرے میں آدھمکی اسے دیکھ کر میں نے چہرے پر سنجیدگی طاری

کر لی۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی بے حد سنجیدہ ہوگی لیکن یہ دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ
اس کا موڈ خوشگوار ہے۔ ذرا ہی دیر میں ہم گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔ فرخندہ نے تنہائی
ملتے ہی کہا۔

"تم تو مجھے ولی اللہ لگتی ہو پرسوں تم واپس نہ آتیں تو غضب ہو جاتا تھا۔"

"کیوں کیا ہوا؟" میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔

"ہوا کچھ نہیں لیکن بہت کچھ ہو جاتا میری پھوپھو نادرہ ہیں نا پرسوں گاڑی پر
ہمارے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ انہیں شک ہو گیا تھا کہ لڑکیاں کوئی گل کھلانے جا رہی
ہیں" فرخندہ نے یہ بات آسانی سے کہہ دی تھی لیکن میرے ہوش اڑ گئے۔ یہاں میں
آپ کو فرخندہ کی پھوپھو کے بارے میں بتا دوں۔ وہ ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم سکول کی
پرنسپل ہیں در حقیقت یہ ان کا اپنا ہی سکول ہے برسوں پہلے انہوں نے اپنے خاوند سے
طلاق لے لی تھی اور میکے میں رہتی تھیں۔ خاوند جھنگ کا ایک زمیندار تھا حق مہر میں کافی
رقم نکلی تھی اس سے انہوں نے سکول شروع کر دیا تھا۔ مزاج کی خاصی تیز تھی۔ فرخندہ
گھر بھر میں صرف انہی سے ڈرتی تھی۔ فرخندہ نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا وہ دیکھنا
چاہتی تھیں کہ لڑکیاں کہاں جاتی ہیں مگر جب ہم راستے سے مڑ گئے تو وہ بھی گھر واپس
آ گئیں تمہارے جانے کے بعد مجھ سے کہنے لگیں تمہاری مصروفیات آج کل کچھ زیادہ ہی
پراسرار ہوتی جا رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ فرمانے لگیں اگر ایسی
بات نہ تھی تو مجھے پیچھے دیکھ کر تم واپس کیوں مڑ آئیں۔ یعنی بزرگوار کا خیال ہے کہ ہم
انہیں تعاقب میں دیکھ کر واپس مڑی تھیں جبکہ ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی"

فرخندہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں لیکن میرا دل ڈوبا جا رہا تھا میں نے کہا فری
کہیں کوئی مصیبت کھڑی نہ ہو جائے۔ کہنے لگی نہیں یار سب سے بڑی مصیبت تو تمہارا یہ
چڑی سا دل ہے اسے معقول سائز میں کر لو تو سب ٹھیک ہے پھر مجھ سے پوچھنے لگی اب
تک کیا کرتی رہی ہو اور اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "میں تمہارے دونوں سوالوں کا جواب تفصیل سے
دیتی ہوں۔ پرسوں گھر آ کر سب سے پہلے میں نے وضو کیا پھر دو رکعت نماز نفل پڑھی اس
کے بعد کمرے میں آئی اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر یہ قسم کھائی کہ اب کبھی اس سے

نہ ملوں گی اور نہ کبھی تمہیں اس کے بارے میں بات کرنے کی اجازت دوں گی اگر تم میرے روکنے کے باوجود باز نہ آئیں تو تمہاری دوستی چھوڑ دوں گی۔" فرخندہ کا چہرہ ایک دم بجھ گیا میں اسکی کیفیت نظرانداز کرتے ہوئے گھمبیر لہجے میں بولتی رہی "دوسرا سوال تم نے پوچھا ہے کہ آئندہ کیا ارادہ ہے اسکا جواب ہے کہ میں اس ماہ راولپنڈی شفٹ ہو رہی ہوں" تمہیں معلوم ہے کہ باجی حنا کے خاوند وہاں ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں ہیں باجی پہلی بچی کی وفات کے بعد اکثر اداس رہتی ہیں انہوں نے کئی بار مجھے کہا ہے کہ میں ان کے پاس آجاؤں ان کا دل بھی لگا رہے گا میں ایم اے کی تیاری بھی اطمینان سے کرسکوں گی۔ میں نے کل ہی انہیں خط پوسٹ کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اگلے ویک اینڈ تک آجائیں گے ایک دو ہفتے وہ یہاں رہیں گی پھر میں بھی ان کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔"

میری بات مکمل ہوتے ہوئے فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے میں جانتی تھی میرے ان فیصلوں سے اسے دکھ ہوگا وہ ایک من موجی لڑکی تھی اس کا دل چاہتا تھا ہم دونوں مل کر زندگی کو انجوائے کریں۔ لائبریری میں جائیں لمبی ڈرائیوز کریں رومانس کریں ایک دوسرے کو اپنے بوائے فرینڈز کے قصے سنائیں بلکہ ہو سکے تو کوئی فارن کا ٹور بھی لگائیں لیکن وہ بھول جاتی تھی۔ میرے اور اس کے ماحول میں بہت فرق ہے وہ ایک مخلص اور پیاری دوست تھی لیکن کبھی کبھی میری مجبوریوں کو نظرانداز کر دیتی تھی میں نے جانے کا فیصلہ سنایا تو اس نے سامنے رکھی ہوئی چائے بھی نہیں پی اور گلوگیر آواز میں خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اسے منانے ضرور آؤں گی کیونکہ یہ ہو ہی نہ سکتا تھا میں اسے روتا ہوا چھوڑ کر راولپنڈی سدھار جاؤں۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ نہ صرف میرا راولپنڈی کا پروگرام دھرا رہ گیا بلکہ حالات کے تھپیڑوں نے مستقبل کی پوری ہیئت ہی بگاڑ کر رکھ دی۔ میرا خدشہ درست نکلا۔ فرخندہ کی پھوپھو نے نجانے کس انتقامی جذبے کے تحت بات دور تک پہنچا دی اور اس شکی مزاج خاتون نے ہماری "سرگرمیوں" کا پورا کھوج لگایا اور ایک روز ہمارے گھر آدھمکی میں نے جب اسے دیکھا وہ اپنا بیگ سنبھالے امی جی کے کمرے سے نکل رہی تھی میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا پتہ نہیں وہ کب سے وہاں بیٹھی تھی اور کیا آگ لگا گئی تھی جلد ہی امی جی کا چہرہ دیکھ کر مجھے اس آگ کی شدت کا اندازہ ہوگیا۔ امی میرے کمرے میں آئیں اور دروازہ بند کر کے

بولیں۔

"شاء ہمارے سر پر کیا قیامت توڑنے لگی ہے تو؟"

میں سرتاپا ایک سہما ہوا سوال بن گئی امی جی نے مجھے قہر بھری نظروں سے گھورا اور پھر سر پکڑ کر رونے لگیں۔ جب دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو کہنے لگیں۔ "فرخندہ کی پھوپھو نے بتایا ہے کہ تم فرخندہ کو لے کر گلبرگ کے ایک ہوٹل میں کسی ویگن ڈرائیور کو ملنے جاتی ہو۔" میں حیرت اور صدمے سے گنگ تھی امی جی نے کہا۔ "شاء میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ میری بیٹی اتنی گر سکتی ہے یہ خبر سننے سے پہلے میں تیرے باپ کے پاس کیوں نہ چلی گئی۔"

وہ روتی رہیں اور مجھے لعنت ملامت کرتی رہیں وہ خاموش ہوئیں تو میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی صفائی پیش کی میرا بیان میرے دل کی آواز تھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ بچی کے دل سے نکلنے والی آواز ماں کے دل نے سن لی ہے۔ مگر ان کے چہرے پر رنج وملال کی پرچھائیاں سمٹ نہ سکیں۔ آنکھوں میں پرتشویش سائے لہرا رہے تھے گھمبیر لہجے میں بولیں۔

"میں بازار گئی ہوئی تھی میرے آنے سے پہلے فرخندہ کی پھوپھو یہی باتیں تیری بھابھی سے بھی کر چکی ہے اب یہ بات تیرے بھائیوں تک بھی ضرور پہنچے گی میرا تو دل ڈول رہا ہے نجانے کیا ہوگا" مجھے خود تسلی کی ضرورت تھی ماں کو دلاسہ کیا دیتی خوف کی دھند میں ہم ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ خوف اور عورت کتنا گہرا رشتہ ہے ان دونوں لفظوں میں۔

دوسرے روز شام تک ہمارے گھر دبی دبی سرگوشیاں گونجنے لگیں جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ بات کانوں کان پورے گھر میں پھیل گئی ہے۔ بڑے بھائی جو ڈاکٹر ہیں پہلے ہی ذرا خشک مزاج واقع ہوئے ہیں لیکن منجھلے بھائی تنویر کی آنکھوں سے بھی میرے لئے محبت کی چمک مفقود ہوگئی۔ بھابیوں کی آنکھیں تو شاید ہوتی ہی بدلنے کے لئے ہیں اس ماحول میں مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا ٹیلی فون کی گھنٹی دروازے کی ہر دستک اور قدم کی ہر چاپ پر ڈر جاتی کہ شاید میری جان کے لئے کوئی مصیبت آئی ہے دل پتے کی طرح ہلکا ہوگیا تھا لیکن ابھی پردہ غیب سے بہت کچھ ظہور میں آنا باقی تھا۔ دوسرے یا تیسرے

روز چھوٹے بھائی پرویز کی باتوں سے پتہ چلا کہ دیگیوں والے رفیق کا لڑکا سلیم پولیس کے
ہاتھوں پکڑا گیا ہے۔ اس واقعے کی تفصیل کچھ یوں تھی۔ کل سہ پہر اس نے "گل سکالرز"
سکول کی پرنسپل نادرہ کی کار کو اپنے سکوٹر سے اس وقت ٹکر ماری جب وہ چھٹی کے بعد
گھر واپس جا رہی تھیں۔ گاڑی کو نقصان پہنچنے پر تکرار ہوئی جس کے نتیجے میں سلیم نے
مشتعل ہو کر سکوٹر کی ڈگی سے ایک آہنی راڈ نکال لیا اور اس کی ضربوں سے نہ صرف کار
کے تمام شیشے چکنا چور کر دیئے بلکہ باڈی کو بھی نقصان پہنچایا کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس
نے پرنسپل کو بھی دھکے دیئے جس سے ان کی عینک گر کر ٹوٹ گئی۔ اس دوران سکول کا
چوکیدار ایک دو مرد ملازموں کے ساتھ بھاگتا ہوا آگیا انہوں نے پرنسپل کی حمایت میں سلیم
سے الجھنا چاہا تو اس نے انہیں بھی بری طرح زدوکوب کیا۔ سکول چوکیدار کے سر پر شدید
چوٹ آئی اور وہ سڑک پر ہی بے ہوش ہو گیا بعد ازاں پرنسپل کی رپورٹ پر متعلقہ پولیس
نے سلیم کو پکڑ لیا۔

یہ واقعہ بظاہر ایک حادثے کے نتیجے میں ہوا لیکن کسی تبصرے کے بغیر ہی ہم سب
جانتے تھے کہ اس کا محرک کیا ہو گا یقیناً سلیم کو معلوم ہو گیا تھا کہ پرنسپل نادرہ ہمارے گھر
پہنچی تھی اور اس نے مجھ پر بڑھا چڑھا کر الزامات لگائے تھے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ میرے
وعدے کے مطابق نہ ملنے کو بھی پرنسپل نادرہ کی کوشش پر محمول کر رہا ہو۔ بہرطور اس
نے اپنے غم غصے کا اظہار پرنسپل نادرہ کی نئی گاڑی توڑ کر کیا تھا۔

اس واقعہ کے بعد ہمارے گھر کی فضا اور مکدر ہو گئی ایک دن فرخندہ کی دو رشتے
دار خواتین ہمارے گھر آئیں زیورات سے لدی پھندی یہ عورتیں کسی جاگیردار گھرانے
سے لگتی تھیں۔ فرخندہ کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلی گئیں ان
عورتوں کی وجۂ آمد مجھے اگلے روز معلوم ہوئی۔ رات بارش ہو جانے کی وجہ سے میں
برآمدے میں سو رہی تھی۔ ہر گھر میں کچھ مقامات حساس نوعیت کے ہوتے ہیں گھر کے
افراد کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس مقام پر کی جانے والی گفتگو کسی دوسرے مقام سے
باآسانی سنی جا سکتی ہے۔ ان مقامات کی نشاندہی طویل تجربے اور ایک دو حادثات کے بعد
ہو پاتی ہے۔ اس روز میں برآمدے میں جس جگہ لیٹی تھی وہاں سے امی کے کمرے میں
ہونے والی گفتگو واضح سنائی دے رہی تھی موضوع گفتگو میں ہی تھی بڑے بھائی جان کہہ

رہے تھے۔

"لوگ تو اچھے ہیں میرا خیال ہے بات آگے بڑھائی جائے۔" مجھلے بھائی تنویر بولے
"اس کے سوا چارہ بھی نہیں عدنان (میرا کزن) ابھی ففتھ ائر میں ہے اس کی امی کہہ رہی
تھیں کہ ایم ڈی کے لئے امریکہ جائے گا اس کی شادی تو چار پانچ سال کی بات ہے۔"

بڑے بھائی نے کہا "اور میرا تو خیال ہے یہ رشتہ کسی طرح عدنان سے کم نہیں۔
کھاتے پیتے بااثر لوگ ہیں' زمینداری ہے' مرتبہ ہے۔"

امی نے پوچھا کہ لڑکا کتنا پڑھا ہوا ہے۔ بڑے بھائی جھلا کر بولے "امی جی پڑھائی کو
چھوڑیں رکھ رکھاؤ والا اور ملنسار ہے گریجویشن نہیں تو انٹر ضرور کیا ہو گا۔" چھوٹے بھائی
نے کہا "اصل مسئلہ یہ ہے ہمیں کسی بھی طرح صورت حال کو بگڑنے سے بچانا ہے۔ سلیم
ایک خطرناک شخص ہے اب تو وہ جیل میں ہے اور پانچ چھ ماہ سے پہلے باہر نہیں آئے گا
اس دوران یہ بیل منڈھے چڑھ جائے تو ہم سب کی بھلائی ہے" الفاظ پگھلے سیسے کی طرح
میرے کانوں میں اتر رہے تھے جب اپنے بارے میں کسی کا ایسا انداز فکر معلوم ہو تو دل
دماغ میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ ایک دم ہی میں اپنی نظروں میں حقیر ہو کر رہ گئی۔
بھائیوں کی پراندیش آوازیں بار بار کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ انہیں اپنی عزت و ناموس
خوف تھا۔ ان الجھنوں کا خوف تھا جو سلیم کی صورت میں انہیں پیش آسکتی تھیں
دنگے فساد کا خوف تھا جو سلیم کے حوالے سے ان کی پرسکون زندگیوں کو دھمکا رہا تھا اور وہ
شریف لوگ تھے ان بکھیڑوں کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے فوراً اس معاملے کو
سلجھا دینا چاہتے تھے۔ میں سوچنے لگی کیا یہی چادر اور چار دیواری ہے کیا بھائی اپنی بہنوں
کے لئے یہی کر سکتے ہیں کہ جونہی کوئی بدخواہ نہیں میلی آنکھ سے دیکھے وہ اس کی آنکھ
جھکانے کی بجائے بہن کو جیسے تیسے گھر سے رخصت کر دیں۔ یہ کیسی شریف النفسی تھی کہ
بیری پر پتھر پھینکنے والے ہاتھ کو نہ روکا جائے بیری کاٹ دی جائے۔ میری آنکھوں میں آنسو
آگئے لیکن ان اشکوں کے پیچھے ایک اطمینان بھی تھا جو کچھ ہو رہا تھا ٹھیک ہو رہا تھا شادی
ایک نہ ایک دن تو ہونا ہی تھی ابھی ہو جاتی تو بہتر تھا بہت سے مسئلے سلجھ جاتے اور اس
شخص کو سزا بھی ملتی جس نے کچھ دیر کے لئے ہی سہی ایک بے ہودہ سپنا دیکھا تھا۔ امی جی
کے کمرے میں ہونے والی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کل جو عورتیں آئیں وہ درحقیقت ہمارا

گھر دیکھ کر گئی تھیں اور اب چار پانچ روز تک انہیں پھر آنا تھا۔ آخر یہ چار پانچ روز بھی گزر گئے ایک دن امی جی نے کہا کہ نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن لو کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ میں نے جی اچھا کہہ کر سر جھکا دیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں ایک مجرم ہوں اور پورا گھر منصف ہے جو باہمی مشورے سے میرے لئے کوئی سزا تجویز کر رہا ہے۔ سہ پہر کے وقت مہمانوں نے گھر میں قدم رکھا سب اہل خانہ ان کے آگے بچھ بچھ گئے۔ وہ پانچ عورتیں تھیں خوب صحت مند اور پاٹ دار آواز والی۔ امارت کی نشانیاں جا بجا ان کے جسموں پر بجی ہوئی تھیں وہ مجھے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے میری پیشانی پر برائے فروخت کا بورڈ لگا ہے۔ فرخندہ کی پھوپھو پرنسپل نادرہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ انہوں نے ہی یہ رشتہ میرے گھر والوں کو بتایا تھا۔

آخر کئی تکلیف دہ اور دل سوز مرحلوں سے گزرنے کے بعد منگنی کی رسم انجام پائی۔ لڑکے والوں کو میں پسند آ گئی تھی اور میرے گھر والوں کو میرا نیا گھر پسند آ گیا تھا شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ اس دوران میرے ہونے والے شوہر کی ایک تصویر بھی ہمارے گھر پہنچی۔ وہ گھنی مونچھوں والا ایک صحت مند نوجوان تھا شکل و صورت اچھی تھی۔ اس دوران اپنے خاوند کے مشغلوں اور عادات کے بارے میں مجھے بتایا جاتا رہا۔ وہ گھڑ سواری اور شکار کے شوقین تھے زمینوں کی تمام دیکھ بھال انہی کے سپرد تھی کیونکہ ان کے بڑے بھائی ایک عرصے سے کینیڈا میں مقیم تھے اور وہیں پر شادی کر لی تھی۔ میرے شوہر کو امپورٹڈ لباس پسند تھے کھانوں میں انہیں مچھلی بھنا ہوا بٹیر اور ماش کی دال بھاتی تھی۔ پھول انہیں گلاب کا اچھا لگتا تھا لیکن بالکل ترو تازہ۔ یہ باتیں بتدریج اور غیر محسوس طریقے سے مجھے ذہن نشین کرا دی گئیں میرے شوہر کا ذکر کرتے ہوئے بھابیوں کے لہجے میں عجیب طرح کا تفاخر آ جاتا جیسے وہ احسان جتا رہے ہوں کہ دیکھو ہم نے تمہارے لئے کیسا بر ڈھونڈا ہے ساری زندگی راج کرو گی کون کہتا ہے کہ بھابھیاں اچھی نہیں ہوتیں۔ درحقیقت میرا بیاہ جھنگ کے ایک جاگیردار گھرانے میں ہو رہا تھا بہت سکھی لوگ تھے انہیں صرف اپنی پسند کی لڑکی چاہئے تھی اور یہ میری قسمت کہ انہیں میں پسند آ گئی۔ امی جی تو میرا منہ چوم چوم نہ تھکتی تھیں کہتی تھیں میری بیٹی کے نصیب جاگ اٹھے لاکھوں میں ایک گھرانہ ملا ہے برادری والے دانتوں میں انگلیاں دباتے ہیں۔ منگنی کے بعد

شادی کے دن طے ہوئے اور ہمارے آنگن ڈھولک پر تھاپ پڑنے لگی۔ خاندان کی لڑکیاں دن بھر گیت گاتیں اور چھیڑ چھاڑ جاری رہتی۔ فرخندہ بھی ڈھولک پر آنے لگی پہلے دن تو وہ بجھی بجھی سی رہی پھر اس نے بھی خود کو شادمانی کے اس دھارے میں شامل کر لیا۔ اسے میری قسم یاد تھی اس لئے کبھی اس نے سلیم کے بارے میں ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ میں نے بھی دل کے چور دروازے کو دیوار کر دیا تھا ہاں کبھی کبھی یہ خیال ذہن میں ضرور آتا کہ سلیم کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ آخری ملاقات میں میرے الاؤ کی کچھ چنگاریاں اڑ کر اس کے خرمن میں بھی آگ جگا گئی ہوں اور اب وہ بھی سلگ رہا ہو۔ اس شبے کو یوں بھی تقویت ملتی تھی کہ مجھ سے ملاقات میں ناکامی کے بعد اس نے فرخندہ کی پھوپھو کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ پھر فرخندہ کا ایک فقرہ بار بار میرے کانوں میں گونجنے لگتا سلیم سے پہلی اور آخری ملاقات کے بعد اس نے شوخی سے کہا تھا "تیری صورت ایسی ہے کہ راہ چلتے کو دشمن بنا لیتی ہے اور جس کے ساتھ تو آدھ گھنٹا کیبن میں باتیں کرتی رہی اس کی وحشتوں کا تو کیا پوچھنا؟"

میں اس پہلو سے سوچتی تو تصور عجیب عجیب ہیولے بنا کر ڈرانے لگتا کبھی میں سوچتی ایسا نہ ہو کہ سلیم جیل سے بھاگ نکلے اور شادی سے پہلے یہاں پہنچ کر کوئی ہنگامہ کر دے۔ فلموں اور کہانیوں کے سین میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ سلیم غصے سے پھنکارتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے اور وہ مہمانوں سے لڑتا بھڑتا میرے کمرے تک پہنچتا ہے اور مجھے اپنے کندھے پر اٹھا کر للکارتا ہے کس میں اتنی جرات ہے کہ مجھے روک سکے؟ کبھی میں تصور میں اس کی خون میں نہاتی ہوئی لاش دیکھتی کبھی بھائیوں کی رسوائی کا منظر ذہن میں آتا۔ جب ذہن پر ایسی پاگل کر دینے والی سوچوں کی یلغار ہوتی تو میں نوافل پڑھنے شروع کر دیتی اور کبھی سارا سارا دن مصلے پر گزر جاتا۔

پھر میری شادی کا دن آن پہنچا ہر گھڑی ایک تلوار میرے سر پر لٹکتی رہی۔ یوں لگتا ابھی کوئی ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ دل کہتا ثناء محمود تیری سوچوں کی گمراہی تجھے معاف نہیں کرے گی۔ بالآخر اذیت ناک گھڑیاں گزر گئیں نکاح کی رسم ادا ہو گئی میں ثناء محمود سے ثناء واصف چنگیزی بن گئی۔ مبارک باد اور سسکیوں کے ملے جلے شور میں پیلی دھات کے بوجھ سے جھکی لرزتی کانپتی گل پوش مرسیڈیز میں جا بیٹھی۔ میرا دولہا زرتار کلاہ پہنے گھوڑے پر

سوار آگے آگے جا رہا تھا آسمان سے نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی میں نے مندھی ہوئی آنکھوں سے دیکھا یہ وہی گلی تھی جہاں سے میں سینکڑوں بار گزر کر سکول اور کالج گئی تھی لیکن آج یہ گلی کتنی اجنبی لگ رہی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ میرا سر گھومنے لگا شاید میں میکے اور سسرال کے درمیان معلق ہو گئی تھی۔ میں نے پہلو میں بیٹھی فرخندہ کا ہاتھ تھام لیا فرخندہ نے میرا ہاتھ دبایا اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے گفتگو کر رہا تھا "جان مستقبل پر نظر رکھو ماضی کو بھول جاؤ۔ بھول جاؤ کہ کبھی ہم ان گلیوں میں کھیلتے تھے اس شہر کی سڑکوں پر گھومے تھے یہاں کے سبزازاروں میں شامیں گزاری تھیں اور تہوار منائے تھے۔ بھول جاؤ لائبریریوں کو کیٹس اور روز ورتھ کی شاعری کو اور منٹو کرشن چندر اور ابن انشا کی کتابوں کو بھول جاؤ سوالاز' راجر مور اور جین فونڈا کی فلموں کو بھول جاؤ ان دنوں اور راتوں کو جب ہم سارا سارا دن کرکٹ دیکھتے تھے اور رات رات بھر تبصرے کرتے تھے اور ان سب کے ساتھ ساتھ اس چھت کو بھی بھول جاؤ جس پر کھڑی ہو کر تم کسی کے گزرنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔"

میری سسرال جھنگ کے مضافات میں واقع تھی۔ اس عالیشان حویلی میں میری ازدواجی زندگی کا آغاز گو معمول کے مطابق تھا لیکن دوسرے ہی دن ایک بدمزگی پیدا ہو گئی۔ دوسرے روز ولیمہ تھا اور لاہور سے ہمارے خاندان کی عورتیں بارات کے ساتھ ہی جھنگ چلی آئی تھیں۔ یہاں ان کے ساتھ وہ سلوک نہ ہوا جس کی انہیں توقع تھی بہرحال شادی کے ہنگاموں میں بعض اوقات مہمانوں کو انفرادی توجہ نہیں دی جا سکتی لیکن اس پر مستزاد یہ کہ میری سسرالی عورتوں نے باتیں بنائیں اور کہا کہ ہم نے ان کا شایان شان استقبال نہیں کیا اور دوسری رسومات پوری کرنے میں بخل سے کام لیا ہے۔ یہ سب کچھ قطعی غیر متوقع تھا میرے گھر والوں نے مہمانوں کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور مقدور سے زیادہ خرچ کیا تھا۔ اس نوک جھونک کی وجہ سے ولیمے کا اختتام خاصی بدمزگی میں ہوا میرے عزیز پروگرام مختصر کر کے اس رات لاہور واپس آ جانا چاہتے تھے لیکن میرے چچا سسر نے انہیں روک لیا دوسرے روز وہ مجھے لاہور واپس لے آئے۔

دستور کے مطابق میرے شوہر بھی ساتھ تھے ہمیں تین چار روز یہاں رہنا تھا۔ ان کی خدمت میں میرے گھر والے اور خاص طور پر امی جان قدموں میں بچھی جا رہی تھیں۔

کوٹھی کا ایک حصہ ہمارے استعمال کے لئے خالی کر دیا گیا تھا۔ ایک ملازم ہر وقت دروازے پر موجود رہتا تھا۔ دو دن تو ٹھیک گزرے لیکن تیسرے روز واصف اپنی اکتاہٹ کا اظہار کرنے لگے کہنے لگے۔

"شادی یہاں گھٹن بہت زیادہ ہے۔"

میں نے کہا "جناب یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہم دوسری منزل پر زیادہ ہوا دار کمروں میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔"

وہ بولے "یہ بات نہیں دراصل تمہارے گھر والے اور خاص طور پر امی جان اس قدر خوشامدانہ میرا مطلب ہے عزت افزائی کا رویہ اختیار کرتی ہیں کہ الجھن ہونے لگی ہے۔"

مجھے واصف کی بات پر جھٹکا سا لگا لیکن پھر سنبھل کر بولی "آپ چاہتے ہیں کہ جہاں ہم ہوں وہاں صرف ہم ہوں۔"

میری بات سمجھتے ہوئے انہوں نے مجھے بانہوں میں لے کر ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ ہمارے گھر میں شاید ان کا پہلا اور آخری قہقہہ تھا۔

پانچویں روز جب میں باتھ روم میں تھی امی جان نے ان کے سامنے چائے رکھنی چاہی جو ان کے پاؤں پر گر گئی وہ ایک دم بھڑک اٹھے "کیا کر رہی ہیں آپ؟ نوکر مر گیا تھا کہیں!" ان کی گرج سن کر میں سر پر تولیہ لئے باہر نکلی وہ قالین پر کھڑے تھے اور امی جھکی ہوئی اپنے دوپٹے سے ان کے پاؤں صاف کر رہی تھیں۔ ان کا چہرہ پھر بھی غصے سے تمتما رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد ہمارے گھر والوں میں واصف کے لئے جھجک سی پیدا ہو گئی شادی کے بعد دو مہینوں میں میں تین چار دفعہ میکے آئی سب واصف سے دبے دبے رہے۔ قدرتی بات ہے کہ آدمی جس سے خائف ہو اس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی حرکت سرزد ہو جاتی ہے اس سے فریق ثانی اور مشتعل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو "چین" کی صورت آگے بڑھتی ہے ویسے بھی واصف کی شخصیت میں بے پناہ دبدبہ اور تحکم تھا انہیں ہمارے گھرانے پر واضح معاشی اور سماجی برتری بھی حاصل تھی وہ میرے میکے والوں سے کبھی گھل مل نہ سکے۔ میرے میکے میں ہر وقت ان پر ایک خشک

سا موڈ طاری رہتا تھا میرے ساتھ ان کا رویہ اول اول ٹھیک تھا مگر میں محسوس کر رہی
کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی گرمجوشی کم ہو رہی ہے۔ پہلے پہل میں نے خود کو یہ
کر تسلی دی کہ ان پر بے پناہ ذمہ داریاں ہیں زمینوں اور کارخانوں کی دیکھ بھال ا
مزارعوں کے معاملات ہیں پھر کچھ مقدمے بھی چل رہے ہیں ان سب بکھیڑوں کے باو
اگر وہ میرے پاس آجاتے ہیں تو کیا کم ہے لیکن جب پانچویں چھٹے مہینے میری طبیعت خرا
رہنا شروع ہوئی تو واصف مجھے بالکل نظرانداز کرنے لگے۔ میں اتنی بڑی حویلی میں نوکرو
کے آسرے پہ تھی۔ ایسے موقعوں پہ ساس بڑا مشفق کردار ادا کرتی ہے بہو کو اونچ
سمجھاتی ہے اور خوراک لباس کا خیال رکھتی ہے لیکن میری ساس خود بیمار رہتی تھیں
دیسی دوائیاں ان کی کمزوری بن چکی تھیں۔ ان کی الماری ہر وقت معجونوں کشتوں ا
خمیروں سے بھری رہتی تھی۔ شروع شروع میں میں نے ان کے علاج معالجے کی طرف
توجہ دینے کی کوشش کی لیکن وہ اس معاملے میں کسی کی مداخلت پسند نہ کرتیں تھیں
رہیں نندیں تو وہ ہمیشہ مجھ سے دور دور رہیں انہوں نے پہلے دن سے تصور کر لیا تھا
میں شہر کی ایک آزاد طبع لڑکی ہوں جس کی دلچسپیاں اور رجحانات ان سے قطعی مختلف
ہیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ میری نوکرانی سکینہ نے مجھے بتایا کہ حویلی کے مردانے میں
"مجرا" ہو رہا ہے۔ مجرے کا لفظ میں نے پہلی بار سنا تھا اس لئے تعجب سے سکینہ کا منہ تک
گی۔ تب اس نے مجھے سمجھایا کہ شہر سے آئی ہوئی ایک کنجری آج حویلی میں ناچ رہ
ہے۔ یک لخت جیسے آسمان ٹوٹ کر میرے سر پر آن پڑا اندیشوں کے دیو خوش فہمی
پردے چاک کرکے میرے سامنے آکھڑے ہوئے یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا
میرے شوہر کے مشاغل میں طوائف نوازی بھی شامل ہے مگر وہ حویلی میں رقص و سرود
محفل جمائیں گے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا انہیں میری ذرا
پرواہ نہ رہی تھی۔ رات گئے تک میں انگاروں پر لوٹتی رہی جب وہ شراب کے نشے میں
دھت کمرے میں داخل ہوئے تو وال کلاک کا گھنٹا دو بجے کا اعلان کر رہا تھا میں نے رو
کی۔ وہ پلنگ پر نیم دراز سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے جیسے انہیں توقع ہو کہ میں
کچھ کہوں گی۔

میں دبے لہجے میں بولی "اگر آپ اپنی دلچسپیاں حویلی کی چار دیواری سے دور
رکھیں تو زیادہ مناسب ہے۔"

وہ جیسے بہانہ ڈھونڈ رہے تھے پھٹ پڑے "تم کون ہوتی ہو میرے معاملات میں
دخل دینے والی؟"

"آپ کی بیوی" میں نے مستحکم لہجے میں کہا

"بند کرو یہ بکواس تو بیوی کہلانے کے لائق نہیں تجھ میں اور اس طوائف میں اگر
کوئی فرق ہے تو اتنا کہ وہ جھوٹی نہیں۔"

میری نگاہوں میں کمرا گھومنے لگا خود کو گرنے سے بچانے کے لئے جلدی سے ان
کی پائنتی بیٹھ گئی۔ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میرے ہونٹوں سے نکلی۔ "واصف آپ اپنے
حواس میں نہیں جو اپنی بیوی کو طوائف کہہ رہے ہیں۔"

وہ چیخے "ہوش میں ہی تو آیا ہوں شاہ بی بی' کیا معلوم تھا کہ جسے ہیرا سمجھ کر گندی
نالی سے اٹھایا ہے وہ گندی نالی ہی کی چیز ہے۔"

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا چیخ کر بولی "خدا کے لئے واصف اب ایک لفظ اور نہ
کہنا ورنہ........."

"ورنہ کیا؟" وہ مجھ سے بھی بلند آواز میں گرجے "یہی کرو گی نا کہ اپنے اس یار
کے ساتھ بھاگ جاؤ گی جس کی جدائی تم اس گھر میں قید کی طرح کاٹ رہی ہو۔"

خدا جانے کیسے میں نے اپنے اندر وہ سب کچھ سننے کا حوصلہ پیدا کر لیا۔ وہ کہتے گئے
اور میں سنتی گئی الفاظ کو اس قدر سفاک اور سماعت کو اس قدر گھائل میں نے کبھی نہیں
پایا۔

واصف نے نہایت زہریلے لہجے میں مجھ پر بدکرداری کا الزام لگایا اور کہا کہ نہ
صرف میرا ماضی گناہ آلود تھا بلکہ حال بھی اس کیچڑ میں لتھڑا ہوا ہے۔ میں اب بھی لاہور
جاتی ہوں تو اپنے پرانے عاشق کو داد عیش کا موقع فراہم کرتی ہوں۔ انسان واقعی سخت جان
ہے یہ سب کچھ سن کر بھی میں زندہ رہی یہ اور بات ہے کہ یہ زندگی ایک سکتے کی سی تھی
بے رنگ و بو بے لمس و بے صدا کئی روز میں اس سکتے سے باہر نہ نکل سکی۔ تیر تو ایک
ہی بار سینہ چھلنی کر دیتے ہیں لیکن الفاظ کے تیر خیال کی کمان سے نکل کر بار بار روح کو

18168

چھیدتے رہتے ہیں۔ میں بیٹھی رہتی اور سوچتی رہتی واصف نے یہ سب کچھ کیوں
واقعی ایسا ہوا ہے یا میں محض ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں جانتی تھی واصف
میرے جس عاشق کا ذکر کیا ہے وہ سلیم ہے۔ سلیم کے نام کے سوا میرے ماضی کی چادر
نام لینے کو آلائش نہیں تھی۔ جہاں تک عدنان کا تعلق ہے وہ میرا ماموں زاد تھا اور ا
سے میری منگنی متوقع تھی لیکن میں کوشش کے باوجود کبھی اس سے بے تکلف نہ ہو
اس سے ملتے وقت مجھ پر ہمیشہ ایک ناروا سنجیدگی طاری رہی۔ کسی کہنے والے نے صحیح
ہے کہ میں نے خدا کو اپنے ارادوں کی ناکامی سے پہچانا۔ ایک وقت آیا تھا میں نے عدنان
کی حوصلہ افزائی کی شعوری کوشش کی لیکن فطرت کے دھارے میں اکتسابی دلچسپی کے
اس پتھر کا کچھ پتہ نہ چلا۔ "سلیم اور صرف سلیم" میرے دل کی گواہی تھی کہ میرے
آشیاں میں بھڑکنے والی آگ کی چنگاری اسی نام سے اڑی ہے۔ معلومات حاصل کرنے کے
لئے واصف کے اپنے ذرائع تھے یقیناً کسی طرح اسے پتہ چل گیا تھا کہ شادی سے پہلے میر
نام سلیم کے ساتھ لیا گیا ہے۔ اس کے شکی ذہن نے اس واقع کو مخصوص پس منظر میں
دیکھا تھا اور بالآخر مجھے ایک طوائف کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ اگر اس واقع میں میرے
لئے کوئی پہلو کم ترین سطح پر مثبت ہو سکتا تھا تو وہ یہ تھا کہ میری بے وفائی سے دل برداشتہ
ہو کر واصف نے رقص و سرود کی محفل میں غم غلط کرنا چاہا تھا اور میری بے راہروی کا
صدمہ اسے ایک طوائف کے پہلو میں لے گیا تھا لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا تھا واصف
کا انداز چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اسے میرے "گھناؤنے" ماضی سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ
اس الزام کو اپنی عیاشیوں کے لیے جواز بنا رہا تھا۔ اس واقعہ کا یہی پہلو میرے لئے سب
سے اذیت ناک تھا۔ اس بے حسی پر میں جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔ کوئی ایک ماہ بعد کی بات
ہے میرا بھائی پرویز مجھے لینے کے لئے جھنگ آیا اس نے بتایا کہ امی جان بیمار ہیں اور انہوں
نے کہا ہے کہ جیسے بھی ہو میں آپ کو لے کر آؤں۔ میں نے شام کو واصف سے ذکر کیا
اور انہیں کہا کہ وہ مجھے لاہور لے جائیں انہوں نے صاف انکار کر دیا اور بولے کہ لاہور
جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی اور پرویز کو واپس
بھیج دیا۔ آٹھ دس روز بعد پھر ٹیلی گرام آگیا کہ امی جی کی حالت بہت خراب ہے وہ بار بار
مجھے یاد کر رہی ہیں۔ میں نے ٹیلی گرام واصف کے سامنے رکھ دیا انہوں نے ناک بھوں

ہوئے کہا "میری ماں بھی تو بیمار ہے تمہارے گھر والے کہتے ہیں مکر کئے پڑی رہتی
ان کو ذرا احساس ہونا چاہئے کہ بیماری سب کو آسکتی ہے" میں نے تعجب سے کہا
"واصف اس گھر میں کسی نے ایسی بات نہیں کی آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔"
وہ دھاڑے "کچھ بھی ہے تم لاہور نہیں جاؤ گی بلکہ اس حویلی سے باہر نہیں جاؤ گی
یہ میرا حکم ہے۔"
واصف کا لہجہ اور انداز مجھے بہت کچھ سمجھا رہا تھا مجھ پر دھیرے دھیرے اور بتدریج
انکشاف ہو رہا تھا کہ میں اس چار دیواری میں قید کر دی گئی ہوں اور پھر میری زندگی کا
منحوس ترین دن طلوع ہوا جب میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ ہاں
میری زندگی کا منحوس ترین دن تھا۔ ایک طرف میں اپنی ایک عزیز ترین ہستی سے محروم
ئی دوسری طرف میرے اختیار مان اور وقار کا خون ہو گیا۔ میں اس حویلی میں ایک
کاری پھکاری ہوئی بے وقعت شے بن کر رہ گئی۔ صبح نو بجے کے قریب ملازمہ ایک ٹیلی
ام لے کر آئی۔ ٹیلی گرام دیکھتے ہی جیسے میرا دل رونے لگا میری نظر ٹیلی گرام کی تحریر
ی اور میں اپنی پیاری امی جی سے بچھڑ گئی وہ مجھے چھوڑ کر کبھی نہ آنے کے لئے جا چکی
میرے ر اور ان کی گود کا رشتہ ختم ہو چکا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر روئی اور بہت
ئی لیکن ابھی مجھے اور بھی رونا تھا۔ میں ماں کا آخری پیار نہ لے سکی تھی ان کی مختصر
آنکھوں کو اپنی صورت نہ دکھا سکی تھی مگر یہ تصور میں بھی نہ تھا کہ میں انہیں سفر آخرت
رخصت بھی نہ کر سکوں گی ان کی پیشانی کو الوداعی بوسہ بھی نہ دے سکوں گی۔
یہ جان کر مجھے تکلیف اور حیرت ہوئی کہ حویلی میں سے کوئی بھی لاہور جانے کا
گرام نہیں رکھتا۔ واصف اس روز کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے دیور شجاع سے
تاکہ وہ مجھے لاہور لے جائے مگر اس نے کہا کہ امی جان کی طبیعت آج خراب ہے اس کا
کے پاس رہنا ضروری ہے۔ میں نے واصف کے ملازم خاص اور ذاتی محافظ رب نواز کو
یا اور اس سے کہا کہ وہ مجھے جیپ پر سٹیشن تک چھوڑ آئے اس نے دبے لہجے میں کہا
بیگم جی جیپ دو دن سے خراب پڑی ہے۔"
میں نے کہا "اچھا کسی تانگے کا انتظام کر دو۔"
وہ بولا "بیگم جی بات دراصل یہ ہے کہ زمیندار شاب کے بندے آج کل جیل

توڑ کر بھاگے ہوئے ہیں۔ چودھری صاحب بڑی احتیاط کر رہے ہیں' انہوں نے کہ...
رکھا ہے کہ ان کی اجازت کے بغیر کوئی حویلی سے باہر نہ جائے۔"

میں نے غور سے رب نواز کی طرف دیکھا' وہ سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔"...
میں مجبور ہوں' چودھری صاحب کی اجازت کے بغیر آپ اس حویلی سے با...
جاسکتیں۔ اگر آپ ایسا کریں گی تو مجھے آپ کو روکنا پڑے گا۔"

میں نے چیختے ہوئے کہا "رب نواز' کہاں ہیں تمہارے چودھری صاحب؟"

رب نواز نے اپنی افسردہ نگاہیں اٹھائیں اور بولا "مجھے معلوم نہیں بیگم ج...
روز مجھے اندازہ ہوا قفس اور پرندے کا استعارہ کیا ہے' صیاد اور زنجیر کی تشبیہیں...
رکھتی ہیں۔ میں اس تنگی حویلی میں اپنی ماں کے آخری.......... قطعی آخری دیدار ک...
تڑپ تڑپ گئی۔ ایک ایک شخص کو واسطہ دیا' ایک ایک دیوار سے سر ٹکرایا لیکن...
مجھ پر رحم نہ آیا۔ گھڑی کی سوئیاں سرکتی رہیں۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شا...
لیکن واصف واپس نہیں آئے۔ جو شخص میرے زنداں کی کلید رکھتا تھا نہ جا...
مصروفیتوں میں کھو گیا تھا..........

آخر وہ دن گزر گیا اگلے روز میں اپنی خواب گاہ میں نیم جان پڑی تھی کہ با...
تیز تیز بولنے کی آوازیں آئیں۔ یہ میرے بھائی تنویر کی آواز تھی۔ میں جلدی س...
نکلی۔ بھائی کی صورت دیکھ کر چیخ نکل گئی ایک دوسرے سے لپٹ کر ہم خوب ر...
تنویر غصے سے بھرا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے آنے سے زبردستی روکا گیا ہے۔...
آواز سے کہنے لگا۔

"چل مری بہن' میں تجھے لے کر جاؤں گا' دیکھتا ہوں کون روکتا ہے مجھے۔"

"بابو تنویر صاحب' ہمارے لئے آپ بھی اتنے ہی قابل عزت ہیں جتنے چ...
صاحب۔ خدا کے لئے مسئلہ کھڑا نہ کیجئے۔ جو ہوتا تھا ہو چکا۔ بیگم جی اپنی والدہ کی ش...
دیکھ سکیں' یہ ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ اب آپ انہیں لے جانے کی ضد نہ ...
چودھری صاحب نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ.........."

"کیا چودھری صاحب.......... چودھری صاحب" تنویر غصے سے بولا "اس شخ...
ہٹ دھرمی ہماری ماں کی جان لے گئی۔ وہ اپنی بیٹی کی صورت کو ترستی ہوئی مرگئی۔ ا...

...نا ہے وہ؟"

تنویر کی بلند آواز کے ساتھ ہی مردانے کی طرف بالکونی کا دروازہ کھلا اور میں وہاں
...ف کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ نہ صرف گھر تھے بلکہ یہاں ہونے والی ساری گفتگو بھی
...رہے تھے۔ سگار پیتے دھیمے قدموں سے نیچے اتر آئے اور بغیر کسی علیک سلیک کے تنویر
...ے بولے "کیا بات ہے؟"

تنویر نے غصے سے کہا "واصف صاحب آپ گھر میں تھے؟"

"ہاں گھر میں تھا" انہوں نے کڑے تیوروں سے کہا۔

"کب سے؟"

"کل شام سے۔" وہ طیش آمیز لاپرواہی سے بولے۔

"اس کے باوجود آپ.......... ثناء کو لے کر نہیں آئے۔"

"تو تم اسے لینے آئے ہو!" انہوں نے حد درجہ غیریت سے کہا۔

"جی ہاں۔"

وہ تنویر کی طرف انگلی اٹھا کر سرد لہجے میں بولے "چلے جاؤ یہاں سے' میں کہتا ہوں
نکل جاؤ میرے گھر سے' میں اس طرح بولنے والوں کی زبان کھینچ لیا کرتا ہوں۔"

تنویر نے کہا "اگر میں نہ جاؤں تو؟"

وہ روانی سے بولے "تو میں تمہاری ٹانگیں تڑوا کر سڑک پر پھکوا دوں گا۔"

"واصف صاحب' آپ ہوش میں تو ہیں؟" تنویر غصے سے بری طرح لرز رہا تھا۔

واصف دھاڑے "میں کہتا ہوں" چلے جاؤ' گیٹ آؤٹ.......... اور پھر تمہارے گھر کے کسی
فرد نے اس حویلی کی طرف منہ کیا تو جان سے جائے گا۔"

واصف کے لہجے نے میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی۔ کچھ کہنا چاہا لیکن فرط
جذبات سے زبان لڑکھڑا کر رہ گئی۔ میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔ نہ جانے
کب تک وہاں پڑی سسکتی رہی آخر دوپہر کے وقت ملازمہ نے آ کر اٹھایا اور اس کی زبانی
مجھے پتہ چلا کہ واصف نے تنویر کو دھکے دے کر نکلوا دیا تھا۔

میکے سے اب میرا رابطہ مکمل طور پر منقطع ہو چکا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی وہ
لوگ کیا سوچ رہے ہیں کیا کر رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی جھنگ پہنچا بھی تو واصف نے

اسے مجھ سے ملنے نہیں دیا۔ حویلی میں میری زندگی دن بدن اجیرن ہوتی جا رہی تھی۔
کہیں کہ میں ایک قابل نفرت قیدی کی زندگی بسر کر رہی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ واصف
کردار اب کھل کر سامنے آگیا تھا۔ ان کا رویہ مجھ سے زر خرید کنیز کا سا تھا۔ مجھے ان
پوچھنے کا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ دن کیسے گزارتے ہیں رات کہاں بسر کرتے ہیں اگر وہ
رات میرے پاس چلے آتے تو یہ ان کی عنایت ہوتی ورنہ میں تنہا سوچوں کی سولی پر
رہتی۔

میں سوچتی تھی ابھی میں جوان ہوں پرکشش ہوں شادی کو صرف آٹھ دس
ہوئے ہیں۔ جب حالات بدل جائیں گے واصف کے غضب اور میرے جرم بے گناہی کے
درمیان میری جسمانی دلکشی بھی حائل نہ رہے گی تو میرا انجام کیا ہوگا۔ پھر میرے ذہن
میں جاگیرداروں اور وڈیروں کے وہ روایتی قصے گردش کرنے لگتے جن میں بتایا جاتا ہے کہ
ایسے لوگ جب اپنی عورتوں سے اکتاتے ہیں تو انہیں سوکنوں کا زہر پلا دیتے ہیں۔ وہ گھٹ
گھٹ کر اور سسک سسک کر مرجاتی ہیں یا زندہ درگور ہو جاتی ہیں۔ بعض ایسے بھی
ہوتے ہیں جو سچ مچ انہیں زہر دے دیتے ہیں اور ان کی لاش کو پورے خاندانی اعزاز کے
ساتھ آبائی قبرستان کی زینت بنا دیتے ہیں۔ میں ڈر کر سوچنے لگتی کیا میرے ساتھ بھی
عنقریب ایسا ہی ہونے والا ہے.......... دھیرے دھیرے بے خبری کے پردے چاک ہو رہے
تھے۔ درحقیقت میری شادی نہیں ہوئی تھی' میری بدقسمتی مجھے رشتے کی زنجیر سے باندھ کر
ایک عیاش اور بے رحم شخص کے حرم میں لے آئی تھی۔ درست ہے کہ میں اس حرم کی
پہلی عورت تھی لیکن آخری نہیں تھی۔ عنقریب کوئی رقاصہ کوئی اداکارہ کوئی نوخیز طالبہ
کوئی ماڈل گرل یا کوئی بھی خوش جمال عورت اس حرم میں قدم رنجہ فرمانے والی تھی۔
ابھی کچھ نہیں ہوا تھا لیکن میرے احساس کے آئینے میں آنے والے دنوں کی ہولناکی اور
حرماں نصیبی جھلک رہی تھی۔

ایک روز ملازمہ سکینہ کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک "بیلف" چند پولیس والوں کے
ہمراہ مجھے حویلی سے برآمد کرنے آیا ہے۔ میں حیران و پریشان سکینہ کی باتیں سنتی رہی اس
نے بتایا "بیگم جی! آپ کے بھائیوں نے عدالت میں کیس کیا ہے کہ ان کی بہن کو اس کے
سسرال نے قید کر کے رکھا ہوا ہے۔ اب عدالت کے حکم پر بیلف آپ کو لینے آیا ہے'

تاکہ جج کے سامنے آپ کا بیان لیا جائے۔ وہ لوگ بیٹھک میں بیٹھے ہیں۔ بیلف کہتا ہے
کہ آپ اس کے ساتھ لاہور جائیں گی' کل رات دارالامان میں رہیں گی اور پرسوں صبح
عدالت میں آپ کا بیان ہوگا' چودھری صاحب کہہ رہے ہیں کہ اس طرح ہماری بدنامی ہے
میں خود بیوی کو لے کر لاہور پہنچتا ہوں' آپ مجھ پر بھروسا کر کے واپس چلے جائیں۔
بیلف مانتا نہیں۔ اس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔"
پھر سکینہ نے ادھر ادھر دیکھا اور اچانک آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "بیگم جی رب
کا واسطہ اس حویلی سے اپنی جان چھڑا لیں' بھوک ننگ میں گزارا کر لیں بھائیوں کی باتیں
مان لیں لیکن اس قید سے نکل جائیں۔ آپ بڑی معصوم ہیں ان لوگوں میں بے موت
ماری جائیں گی۔"
مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ابھی ہم باتیں کر رہی تھیں
کہ واصف آگئے۔ سکینہ کو باہر بھیج کر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور بے قراری
سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ میں "صم بکم" کی تفسیر بنی پلنگ پر بیٹھی رہی۔ کوئی سوال پوچھنے
کی ہمت نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کوئی پر جلال حاکم کسی مجرم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا
ہے۔ آخر ان کے بے قرار قدم رکے اور وہ قدرے نرم لہجے میں بولے۔
"ثناء تمہیں معلوم ہے تمہارے بھائیوں نے کیا کیا ہے۔ انہوں نے ہائی کورٹ میں
رٹ کی ہے کہ میں نے تمہیں حبس بیجا میں رکھا ہوا ہے' اب کورٹ نے تمہارا بیان لینے
کے لئے تمہیں جج کے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا ہے۔"
میں نے پوچھا "اب کیا چاہتے ہیں آپ؟"
وہ سگار سلگا کر بولے "یہی سوال میں تم سے پوچھتا ہوں۔ میری طرف سے تم پر
کوئی پابندی نہیں۔ اگر تم آزاد ہونا چاہو تو ہو سکتی ہو..........؟"
میرے سر پر جیسے بجلی گر پڑی "طلاق.......... کیا میں واصف سے طلاق لوں گی؟"
نہیں.......... ایسا تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ طلاق میرے لئے موت سے
بدتر تھی۔ شاید ہر مشرقی عورت ایسا ہی سوچتی ہے کم از کم میرے لئے تو طلاق اور موت
میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اگر تھا تو یہ کہ اول الذکر موت ذلت آمیز تھی' اور میں یہ ذلیل
موت مرنا نہیں چاہتی تھی۔ ٹھیک تھا کہ یہ گھر میرے لئے جہنم تھا لیکن میرا گھر تو

تھا......... کبھی کبھار ہی سہی ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا ادھر آنکلتا تھا اور کیا معلوم تھا کب میرا مجازی خدا مجھ پر مہربان ہو جاتا اور مجھے اس جہنم سے نکال دیتا۔ امکانات کم ضرور تھے لیکن معدوم نہیں ہوئے تھے......... اس رات میں نے بہت سوچا اور آخر اس فیصلے پر پہنچی کہ اپنے مجازی خدا کو اسی وقت چھوڑوں گی جب حقیقی خدا کا بلاوا آئے گا۔

اگلے روز ہم بذریعہ سڑک جھنگ سے لاہور روانہ ہوئے۔ ہماری مرسڈیز میں بیلف اور میرا ایک چچازاد بھائی بھی موجود تھا۔ وہ بیلف کے ساتھ ہی آیا تھا۔ غالباً بیلف کی جیب گرم کی جاچکی تھی ورنہ وہ مجھے اپنے طور پر لاہور لے جانے کا پابند تھا۔ یہ رات ہم نے لاہور میں واصف کے ایک دوست کے گھر گزاری۔ اگلے روز مجھے کورٹ میں پیش کیا گیا۔ میرے بھائی ماموں نانا اور دوسرے قریبی عزیز وہاں موجود تھے ان سب کی نگاہیں میرے چہرے پر لگی تھیں۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ وہ میرے شریک غم ہیں۔ مجھے آزاد کروانے کے لئے انہوں نے جدوجہد کی ہے۔ بھاگے دوڑے ہیں' پیسہ خرچ کیا ہے اپنی راتوں کی نیند حرام کی ہے۔ اب وہ چاہتے تھے کہ میرے ہونٹ اس انداز سے ہلیں کہ میرے پاؤں کی زنجیریں پگھل جائیں۔ میں ایک بااثر جاگیردار کی قید سے آزاد ہو کر ان کے درمیان آجاؤں......... لیکن دل کی عدالت میں فیصلہ ہو چکا تھا۔ یہ زنجیریں ہی میرا گہنا تھیں۔ میں نے بھری عدالت میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہا کہ میں یہ بیان بغیر کسی دباؤ اور خوف کے اپنی مرضی سے دے رہی ہوں۔ میرا شوہر مجھ پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔ میں اپنے گھر خوش ہوں۔ اور علیحدگی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ ایک عاقل وبالغ لڑکی کا بیان تھا۔ جج نے مجھے اپنے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ میں چادر کے پلو میں آنسو چھپاتی اپنے خیرخواہوں کے ستے ہوئے چہروں سے نظر چراتی واصف کے ساتھ کورٹ سے باہر آگئی۔

میں نے اپنے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیے تھے۔ اپنے حق مزاحمت سے دستبردار ہو گئی تھی......... اس امید پر اپنی ناؤ جلا دی تھی کہ سمندر میں واپس دھکیلنے والے کو مجھ پر رحم آجائے گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ واصف کا رویہ کچھ دن ہی مجھ سے ٹھیک رہتا تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتی کہ وقتی طور پر سہی اسے میری وفاداری کا یقین آیا ہے اور اس کے دل میں میرے لئے رحم جاگا ہے لیکن اس کی بے مہریوں کا تو ٹھکانا ہی نہ تھا۔ حویلی

پہنچتے ہی اس نے آنکھیں بدل لیں۔ جیسے یہ سب کچھ میرا مقدر ہو۔ اس نے اس بات کو ذرا بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ تہہ دل سے مجھے حقیر جانتا ہے اور جانتا رہے گا۔

میرے ساتھ اس کا رویہ سخت تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک روز اس نے جھڑکیوں سے آگے بڑھ کر مجھے مارنے کی ابتدا کر دی۔ میں سب کچھ خاموشی سے سہتی رہی اور رات کی تنہائیوں میں رو رو کر قادر مطلق سے مشکل کشائی کی دعائیں کرتی رہی۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا کہ شاید میں نے بھائیوں کو جھٹلا کر اور خاوند کے حق میں بیان دے کر غلطی کی ہے۔ پتہ نہیں وہ میرے لئے کیا کیا کوششیں کرتے رہے تھے۔ وہ واصف کے مقابلے میں کمزور تھے اس لئے انہوں نے قانون کا سہارا لیا تھا۔ اپنے محدود وسائل کے ساتھ انہوں نے واصف کے لامحدود وسائل سے ٹکرانے کی کمزور سی کوشش کی تھی جسے میں نے اپنے بیان سے بے اثر کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے تھے۔ اپنے ضمیر کی عدالت میں سچے قرار پا گئے تھے۔ ممکن ہے اب بھی کبھی کبھی ان کے دل میں آتا ہو کہ میں نے جو کچھ کہا بہ امر مجبوری کہا اور انہیں میرے لئے مزید کوشش کرنا چاہیے لیکن ان میں اتنی استطاعت تھی اور نہ طاقت کہ وہ ضمیر کو اور مطمئن کر سکتے۔ اس لئے انہوں نے اتنے ہی "اطمینان" پر اکتفا کر لیا تھا اور خاموش ہو گئے تھے۔ سوچوں کی یلغار ہوتی تو دل بے قرار ہو کر گھائل پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگتا۔ جی چاہتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے بابل کے آنگن میں پہنچ جاؤں اپنے ماں جایوں کی صورتیں دیکھوں۔ ان کے بچوں کے منہ چوموں' ان گلیوں کو دیکھوں جہاں بچپن گزارا تھا۔ ان سہیلیوں سے ملوں جن سے بچھڑے زمانہ ہو گیا......... لیکن پھر حویلی کی بلندوبالا دیواریں اور ان کے باہر کھڑے مسلح پہریدار نگاہوں میں گھوم جاتے۔ وسیع و عریض خواب گاہ میں دم گھٹنے لگتا اور میں گھبرا کر اس کھڑکی کے پٹ کھول دیتی جو مشرق کی طرف کھلتی تھی......... میرے میکے کی طرف' میری جنم بھومی کی طرف.........

وہ بہار کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ وسیع لان کے پھول بوٹوں پر نرم دھوپ کی مہربان انگلیاں سرسرا رہی تھیں۔ میں خیالوں میں گم خواب گاہ کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی اچانک میری نظر سلیم پر پڑی......... ہاں میں نے سلیم کو دیکھا وہ مجھ سے صرف دس گز کے فاصلے پر کھڑا پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں

آیا۔ میں نے گھبرا کر پیشانی مسلی اور دوبارہ نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا قریب آ کر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مجھے ایک دم چکر سا آ گیا۔ کھڑکی بند کر کے میں حیران و پریشان صوفے پر آ بیٹھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی' میری آنکھوں نے کیا دیکھا ہے۔ کیا وہ سلیم کا کوئی ہم شکل تھا۔ مگر اس کے دیکھنے کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ سلیم ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک کھڑکی کے پٹ [illegible] اور میں نے دہشت زدہ نظروں سے دیکھا کہ سلیم کود کر کمرے میں آ گیا۔

"کک......... کون ہو تم؟" میں نے شدید خوف کے عالم میں پوچھا۔

وہ بڑے اعتماد سے آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتی اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ کھڑکی کی چٹخنی وہ پہلے ہی چڑھا چکا تھا۔ اب میں اور وہ اس خواب گاہ میں بالکل تنہا تھے۔

"تت......... تم یہاں کیوں آئے ہو؟" میں نے خوف کے عالم میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے کندھے کے نیچے سے تھام لیا۔ گرفت میں ایسی بات تھی کہ میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ مجھے بے حرکت دیکھ کر اس نے گرفت ختم کی اور اپنی بڑی بڑی ناراض آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ کر بولا۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" میں جیسے ہوش میں آتی ہوئی بولی۔

وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ "مجھے سب معلوم ہے ثنا" وہ عجیب بے تکلفی سے بولا "تم اس گھر میں بیوی کی نہیں' قیدی کی زندگی گزار رہی ہو۔ میں تمہیں اس چودھری کی جیل سے نکالنے آیا ہوں......... اور نکال کر رہوں گا......... چلو میرے ساتھ۔"

اچانک میرے جسم پر طاری لرزا معدوم ہو گیا اور میں خود کو ایک مضبوط عورت محسوس کرنے لگی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں میں نے کہا "تم مجھے یہاں سے لے جا سکو گے؟"

وہ قہر بھرے انداز میں بولا "میں دیکھتا ہوں' تمہیں لے جانے سے مجھے کون روکتا ہے؟ آج تک ان چودھریوں کو کسی بندے سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ ایک ایک کو سبق نہ

سکھادوں تو نام نہیں" سلیم کا لہجہ خوفناک حد تک سچا تھا۔ صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس حویلی میں ایک طوفان کھڑا کر دے گا اور وہ ایسا کر بھی سکتا تھا۔ میں جانتی تھی وہ خالی ہاتھ بھی بہت کچھ کر سکتا ہے اور اس وقت تو اس کے نیفے میں پستول بھی تھا جس کی ایک جھلک میں نے اس وقت دیکھی تھی جب وہ کھڑکی سے کودا تھا۔

"تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھے" میں نے بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم مجھے یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔ کیونکہ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی......... اور اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ ورنہ یاد رکھو میں ملازموں کو آواز دوں گی اور ان کے حصے میں تمہارا ایک ایک ٹکڑا بھی نہیں آئے گا۔ اس کو لاہور نہ سمجھنا۔ یہ جاگیردار واصف کی حویلی ہے۔ یہ لوگ ٹانگیں چیر کر شکاری کتوں کے آگے پھینک دیتے ہیں۔"

میرے مخالفانہ رویئے اور تند لہجے نے سلیم کو ششدر کر دیا لیکن صرف ایک لمحے کے لئے' دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کا غصیلا پن پھر عود کر آیا۔ اس نے مخصوص انداز میں گردن جھٹک کر بال پیشانی سے ہٹائے اور بولا "تم زیادہ نیک پروین نہ بنو اور چلو میرے ساتھ۔ مجھے سب پتہ ہے یہاں تمہارے ساتھ کیا گزر رہی ہے۔ کسی دن چودھری گلا گھونٹ کر تمہیں صحن میں گاڑ دے گا۔"

میں پھنکاری "وہ میرا گلا گھونٹے یا ٹکڑے کرے' میرا شوہر ہے اور خبردار اب اس کے متعلق ایک لفظ کہا تو......... میں آخری بار کہہ رہی ہوں اپنی یہ منحوس شکل لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ میرا تم سے واسطہ نہ کبھی تھا اور نہ ہے۔ اور اگر اتفاقاً کوئی رسمی تعلق پیدا ہوا بھی تھا میں اس پر لعنت بھیجتی ہوں۔ اب چلے جاؤ یہاں سے" آخری فقرے کے بعد میری انگلی کھڑکی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ پھر مڑ کر کھڑکی کی طرف گیا اور اسے کھول کر باہر نکل گیا۔ جب تک وہ سر جھکائے صحن سے باہر نہیں نکلا میری نظریں اس پر لگی رہیں۔ اس کے جانے کے بعد میں کمرا بند کر کے دیر تک روتی رہی۔ پردیس میں دیس کو جانے والے راستے بھی اچھے لگتے ہیں' یہ تو پھر جیتا جاگتا شخص تھا۔ یہ شخص میرا کچھ نہیں تھا لیکن ان گلیوں سے آیا تھا جہاں میرا گھر تھا اور میری زندگی کے بیس برس تھے۔ وہ اکیلا آیا تھا لیکن اس کے ساتھ ایک پورا شہر اور پورا دور چلا

آیا تھا۔ ان گنت زخموں کے منہ کھول گیا تھا یہ شخص۔ میں سوچتی رہی اور حیران ہوتی رہی کہ وہ مالی کے بھیس میں کیونکر حویلی کے اندر پہنچ سکا۔

وہ ساری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ دن چڑھے مجھے نیند آئی اور پھر میں دوپہر تک سوتی رہی۔ جاگی تو کل کی ساری باتیں خواب لگ رہی تھیں۔ اٹھ کر غسل کیا۔ کپڑے بدلے' باتھ روم سے باہر نکلی تو سکینہ کمرے کی صفائی کر کے چیزوں کو قرینے سے رکھ رہی تھی۔ تمام کھڑکیاں اس نے کھول دی تھیں۔ میری نظر سب سے پہلے مشرقی کھڑکی کی طرف گئی اور یہ دیکھ کر میں مبہوت رہ گئی کہ سلیم کل والے لباس میں کھڑا اطمینان سے پودوں کی تراش خراش میں مصروف ہے۔ اس کے ساتھ حویلی کا سب سے پرانا مالی بابا فخری بھی تھا۔ یوں لگ رہا تھا بابا اسے باغبانی کے گر سکھا رہا تھا۔ میں نے سکینہ سے کہا کہ بابا فخری کو بلاؤ۔ سکینہ کی آواز پر بابا بھاگتا ہوا آیا۔ مجھے کھڑکی میں کھڑے دیکھ کر اس نے جھک کر سلام کیا اور اپنے مخصوص انداز میں ناف پر ہاتھ رکھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا۔

"بابا یہ نیا مالی کون ہے؟"

بابا نے بتایا "بیگم جی! بڑا بھلا مانس لڑکا ہے۔ پندرہ بیس روز سے ڈیرے پر کام کر رہا تھا۔ گھوڑوں کو دانا چھانا ڈالتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ اپنے ساتھ مالی کے کام پر لگالو۔ میں نے کہا چلو۔ ہمت والا لڑکا ہے' ہاتھ بٹائے گا۔ بیگم جی' کل اس اکیلے نے پچھواڑے کی ساری گراونڈ کاٹی ہے۔ بیل کی طرح کام کرتا ہے جی........"

بابا فخری دیر تک سلیم کی تعریفیں کرتا رہا۔ سلیم ایک دوبار کن انکھیوں سے کھڑکی کی طرف دیکھ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میرے دل میں آئی کہ بابا فخری سے کہوں کہ اس لڑکے کو یہاں نہ لایا کرے لیکن پھر مختلف اندیشوں نے مجھے یہ بات کہنے سے روکے رکھا۔

اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے روز سلیم زنان خانے کے لان میں نظر آنے لگا۔ اس کا لباس ایک میلے سے دھوتی کرتے پر مشتمل تھا۔ ویسا ہی میلا سا صافہ اس کے گلے میں جھولتا رہتا۔ میں نے اس کے چہرے پر ہروقت گہری سنجیدگی طاری دیکھی۔ لگتا تھا وہ اپنے غضب کا آتش فشاں چھپائے پھر رہا ہے۔ میں حتی الامکان کوشش کرتی کہ اس کا

سامنا نہ ہو۔ ہاں کبھی کبھی کھڑکی یا دروازے کی اوٹ سے اس کا جائزہ لینے کی کوشش کرتی۔ ایک روز میں نے اسے لان کی گھاس کاٹتے دیکھا۔ دستی مشین وہ اتنی جھلاہٹ کے ساتھ دھکیل رہا تھا کہ اس کی آواز سن کر رب نواز اس کی طرف نکل آیا۔ اس نے سلیم کو ڈانٹ کر کہا۔

"تمہیں گھاس کاٹنے کا بھی ڈھنگ نہیں۔ زور لگا کر ولایتی مشین کا ستیاناس کر رہے ہو۔"

اتنے میں واصف بھی مردانے کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ آج تعطیل تھی اور وہ ابھی تک شب خوابی کے لباس میں تھے۔ "کیا بات ہے؟" انہوں نے رب نواز سے پوچھا؟

رب نواز نے وہی کہا جو ابھی سلیم سے کہا تھا۔ واصف نے بازپرس کے انداز میں سلیم سے کچھ کہا' جس کا جواب سلیم نے نجانے کیا دیا کہ واصف حسب عادت پھٹ پڑے۔ "الو کے پٹھے جواب دیتا ہے' آگے سے بحث کرتا ہے" ایک قدم بڑھ کر انہوں نے زور کا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ میں نے دیکھا سلیم کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ صافہ جو اس نے سر پر باندھ رکھا تھا کھل کر گھاس پر جاگرا۔ واصف بدستور گرج رہے تھے۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے' دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

اتنے میں بابا فخری ایک طرف سے بھاگتا ہوا آگیا اور واصف کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگا کہ ناسمجھ لڑکا ہے۔ اسے معاف کر دیں' پھر وہ سلیم کو ڈانٹتا پھٹکارتا باہر لے گیا۔

مجھے اس واقعہ سے دکھ ہوا کیونکہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا' مگر عجب طرح کی خوشی بھی ہوئی۔ خوشی اس بات کی تھی کہ شاید اب سلیم یہاں سے واپس چلا جائے۔ اس کی موجودگی مجھے ہروقت بے نام اندیشوں میں مبتلا رکھتی تھی۔ کبھی اس خیال سے دل میں ہول اٹھتا کہ سلیم' واصف کو کوئی نقصان نہ پہنچا جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتی کیونکہ میں حویلی میں اس کی موجودگی کے باوجود چپ تھی۔ پھر دل کہتا' نہیں سلیم ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ کبھی سوچتی کہ سلیم کا راز کھل گیا تو بات نہ جانے کہاں تک پہنچے۔ ایسی صورت میں سلیم کے ساتھ ساتھ میں بھی واصف کے عتاب کا

شکار ہوتی۔ کسی وقت میں یہ فیصلہ کرتی کہ اپنا اختیار استعمال کر کے سلیم کی یہاں سے چھٹی کروا دوں گی۔ تب مجھے اس کے عصیلے پن کا خیال آتا اور سوچتی نہ جانے وہ طیش میں کیا کرے۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد مجھے امید پیدا ہو چلی کہ سلیم یہاں سے چلا جائے گا۔

انہی دنوں میرے پہلے بچے کی پیدائش کا وقت قریب آگیا اور میں زچگی کے لئے ایک دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئی۔ ایک اسپیشلسٹ لیڈی ڈاکٹر ہر وقت میرے پاس رہتی تھی۔ اس نے مجھے بستر اور باتھ روم تک محدود کر چھوڑا تھا۔ ان دنوں حویلی میں کیا ہوتا رہا مجھے معلوم نہیں۔ یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ سلیم یہاں سے جا چکا ہے یا نہیں......
ایک تکلیف دہ رات کی صبح، میرے وجود کی وساطت سے ایک نیا وجود دنیا میں آیا۔ یہ میرا بیٹا فرحان تھا۔ جب اپنے پہلو میں میں نے اس کا ننھا سا وجود دیکھا اور اس کے ملائم ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھاما تو تحفظ اور اعتماد کے احساس سے روح سرشار ہو گئی۔ فخر و انبساط کی غیر مرئی لہروں نے جسم کے ریشے ریشے کو چھو لیا اور آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ یہ تشکر کے آنسو تھے۔ جو ایک ایسی بیوی کی آنکھ سے ٹپکے تھے جو آبلہ پا بھاگتی ہوئی "ماں" کی منزل تک پہنچی تھی۔ میں نے اپنے بچے کو پہلو سے لگا کر بھینچ لیا۔

فرحان کی پیدائش پر حویلی میں حسب رواج خوشی کا اظہار کیا گیا۔ دیگیں پکائی گئیں...... خیرات تقسیم ہوئی اور رقص و سرود کی محفلیں بھی جمیں لیکن خوشی و شادمانی کے ان تمام ہنگاموں میں کوئی چہرہ ایسا نہیں تھا جس کا تعلق میرے بیس سالہ ماضی سے ہو۔ سب چہرے اپنے تھے لیکن سب غیر تھے...... ہاں ایک چہرہ...... صرف ایک چہرہ ان میں مختلف تھا۔ چہروں کی اس تاریک بھیڑ میں وہ چہرہ کبھی کبھی روشن لکیر کی طرح چمک جاتا تھا۔ یہ سلیم کا چہرہ تھا۔ یہ چہرہ اس لئے مختلف تھا کہ اس پر نمائشی مسرت کی مٹھاس نہیں تھی۔ حقیقی اندوہ کی تلخی تھی۔ وہ اپنی تمام تر تلخی اور اسراریت کے ساتھ ابھی تک حویلی میں موجود تھا۔ پوری حویلی میں صرف میں جانتی تھی کہ وہ موجود ہے اور صرف وہ جانتا تھا کہ میں اس کی موجودگی سے آگاہ ہوں۔

بچے کی پیدائش کے بعد حالات قدرے تبدیل ہوئے۔ میری ساس نندوں کے رویئے میں مثبت تبدیلی آئی۔ نئے فرد کی آمد سے گھر میں رونق سی ہو گئی مگر واصف کا رویہ

جوں کا توں رہا۔ قدرت کا یہ خوبصورت انعام پا کر بھی اس نے کسی خاص مسرت کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس فرحان کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ناگواری کا ایک رنگ سا گزر جاتا تھا۔ شاید کسی اور نے محسوس نہ کیا ہو لیکن میں ایک ماں کا دل رکھتی تھی۔ اپنے بچے کی طرف اٹھنے والی مہربان اور نامہربان نگاہ کا فرق فوراً محسوس کر سکتی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ واصف کے انداز میں کیا بات ہے جو ایک مطمئن و مسرور باپ کے انداز میں نہیں ہونی چاہئے۔ اگر اس کو رنجشیں تھیں تو مجھ سے تھیں، یہ تو اس کا خون تھا۔ معصوم اور بے گناہ۔ وہ اس سے کھچا کھچا کیوں تھا؟ میرا سیدھا سادھا ذہن سیدھے سادے انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں ان اندیشوں سے قطعی بے خبر تھی جو عنقریب میری زندگی پر شب خون مارنے والے تھے۔

ایک دوپہر کی بات ہے، فرحان کو دودھ پلا کر اور سلا کر میں برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ موسم خوشگوار تھا۔ شمال سے چلنے والی مدھم ہوا نہ جانے کہاں سے گہرے سیاہ بادلوں کو لائی تھی۔ بارش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی مگر امید تھی کہ جلد ہی ہونے لگے گی۔ میں چہل قدمی کرتی برآمدے کے اس حصے میں چلی گئی جہاں دو اطراف جالی دار پودے لگا کے کوئی وی لاؤنج کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس جانب ایک کھڑکی بھی تھی۔ کھڑکی سے دیکھا تو سلیم لان کے باغیچے میں گھومتا نظر آیا۔ لباس حسب سابق تھا۔ پانی بھرے ہوئے ڈول اس کے قریب رکھے تھے۔ وہ کسی دہقان کی طرح بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ پودوں کو پانی دے یا نہ دے۔ اچانک میں نے اسے ٹھٹکتے دیکھا۔ اس کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔

میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ ایک فیشن ایبل عورت ایک ملازم کے ساتھ، جو شاید ڈرائیور تھا، پورچ سے انیکسی کی طرف جا رہی تھی۔ زاویہ ایسا تھا کہ میں شکل نہ دیکھ سکی۔ ہاں سلیم نے یقیناً اسے دیکھا تھا اور اسے دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر سامنے پودے کے پیچھے ہو گیا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ نہایت واضح طور پر نوٹ کیا۔ وہ اب بھی پودے کے عقب میں کھڑا تھا۔ میں اتنی دور سے اس کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن اس کی حرکات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ حیران سا ہے۔ جب تک وہ عورت انیکسی کے ایک دروازے سے اندر نہیں چلی گئی وہ وہیں کھڑا رہا پھر اس نے جلدی

جلدی دونوں ڈول گھاس میں اٹھائے اور انہیں ہاتھوں میں لٹکائے باہر نکل گیا۔

میں اپنی جگہ کھڑی سوچنے لگی یہ کون عورت ہے جس نے سلیم کو اس طرح چوری اور چھپنے پر مجبور کیا ہے۔ پہلا خیال تو یہ آیا کہ شاید یہ واصف کی کوئی ایسی مہمان ہے جس سے پہلے بھی سلیم کا آمنا سامنا ہو چکا ہے۔ وہ کسی تلخ تجربے کے سبب اس کے سامنے نہ آیا۔ مگر یہ خیال دل کو بھایا نہیں۔ ایک مالی اور واصف کی مہمان عورت کے درمیان کیا ربط ہو سکتا تھا۔ یقیناً یہ کوئی اور چکر تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی کی ٹوہ نہیں لگائی اور نہ دیواروں سے کان لگانے کی عادت رہی مگر اس روز اتفاقاً ایسی صورت حال پیدا ہو گئی کہ بہت سی باتیں جو مجھے نہ سننا چاہئیں تھیں میرے کانوں میں پڑ گئیں۔ میں دراصل اس عورت کی شکل دیکھنا چاہتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سٹنگ روم میں گئی ہے۔ سٹنگ روم کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم تھا بلکہ یہ دونوں ایک بڑے ہال کی صورت میں مشترک تھے۔ ڈائننگ روم کے ساتھ ہی کچن تھا' جس کا ایک دروازہ اور چھوٹی سی کھڑکی ڈائننگ روم میں کھلتی تھی۔ یہ کچن عام طور پر مقفل رہتا تھا کبھی کوئی خاص مہمان آتے اور ان کے لئے علیحدہ کھانا پکانا مقصود ہوتا تو یہ کچن کھولا جاتا۔ واصف کی الماری کے ایک خانے میں چابیوں کا ایک گچھا پڑا رہتا تھا' میرا خیال تھا کہ اس گچھے میں ایک چابی اس کچن کی بھی ہے۔ اس کچن میں داخل ہو کر سٹنگ روم میں دیکھنا چنداں مشکل نہیں تھا' بشرطیکہ سٹنگ روم اور ڈائننگ روم کو علیحدہ کرنے والا پردہ کھینچا نہ گیا ہو۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے چابیوں کا گچھا لیا اور ایک طویل راہداری سے ہوتی ہوئی انیکسی کی طرف آگئی۔ تھوڑی سی کوشش سے میں کچن میں داخل ہو گئی۔ اندر تاریکی تھی اور نشست گاہ کی طرف سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے دل نے ملامت کی کہ تم کیوں چوری چھپے یہاں چلی آئی ہوں۔ لیکن اس خیال نے سہارا دیا کہ اپنے ماحول سے آگاہی حاصل کرنا میرا حق ہے مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ اس حویلی میں میرے اردگرد کیا کچھ ہو رہا ہے۔ میں اب اکیلی نہیں ہوں میرے ساتھ میرا بچہ ہے۔ اس کی اور اپنی سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ میں اطراف سے باخبر رہوں۔

میں یہاں اس عورت کی شکل دیکھنے آئی تھی مگر اندر ہونے والی گفتگو نے میرے قدم پکڑ لئے۔ مجھے کھڑکی کی سلائیڈنگ ڈور کو ہلا کر نشست گاہ میں جھانکنے کی صورت

نہیں آئی کیونکہ تھوڑی سی کوشش سے میں عورت کی آواز پہچاننے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اسے پہچاننے کے ساتھ ہی میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ وہ فیشن ایبل فربہ اندام عورت' جسے میں نے ٹی وی لاؤنج کی کھڑکی سے دیکھا تھا........ فرخندہ کی پھوپھو نادرہ تھی........ پرنسپل نادرہ' جس کی گاڑی سلیم نے توڑی تھی اور آٹھ ماہ کے لئے جیل چلا گیا تھا۔

یہاں میرا رشتہ درحقیقت میڈم نادرہ ہی کی کوششوں سے ہوا تھا مگر شادی کے بعد جب ہم میاں بیوی میں تنازعہ پیدا ہوا تو میڈم نادرہ نے کسی قسم کا مصالحتی کردار ادا نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتی تو یقیناً مجھے خبر ہوتی لیکن اسے میں شادی کے بعد پہلی بار حویلی میں دیکھ رہی تھی اور وہ بھی واصف کے ساتھ تنہائی میں گفتگو کرتے ہوئے۔ اس نے مجھ سے ملنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی........ اندر ہونے والی گفتگو اہم مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ میڈم نادرہ کہہ رہی تھی۔

"چودھری صاحب' آفت لڑکا ہے جی آفت اچھی بھلی شریف گھرانے کی لڑکی کو ورغلا لیا۔ سب جانتے ہیں ثنا میں کوئی عیب نہیں۔ یہ وہی حرامزادہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔"

واصف کی آواز آئی "خالہ یہ تم اس لئے کہہ رہی ہو کہ تم نے یہ رشتہ کروایا ہے۔ ورنہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ میں کیسے مان لوں کہ جو لڑکی ہوٹلوں میں لڑکوں سے ملتی ہے وہ پاک صاف ہے۔"

میڈم نادرہ نے کہا "سلیم نام ہے اس کمبخت کا' ویگن بھی چلاتا رہا ہے۔ اس کے باپ کی دو تین ویگنیں ہیں۔ ایک نمبر کا آوارہ گرد ہے۔ بلکہ اب تو خطرناک غنڈہ بن چکا ہے۔"

"تم اسے کیسے جانتی ہو؟" واصف کی آواز آئی۔

میڈم نادرہ کی آواز آنے سے پہلے ایک چھوٹا سا وقفہ تھا۔ غالباً اس نے ایک گہری سانس لے کر خیالات مجتمع کئے تھے۔ اس کے بعد وہ واصف کو تفصیل سے سلیم کے متعلق بتانے لگی۔ میں اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ میڈم نادرہ کی آواز کسی مصور کے برش کی طرح دھیرے دھیرے میرے ذہن کے کینوس پر ایک تصویر مکمل

کر رہی تھی۔ واقعات کا تسلسل ایک مکمل کہانی کی صورت میں ڈھل رہا تھا۔ یہ تلخ کہانی کچھ اس طرح تھی۔

میڈم نادرہ کی گاڑی توڑنے کے واقعہ سے پہلے سلیم میڈم سے اس کے آفس میں ملا تھا۔ وہاں ان دونوں میں تلخ کلامی ہوئی تھی۔ سلیم نے اسے فتنہ پرور عورت قرار دیا تھا۔ جواب میں میڈم نادرہ نے اسے بے نقط سنائیں تھیں۔ سلیم نے غصے سے بپھر کر کہا تھا "ہاں میں کرتا ہوں پیار اس سے۔ میں دیکھتا ہوں مجھے اس کے ساتھ ملنے سے کون روکتا ہے۔ اسے ڈنکے کی چوٹ پر ملوں گا اور جو میرے رستے میں آئے گا اس سے بھی نپٹ لوں گا۔"

بات بڑھنے سے پہلے اسکول کے ملازمین نے اسے سمجھا بجھا کر دفتر سے نکال دیا تھا۔

درحقیقت سلیم اور پرنسپل نادرہ کی یہ پہلی ملاقات نہیں تھی۔ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ صورت احوال یہ تھی کہ میڈم نادرہ کا ایک ایسے شخص سے ملنا جلنا تھا جو سلیم کا کٹر دشمن تھا۔ یہ شخص قاسم اعوان تھا۔ قاسم اعوان اور اس کے بھائیوں کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔ یہ بہت کینہ پرور لوگ تھے۔ سلیم سے لڑائی کے بعد جب تھانے کچہری تک نوبت پہنچی تھی تو میڈم نادرہ نے اعوانوں کی حمایت میں بہت بھاگ دوڑ کی تھی.......... اس طرح میڈم اور سلیم میں رنجش چلی آرہی تھی۔ لہٰذا جب میڈم نادرہ کو پتہ چلا کہ ثنا سے یعنی مجھ سے آشنائی پیدا کرنے والا لڑکا یہی سلیم ہے تو وہ ضرورت سے زیادہ فعال ہوگئی۔ وہ قاسم اعوان سے مشورے کے بعد ہمارے گھر پہنچی اور امی جی اور بھائیوں کو اس بارے میں بڑھا چڑھا کر بتایا۔ بعد ازاں اسکول آفس میں اس کی سلیم سے تلخ کلامی ہوئی اور اس تلخ کلامی کے نتیجے میں وہ واقعہ پیش آیا جس میں جزوی طور پر میڈم نادرہ کی گاڑی تباہ ہوگئی اور اس کا ایک ملازم بے ہوش ہو کر ہسپتال جا پہنچا۔ اس جرم کی پاداش میں سلیم گرفتار ہو کر جیل چلا گیا لیکن میڈم نادرہ اور قاسم اعوان کے غصے کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے دیرینہ دشمن کو یادگار سبق سکھانا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرے گھر والے جلد سے جلد میری شادی کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ میڈم نادرہ میرے گھر والوں کی ہمدرد بن کر آگے آئی اور میرے لئے یہ جاگیردار گھرانہ ڈھونڈ نکالا۔ وہ اس خاندان کے اثر و رسوخ اور مزاج سے آگاہ تھی۔ اسے امید تھی

کہ اگر میری شادی یہاں ہوگئی تو سلیم جو میرے ساتھ جینے مرنے کی باتیں کر رہا ہے، بھیگی بلی کی طرح بیٹھ جائے گا اور اگر اس نے جوانی کے جوش میں کوئی دلیری دکھانے کی کوشش کی تو ایسی مصیبت میں پھنسے گا کہ کہیں کا نہ رہے گا۔

یہ اتفاق تھا کہ اب تک سب کچھ میڈم نادرہ کی منشا کے مطابق ہوا تھا۔ نہ صرف میری شادی یہاں ہوئی تھی بلکہ مجھ پر خاوند کے ظلم و ستم کا سن کر اور میری مشکلات سے آگاہ ہو کر وہ میرا خیرخواہ بن کر یہاں چلا آیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میڈم نادرہ کو ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا کہ سلیم حویلی پہنچ چکا ہے اور اس کی پلاننگ اس حد تک کامیاب ہو چکی ہے۔ وہ تو صرف واصف کو متوقع خطرے سے آگاہ کرنے آئی تھی۔ اس نے واصف سے کہا۔

"چودھری جی! وہ بڑا خطرناک لڑکا ہے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ حویلی کا رخ ضرور کرے گا۔ میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتی ہوں کہ ان دنوں اس کی طرف سے محتاط رہیں۔ وہ کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا۔ میں نے سنا ہے پچھلے دنوں اس نے ایک گن بھی خریدا ہے" میں اندر ہونے والی گفتگو میں اس بری طرح کھو چکی تھی کہ جب ہوا کے ایک جھونکے نے کچن کے بند دروازے میں ایک جھری کھولی تو مجھے بالکل پتہ نہ چلا۔ کچن کے ہمیشہ مقفل دروازے کو نیم وا دیکھ کر کوئی بھی شک میں پڑ سکتا تھا.......... میں اسی وقت چونکی جب واصف کا ایک کارندہ کندھے سے پستول لٹکائے دروازے میں کھڑا نظر آیا۔ دروازے سے داخل ہونے والی روشنی میں اس نے میرا چہرہ دیکھا اور حیرت سے کہا "بیگم جی آپ؟"

میں آنچل سنبھالتی پریشانی کے عالم میں باہر نکل آئی اور ہنسی قفل میں چابی تھما کر اس کمرے کی طرف مڑ گئی۔

میرا ذہن خدشوں اور وسوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جو کچھ میں نے نشست گاہ سے سنا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا، اب یہ دوسرا اندیشہ جان کو لگ گیا تھا کہ واصف کا ملازم اسے میری کچن میں موجودگی سے آگاہ کردے گا۔ واصف کے ملازم اس سے وفاداری ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے اور یہ تو اس کا خاص ملازم تھا۔ دوسری طرف میڈم نادرہ اور سلیم کے چہرے رہ رہ کر نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ذہن میں جیسے

تمہارے قدموں میں نچھاور کردوں گا۔"

میں خیالوں میں گم تھی' جب اچانک کمرے کی مشرقی کھڑکی کھلی اور سلیم دھڑم
اندر آگیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ اس نے اس طرح میری خوابگاہ میں گھسنے کی ہمت کی تھی
میں سرتاپا لرز کر جلدی سے کھڑی ہوگئی۔ دروازے کی چٹخنی میں نے پہلے ہی چڑھا رکھی تھی
کھڑکی کی کنڈی سلیم نے لگادی تھی۔ آج میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ میں نے چاہا
نتائج سے بے پرواہ ہو کر وہ کال بیل بجادوں جو واصف کے پلنگ کے ساتھ موجود تھی۔
پھر سلیم کی کرخت آواز نے میرے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روک لیا۔

اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے اور آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔
بولا "ثناء کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ میں آج کل میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا
سے آخری بات کرنے آیا ہوں۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے آنچل سینے پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

اس نے کہا "کیا تم نے آج آئینہ دیکھا ہے' نہیں دیکھا تو دیکھ لو۔ کل چودھری
تمہاری جو درگت بنائی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ کل تمہاری چیخیں لان تک پہنچ رہی
تھیں۔ نوکر چاکر کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے۔ کسی دن یہی نوکر چودھری کے حکم پر تمہاری
لاش کندھوں پر اٹھا کر قبرستان میں پھینک آئیں گے۔ کیوں اپنی جان کی دشمن ہو۔ چلو
میرے ساتھ میں تمہیں اس دلدل سے مکھن کے بال کی طرح نکال لے جاؤں گا' خدا
قسم چودھری کے یہ پالتو غنڈے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہم اتنی دور چلے جائیں گے
چودھری کا باپ بھی ہمارا پتہ نہ چلا سکے گا.......... چلو آؤ' ہمت کرو' اپنے لئے نہیں تو اپنے
بچے کے لئے سوچو۔"

میں نے غصے سے بے قابو ہو کر کہا "سلیم! میں تجھے آخری موقعہ دے رہی ہوں
جس راستے سے آیا ہے اسی سے نکل جا۔ میں زندگی کی آخری سانس تک تیری شکل دیکھ
نہیں چاہتی.......... چلا جا یہاں سے ورنہ خود بھی مرے گا اور مجھے بھی برباد کرے گا۔ تجھے
کچھ معلوم نہیں یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔"

سلیم بولا "میں صرف اتنا جانتا ہوں ثناء کہ میں تمہاری بہتری چاہتا ہوں۔"

میں بھڑک کر بولی "مجھے نہیں چاہیے تیری یہ خیر خواہی۔ میری بربادیوں کا ذمہ

تو ہے' صرف تو۔ یہاں سے چلا جا ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی.........."

میں محسوس کر رہی تھی کہ طیش میں میری آواز بلند ہوتی جا رہی ہے لیکن مجھے
اس کی بھی پرواہ نہیں رہی تھی۔ سلیم نے میرے بپھرے ہوئے تیور دیکھے تو ایک دم اس
کا چہرہ بجھ سا گیا۔ وہ کچھ دیر عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ ان نگاہوں میں حسرت
بھی تھی' شکوے بھی تھے' غصہ بھی تھا اور ایک بار پھر سوچ لینے کی دعوت بھی تھی' مگر
میں اپنے اٹل فیصلے کے ساتھ کھڑی اس کے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے پیشانی
کے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور عجب جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"اچھا.......... مرتی رہو یہاں" اور منہ پھیر کر کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ ایک نظر
باہر کا جائزہ لے کر وہ چوکھٹ پر چڑھا اور کود کر باہر نکل گیا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ
کر کھڑکی بند کردی اور فرحان کو سینے سے بھینچ کر رونے لگی "اچھا مرتی رہو یہاں" سلیم
کے یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور دل کہہ رہا تھا کہ یہ اس کے آخری الفاظ
ہیں اتنا درد کرب اور غصہ اس کے آخری الفاظ میں ہی ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے زندگی کے بھنور
سے نکالنے کی آخری کوشش کر چکا تھا اور اب ناکام واپس جا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ جیسے وہ
آج تک ایک بجی ہوئی شام کے اثر میں تھا۔ ریسٹورنٹ کے اس فیملی کیبن میں بیٹھا میرا
انتظار کر رہا تھا اور آج اس کی موہوم ترین امید بھی دم توڑ گئی تھی اور وہ ہونٹوں پر ایک
سوال لئے واپس چلا گیا تھا۔

.... یہ تیسری رات کا واقعہ تھا' دو ڈھائی کا وقت تھا۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔
شاید ماؤں کی آنکھ ایسے موقعوں پر کھل ہی جایا کرتی ہے۔ نو دس ماہ کا فرحان میرے پہلو
میں کلکاریاں مار رہا تھا۔ خوابگاہ میں ٹیبل لیمپ کی روشنی ایک محدود حصے میں پھیلی ہوئی
تھی۔ یہ لیمپ واصف کے سرہانے پڑا رہتا تھا۔ کبھی رات کو سگار کی طلب ہوتی تو وہ یہ
لیمپ جلا لیتا تھا۔

میں نے واصف کے پلنگ کی طرف دیکھا' مگر وہ وہاں نظر نہیں آیا۔ تب میری نگاہ
سامنے نیم تاریکی کی طرف اٹھ گئی.......... اور یکایک جیسے حسیات سمٹ کر آنکھوں میں
آگئیں۔ واصف.......... میرے پلنگ سے صرف دو گز کے فاصلے پر کھڑا عجیب نظروں سے
فرحان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شراب کے نشے میں مندھی ہوئی تھیں اور

چہرے پر سنسنی خیز تاثر تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا ایک بازو غیرارادی طور پر فرحان کے گرد لپٹ گیا۔ میرے ذہن کے نہاں خانوں سے ایک پرہول چیخ ابھری "ثناء اپنے بچے کو بچاؤ' ثناء اپنے بچے کو بچاؤ" میری آنکھیں واصف کے چہرے پر تھیں جو اب میرے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر فرحان کو گود میں چھپا لیا۔ وہ جو کلکاریاں مار رہا تھا اس اچانک جھٹکے سے سہم کر رونے لگا۔ واصف کی شیطانی سرگوشی کمرے میں گونجی' اس کی سانسوں سے الکحل کے بھبکے اٹھ رہے تھے "میں اس کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں تیرے اس حرامی بچے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا" میں جیسے اچانک ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تھی۔ دفعتاً وہ کسی درندے کی طرح فرحان پر جھپٹا۔ میں نے پہلو بچایا اور جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"خدا کے لئے واصف۔ ہوش کرو' یہ کیا کر رہے ہو تم؟"

"بکواس بند کر کتیا" وہ دانت پیس کر غرایا "میں گناہ کی اس نشانی کو ختم کر دوں گا۔ اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹوں گا..........چھوڑ دے اسے۔"

میں نے گڑگڑاتے ہوئے واصف کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے "تمہیں خدا رسولؐ کا واسطہ واصف۔ میرے بچے کو کچھ نہ کہو۔ یہ ہم دونوں کا بچہ ہے۔ ہمارا خون ہے" ایک زوردار تھپڑ میرے رخسار پر پڑا اور میں بچے سمیت فرش پر گر گئی۔ واصف مجھ پر جھپٹا میں نے دوبارہ کروٹ بدل کر بچے کو بچایا۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولا "ثناء میں کہتا ہوں چھوڑ دے اس بچے کو' ورنہ برا حشر کروں گا۔"

پہلی بار واصف کے خوفناک لہجے نے میرے جسم پر کپکپی طاری نہیں کی۔ میں نے بچے کو بازوؤں میں چھپایا اور دروازے کی طرف لپکی۔ مگر دروازہ بند تھا اور میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے کھول کر باہر نکل جاؤں۔ واصف نے پھر پیچھے سے آکر مجھے چھاپ لیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال جکڑ لئے اور دوسرے سے فرحان کو چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ جیسے ہوش سے بیگانہ ہو رہا تھا۔ میری اور فرحان کی چیخوں نے خوابگاہ میں کہرام مچا رکھا تھا مگر باہر موجود مسلح محافظ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ کسی کو حرکت کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی ایسی چیخ و پکار تو اس کمرے سے بلند ہوتی رہتی تھی۔ میری ہتھیلیوں کی طرح شاید یہاں کے ملازمین کے ذہنوں پر بھی سیاہ داغ پڑ چکے تھے۔ یا ان کی

سماعت پر مہریں لگ چکی تھیں..........کمرے سے باہر خاموشی تھی اور اندر ایک ماں اپنے بچے کی بقاء کی جنگ لڑ رہی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھی..........یکسر اکیلی۔

لیکن نہیں..........دفعتاً میرے حلق سے چیخ نکلی "سلیم..........سلیم..........بچاؤ" میں جانتی تھی میری یہ صدا' لاحاصل ہے کیونکہ سلیم یہاں سے جا چکا ہے لیکن فرض محال اگر وہ یہاں تھا بھی تو اس کے کوارٹر تک یہ چیخ کیونکر پہنچ سکتی تھی۔ پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر میں پھر بھی اس کا نام پکار رہی تھی کیونکہ اس نام کے شخص کے سوا یہاں کوئی میرا غمگسار نہ تھا..........اچانک واصف نے مجھے چھوڑا اور لپک کر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے پستول نکال لیا۔ پھر اس نے میری گود میں روتے بلکتے فرحان کو بے دریغ نشانہ بنانا چاہا مگر گولی میرے کندھے میں لگی۔ وہ جھلا کر ایک بار پھر مجھ پر پل پڑا۔ گولی لگنے کے بعد میری قوت مزاحمت یکدم کمزور پڑ گئی لیکن میں صرف ایک عورت ہی نہیں تھی' ایک ماں بھی تھی اور ماں بہت سخت جان ہوتی ہے۔ میں نے فرحان کو اپنی بانہوں میں اس طرح سمیٹا تھا کہ وہ میرے ہی جسم کا ایک حصہ بن گیا تھا' میری ہی جان سے پیوست ہو گیا تھا' جیسے وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا' جیسے وہ میں تھی۔ اور میں وہ تھا۔

زندگی و موت کی اس کشمکش کے دوران اچانک مجھے اپنی بائیں جانب ایک کڑاکا سنائی دیا۔ مشرقی دیوار کی کھڑکی زور سے ہلی' پھر ویسا ہی دوسرا کڑاکا ہوا اور چوبی کھڑکی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر کمرے میں آن گری۔ میں نے سلیم کو دیکھا وہ کھڑکی سے اندر آ رہا تھا (یہ چوبی کھڑکی سلیم نے اپنے سر کی ضربوں سے توڑی تھی) میں ڈوبتی ہوئی آواز میں چیخی۔

"سلیم..........سلیم۔ اس موذی کو جان سے مار دو' قتل کر دو اسے......" سلیم تند بگولے کی طرح واصف کی طرف لپکا اور اسے بالوں سے پکڑ کر میرے اوپر سے کھینچ لیا۔ مجھ سے ہاتھا پائی کے دوران واصف کا پستول ٹیبل لیمپ کے پاس گر چکا تھا۔ اس نے لپک کر وہ پستول اٹھانا چاہا مگر میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے اسے پلنگ کے نیچے دھکیل دیا۔ اسی دوران سلیم کے ہاتھ میں پکڑے پسٹل نے دھماکے سے شعلہ اگلا اور واصف جو اپنے پستول پر جھپٹ رہا تھا لڑکھڑا کر ٹیبل لیمپ پر گرا۔ کمرے میں یکلخت گہری تاریکی پھیل گئی۔ فائرنگ کی آواز سن کر باہر کھڑے پہریدار خاموش نہیں رہ سکتے تھے اس لئے اب وہ

"چودھری صاحب......چودھری صاحب" کی آوازیں دے رہے تھے اور دروازہ توڑنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

سلیم مجھے اور فرحان کو لے کر کھڑکی کے راستے باہر نکل آیا۔ ابھی ہم کھڑکی کے سامنے کھڑے تھے کہ بائیں جانب تاریکی سے واصف کا ایک آدمی رائفل تانے سامنے آگیا۔ شاید دروازے سے مایوس ہو کر وہ کھڑکی پر زور آزمائی کرنے آیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ اس نے چلانے کی لئے منہ کھولا مگر اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے آواز نکلتی سلیم کے سر کی نہایت زوردار ضرب اس کی پیشانی پر پڑی۔ مجھے یاد ہے وہ چکرا کر گرا تھا اور گرتے ہوئے اس کا سر پختہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہ سب کچھ اسے بے ہوش کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس دوران کمرے کا دروازہ ٹوٹ گیا اور رب نواز "ایم جی" سنبھالے اندر گھس آیا۔ اس کی نظر کھلی کھڑکی میں کھڑے سلیم پر پڑی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے پہچان کر فائر کرتا۔ سلیم کے پستول نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے۔ میں نے رب نواز کو پیٹ پکڑ کر لڑکھڑاتے دیکھا' پھر اس کی رائفل فرش پر گرنے کی آواز آئی۔ سلیم نے فرحان کو مجھ سے چھینا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مخالف سمت میں بھاگا۔ رکھوالی کرنے والے دو جسیم تازی کتے ایک جانب سے نکل کر ہم پر جھپٹے۔ سلیم پر جیسے وحشت سوار ہو چکی تھی۔ اس نے مڑ کر یکے بعد دیگرے تین فائر کئے اور کتوں کی غراہٹیں لرزہ خیز دھماکوں میں دم توڑ گئیں۔ اب ہم احاطے کے مشرقی کونے میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں نیم کے گھنے پیڑوں تلے واصف کی جیپ کھڑی تھی۔ حویلی کے شمالی حصے سے بھاگو دوڑو کی آوازیں آرہی تھیں۔ جیپ کا ڈرائیور جو جیپ کے قریب ہی چارپائی ڈالے لیٹا تھا' شور سے بیدار ہو گیا تھا اور اب آنکھیں ملتا ہماری طرف بھاگا آرہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے سلیم سے پوچھا۔

نہ جانے سلیم نے ایسی صورت حال کے لئے پہلے سے سوچ بچار کر رکھی تھی یا اس کے ذہن نے فوری طور پر کام کیا وہ بولا "خان محمد! جلدی کرو' جیپ نکالو۔ زمیندار شباب کے آدمیوں نے حملہ کر دیا ہے۔ چودھری جی مارے گئے ہیں۔ وہ بیگم جی اور بچے کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ان دنوں ایک قریبی زمیندار شباب کے کچھ خطرناک پالتو آدمی جیل سے مفرور

تھے اور حویلی میں خطرہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وہ پرانی دشمنی چکانے کے لئے چودھری صاحب کے گھرانے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ڈرائیور نے نیم غنودگی اور نیم بیداری کے عالم میں جو زمیندار شباب کا نام سنا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ ہم سے بھی پہلے جیپ میں آبیٹھا فوراً انجن اسٹارٹ کر دیا۔ سلیم نے مجھے اور فرحان کو پیچھے بٹھایا اور خود ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ جیپ طوفانی رفتار سے حویلی کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھی۔ گیٹ پر موجود مسلح پہریدار بھی رہائشی حصے میں فائرنگ کی آوازیں سن چکے تھے۔ جیپ کو دیکھ کر وہ اس کے سامنے آگئے۔ ڈرائیور کڑک کر بولا "تم یہاں کھڑے ہو۔ ادھر شباب کے آدمیوں نے حملہ کر کے چودھری صاحب کو مار ڈالا ہے" دونوں پہریدار رائفلیں تھامے بگٹٹ رہائشی حصے کی طرف بھاگے اس دوران سلیم اتر کر گیٹ کھول چکا تھا۔ جیپ گیٹ سے نکلی اور ہمیں لے کر آندھی کی طرح بڑی سڑک کی طرف بڑھنے لگی۔

بڑی سڑک پر پہنچنے سے پہلے ہی سلیم نے ڈرائیور سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ ویسے بھی اب وہ خوف اور غنودگی کے اثر سے نکل کر سوچ بچار میں مصروف ہو گیا تھا۔ ہم اس کی نظروں میں عنقریب مشکوک ٹھہرنے والے تھے۔ سلیم نے اسے ایک جگہ جیپ روکنے کو کہا اس نے جیپ روکی تو سلیم نے پستول سے پورے زور سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن نڈھال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ سلیم اسے اٹھا کر درختوں میں لے گیا اور اس کی شلوار کے آزار بند سے اس کی مشکیں کس کر واپس آگیا۔ یہاں ہم نے اپنی حالت کا بھی جائزہ لیا۔ گولی میرے کندھے کا گوشت چیرتی ہوئی گزر گئی تھی زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ سلیم نے اپنا صافہ پھاڑ کر پٹی باندھی جس سے خون کا اخراج کم ہو گیا میری قمیض جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ ڈرائیور کی ایک گرم چادر جو ڈیش بورڈ کے ایک خانے میں پڑی تھی' دیہاتی عورتوں کے انداز میں جسم اور سر پر لپیٹ لی۔ ننھے فرحان کی حالت بھی قابل ترس تھی۔ غضبناک باپ کے ہاتھوں معصوم بیٹے کے کپڑے بھی سلامت نہیں رہے تھے۔ اس کے فراک کی ایک آستین غائب تھی۔ گریبان دھجیوں کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس کی کنپٹی کا جوڑ اکھڑ گیا تھا۔ میں نے اسے بھی اپنی چادر میں چھپا لیا۔ ہوا تک ٹھیک تھا لے۔

30168

میں کافی خنکی تھی اور اوس سے ہمارے جسم بھیگ رہے تھے۔ ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ اس روز حویلی میں جیپ کے علاوہ اور کوئی گاڑی موجود نہیں تھی ورنہ ہم اپنا تعاقب کرنے والوں کو جل دے کر اتنی دور تک نہ آسکتے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کدھر کا رخ اختیار کیا جائے۔ اس پورے علاقے میں جاگیرداروں کا تسلط تھا اور یہاں محفوظ پناہ گاہ تلاش کرنا بیوقوفی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ ہم کسی طرح یہاں سے نکل کر جھنگ پہنچ جائیں اور وہاں رکے بغیر فیصل آباد کا رخ کرلیں۔ جیپ میں اتنا پٹرول موجود تھا کہ ہم جھنگ تک پہنچ سکتے تھے۔ جھنگ کے مضافات میں کسی ویران جگہ جیپ چھوڑ کر ہم بس پر سوار ہوسکتے تھے......... حتمی فیصلہ کرنے کے بعد سلیم تیز رفتاری سے اونچے نیچے راستوں پر آگے بڑھنے لگا۔

اس وقت ہم جھنگ سے کوئی پندرہ میل دور ایک دشوار گزار راستے سے گزر رہے تھے جب اچانک جیپ کا انجن بند ہوگیا۔ سلیم نے نیچے اتر کر کل پرزے چیک کئے بہت دیر تک سیلف مارتا رہا مگر گاڑی سٹارٹ نہیں ہوئی۔ یہ ایک تشویشناک صورت حال تھی۔ جاگیرداروں کے آدمی کسی بھی وقت ہماری بو سونگھتے ہوئے پہنچ سکتے تھے۔ اس وقت سلیم پر انکشاف ہوا کہ کسی وجہ سے انجن کا سارا موبل آئل ضائع ہوگیا ہے اور انجن سیل ہوچکا ہے اب جیپ چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم نے کچھ ضروری چیزیں جن میں ایک ٹارچ بھی شامل تھی جیپ سے نکال لیں اور گھنے درختوں میں پیدل ہی آگے بڑھنے لگے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ جھاڑیوں میں سرسراہٹ سنائی دی۔ جیسے کوئی جانور یا انسان ایک دم بدک کر بھاگا ہو۔ ہم دونوں ٹھٹھک گئے۔ سلیم نے اپنی ڈب میں سے پستول نکالا اور آواز کے پیچھے لپکا۔ تاریکی گہری تھی مگر بھاگنے والے کے قدموں کی آواز اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ جلد ہی اس نے اسے جالیا۔ میں بھی تیزی سے سلیم کے پیچھے آرہی تھی۔ جھاڑی سے ایک ڈری ہوئی نسوانی آواز آئی۔

"خدا کے لئے مجھے معاف کردو۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ مجھے گھر جانے دو۔"

بولنے والی کے لہجے میں ایسی فریاد تھی کہ میں کانپ اٹھی۔ قریب جا کر دیکھا تو ٹارچ کی روشنی میں ایک عورت کانٹے دار شاخوں میں الجھی پڑی تھی اور اس نے سلیم کے سامنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ عورت کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ ۔ن سے

وصورت عام اور لباس پھٹا پرانا تھا۔ سردی اور خوف سے وہ بے حال تھی۔ عورت دوسری عورت کا دکھ بہت جلد سمجھ لیتی ہے۔ اس عورت کو دیکھتے ہی میرا پورا جسم سنسنا اٹھا۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ اس بدنصیب کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے کسی مرد کی طرف سے نہایت ناروا سلوک ہوچکا ہے۔ اس کی میلی آنکھوں کے آنسو چیخ چیخ کر اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ سلیم کو دیکھ کر ڈر گئی تھی لیکن جب اس نے سلیم کے عقب میں مجھے اور میری گود میں بچہ دیکھا تو اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پوچھنے لگی "کون لوگ ہو تم؟"

سلیم نے کہا "یہی سوال ہم تم سے پوچھ سکتے ہیں۔"

وہ بولی "کسی کے گھر مہمان آئے ہو؟"

سلیم نے کہا "مسافر ہیں۔"

اس نے ایک نظر سلیم کے تومند جسم کو دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "ویرا۔ مجھ پر ایک احسان کر۔ مجھے کسی طرح میرے گھر تک پہنچا دے"

اس وقت میری اور سلیم کی نگاہیں بیک وقت عورت کے پاؤں کی طرف جھک گئیں اور پہلی بار ہمیں معلوم ہوا کہ اس کا ایک پیر شدید زخمی ہے۔ سلیم نے ٹارچ کی روشنی پیر پر مرکوز کی۔ وہ بری طرح سوجا ہوا تھا اور ٹخنے کے قریب گہرا زخم نظر آرہا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سسکی روکی اور بولی "کچھ نہ پوچھ بہن۔ کچھ نہ پوچھ۔ زندگی تھی جو بچ گئی ہوں۔ بس تم دونوں اتنا احسان کرو کہ مجھے کسی طرح گھر تک پہنچا دو۔"

عجب صورت حال تھی۔ ہم خود مصیبت کے مارے تھے اور وہ ہم سے مدد طلب کر رہی تھی۔ اس کا ہمارے راستے میں آنا بھی نہایت ڈرامائی تھا۔ شاید رات کی تاریکی ہوتی ہی ایسی کہانیوں کو جنم دینے کے لئے ہے۔ سلیم نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے آگے بڑھ کر عورت کو سہارا دیا۔ دوسری طرف سے سلیم نے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ اپنے مفلوج پاؤں کو گھسیٹتی ہوئی ہمارے ساتھ چلنے لگی۔ ہر قدم پر اس کے ہونٹوں سے کراہ نکل جاتی تھی کوئی سو گز درختوں میں چلنے کے بعد کچے پکے مکانوں کے آثار نظر آئے۔ ایک نالے کے کنارے یہ ایک کافی بڑا گاؤں تھا۔ ابھی تک ہم راستے کی تمام

آبادیوں سے بچ کر نکلے تھے۔ حویلی سے فرار ہونے کے بعد پہلا موقعہ تھا کہ ہم کسی گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا۔ ہمیں اس وقت پناہ کی شدید ضرورت تھی اور اس عورت کا گھر ہماری وقتی پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر سوچتی رہی۔ آخر یہی بات میری زبان پر آ گئی۔ میں نے چلتے چلتے کہا۔

"بہن! میرا بچہ بیمار ہے۔ ہماری گاڑی راستے میں خراب ہو گئی ہے۔ صبح تک کے لئے ہمیں چھت کی ضرورت ہے۔"

میرے سوال پر عورت نے رک کر مشکوک نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا۔ وہ کچھ بولی نہیں........اور خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتی رہی۔ اس کی خاموشی نے جیسے ہمارے اوپر گھڑوں پانی ڈال دیا تھا۔ دل ایک دم کانپ سا گیا۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ اپنے گھر کے دروازے کے سامنے پہنچ کر عورت اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی۔ اس نے لکڑی کا لٹو گھما کر دروازہ کھولا اور بغیر کچھ کہے اندر داخل ہو گئی۔ اندر سے زنجیر چڑھنے کی آواز آئی اور ہم دونوں سمجھ گئے کہ ہماری "درخواست" کے سلسلے میں عورت کا جواب کیا ہے۔ بوجھل قدموں سے ہم واپس مڑے تو ایک قریبی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہی عورت مٹی کا دیا لئے سامنے کھڑی تھی۔ سرگوشی میں بولی "بہن اندر آجاؤ" اب میں نے دیکھا کہ یہ دوسرا دروازہ بھی اسی مکان کا تھا۔ شاید یہ بیٹھک قسم کا کوئی کمرہ تھا۔ میں اور سلیم جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ کمرے میں دو جھلنگا چارپائیوں اور ٹوٹے ہوئے موڑھوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ مٹی سے پوتی ہوئی الماریاں برتنوں سے خالی تھیں اور اناج رکھنے والی مٹی کی بڑی سی ناند میں خاک اڑ رہی تھی۔ ہمارے اندر داخل ہوتے ہی عورت نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ دیئے کی روشنی میں میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر نیلگوں خراشیں تھیں اور لباس بھی ادھڑا پھٹا ہوا تھا۔ اس کا سارا وجود ابھی تک کانپ رہا تھا۔ سرگوشی میں بولی۔

"ساتھ والے کمرے میں میرے بچے سو رہے ہیں۔ اونچی آواز میں نہ بولنا۔ میں ابھی آتی ہوں" میری گرم چادر کے نیچے فرحان پھر کسمسانے اور "ریں ریں" کرنے لگا تھا۔ اس کے بازو کی چوٹ اسے بے چین کر رہی تھی۔ عورت لنگڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس کی واپسی کوئی پانچ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کھدر کی ایک بڑی سی پٹی تھی۔

کچھ روئی تھی جسے وہ نمک اور ہلدی میں سینک کر لائی تھی۔ اس کے علاوہ ایک پیالے میں اپلوں کی راکھ اور اس میں ایک پوٹلی رکھی تھی۔ اس نے میرے قیمتی لباس پر اچٹتی سی نظر ڈال کر کہا۔

"بی بی جی' آپ کا کندھا سخت زخمی ہے۔ آپ کے بچے کا ایک بازو بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں آپ دونوں کو پٹی کر دوں......"

میں حیرانی سے عورت کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت ہوشیار اور تیز نظر تھی۔ ہمارے کچھ بتائے بغیر ہی کافی کچھ جان گئی تھی۔ غالباً اسے یہ بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ ہم کہیں سے بھاگے ہوئے ہیں اور ہمارے پیچھے کچھ لوگ ہیں۔ اس نے بڑی احتیاط سے گرم چادر میرے جسم سے علیحدہ کی اور میرا کندھا دیکھنے لگی۔ اس وقت میری نگاہ اپنی گرم چادر پر پڑی اس پر خون کا چھوٹا سا دھبا نظر آ رہا تھا۔ شاید اس دھبے کی وجہ سے عورت کو میرے زخمی ہونے کا علم ہوا تھا۔ مگر اس نے فرحان کے زخمی ہونے کا جو قیافہ لگایا تھا وہ واقعی اس کے ذہین ہونے کا ثبوت تھا۔ اس نے احتیاط سے میری پٹی کھولی اور ماہر جراح کی طرح زخم دیکھنے لگی۔ پھر اس نے پوٹلی میں سے ایک خاکستری سفوف نکالا اور زخم پر اچھی طرح لگا کر اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی بڑے اعتماد سے بولی۔

"اب آپ کا خون رک جائے گا۔ چودھرانی جی۔"

"چودھرانی جی" کے الفاظ میرے اور سلیم کے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہوئے۔ ہم دونوں حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ بولی "حیران نہ ہوں جی۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ میرا نام زینب ہے۔ میں پچھلی گرمیوں میں آپ کی بڑی جٹھانی فاطمہ بی بی کے پاس گئی تھی۔ ان سے زکوۃ کے پیسے لینے کے لئے۔ وہیں پر آپ کو دیکھا تھا۔ اس وقت آپ کا یہ بچہ گود میں نہیں آیا تھا۔"

میری رگوں میں خون کی گردش تھمنے لگی۔ ہم نے پناہ ڈھونڈی بھی تو کہاں۔ زینب نامی یہ عورت میرے بارے سب کچھ جانتی تھی.........میری پٹی کرنے کے بعد اب وہ بڑی احتیاط سے فرحان کی کہنی کا جوڑ دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ وہ جراحی کا کام جانتی ہے۔ ہمارے کچھ پوچھے بغیر وہ بولنے لگی۔

"چودھرانی جی.........اللہ بخشے میرا شوہر دین محمد بڑا اچھا جراح تھا۔ اس سے یہ

کسب میرے ہاتھ آیا۔ اب تو یہی اوڑھنا بچھونا ہے۔ تھوڑی بہت حکیم گیری بھی کر لیتی ہوں۔ یہ موت جوگا ڈاکٹر گاؤں میں نہ آتا تو آنا دال چل ہی رہا تھا۔ اب تو کئی کئی روز گھر میں چولہا نہیں جلتا۔ اللہ کرے کسی کی آئی اس کو آئے۔ میرے بچوں کی تو روٹی چھین لی ہے اس نے۔ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ وہ فرحان کے بازو کی مالش بھی کرتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے ایک مخصوص جھٹکا دیا۔ فرحان ذرا سا مچلا۔ زینب نے فوراً روئی رکھ کر پٹی باندھنی شروع کر دی۔

"بس جی۔ بالکل ٹھیک ہو گیا کاکا.........ہڈی کو کچھ نہیں ہوا۔ صرف جوڑ ہل گیا تھا" اچھی طرح پٹی کرنے کے بعد اس نے پوٹلی میں سے افیم کی ایک ڈلی نکالی اور تھوڑی سی توڑ کر مجھے دیتی ہوئی بولی "کاکے کو کھلا دیں صبح تک آرام سے سویا رہے گا۔ درد بھی نہیں مانے گا" زینب کی ہدایات پر عمل کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے فرحان کو افیم کی ڈوز دے دی۔ وہ ساتھ والے کمرے سے ایک بوسیدہ لحاف لائی اور چارپائی پر ڈال دیا' بولی "اب آپ دونوں آرام کریں۔ میں اپنے موت جوگے پیر کی بھی خبر لے لوں" لگتا تھا موت جوگا اس کا تکیہ کلام ہے۔ وہ اٹھی اور لنگڑاتی ہوئی بغلی دروازے کی طرف بڑھی۔ محسوس ہوتا تھا وہ اپنے ساتھ کچھ دیر پہلے پیش آنے والے حادثے کو بالکل فراموش کر چکی ہے۔ عجیب عورت تھی وہ۔ سلیم کی آنکھوں میں اس کی طرف سے شکوک تھے۔ میں خود بھی تذبذب میں تھی اس چالاک عورت پر قطعی بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ جاگیردار گھرانے سے واقف تھی تو ہمیں پناہ دینے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ اس کے لئے بہتر یہی تھا کہ فوراً کسی ذمے دار شخص یعنی گاؤں کی چودھری یا نمبردار وغیرہ کو ہماری موجودگی سے باخبر کرے اور اپنے پر آنے والی مصیبت ٹالے۔ اس صورت میں ہو سکتا تھا اسے کچھ انعام وغیرہ بھی مل جاتا.........وہ دروازے سے نکلنے لگی تو میں نے آہستگی سے کہا۔

"زینب ٹھہرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔"

اس نے میری بات کا دوسرا مطلب لیا اور بولی "بہت شرمندہ ہوں۔ گھر میں صرف دو ہی لحاف تھے۔ دوسرا میرے بچوں پر ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں تھوڑی رات رہ گئی ہے۔ میں لحاف کے بغیر بھی گزارا

کر سکتی ہوں۔"

وہ مجھے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں آئی۔ یہاں چار بچے ایک ہی لحاف میں سوئے ہوئے تھے۔ دیئے کی مدھم روشنی میں ان کے چہرے کچھ اور بھی مدقوق اور زرد نظر آتے تھے۔ بڑی بچی کی عمر کوئی آٹھ سال اور سب سے چھوٹے لڑکے کی عمر ڈیڑھ دو سال تھی بچوں پر طائرانہ نگاہ ڈالتی ہوئی میں زینب کے ساتھ ایک چھوٹے سے کوٹھے میں آ گئی۔ یہ کوٹھا (ڈھارا) باورچی خانے' اسٹور اور شاید کبھی کبھار بیڈ روم کا کام بھی دیتا تھا۔

زینب نے چولہے میں اپلوں کی آگ جلائی مجھے بیٹھنے کے لئے لکڑی کی چوکی دی اور خود بھی ایک ایسی ہی چوکی پر بیٹھ گئی اور اپنے زخمی پاؤں کو حرارت پہنچانے لگی غالباً اسے شدید قسم کی موچ آئی تھی اور سردی کی وجہ سے پاؤں بالکل اکڑ گیا تھا۔ اس نے پوٹلی میں سے ایک تیل نکالا اور خود ہی پاؤں کے علاج معالجے میں مصروف ہو گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ پاؤں پر پٹی کر چکی تو میں نے پوچھا "زینب کچھ بتاؤ گی نہیں۔ کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟"

میرے سوال نے اسے ایکا ایکی پھر غم و اندوہ کے گرداب میں دھکیل دیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اب تک خود پر بمشکل قابو پائے ہوئے تھی اور میرے سوال نے اس کے ضبط کے تمام بند توڑ دیئے ہیں۔ وہ گھٹنوں میں سر دے کر سسکنے لگی۔ کافی دیر رو چکی تو اپنی بپتا سنانے لگی۔ اس کی روئیداد کا خلاصہ یہ ہے۔

"شوہر کی موت کے بعد اس کی معاشی حالت بہت خراب تھی اور پچھلے ماہ سے تو گھر میں مسلسل فاقے گزر رہے تھے۔ اس نے اپنے بچوں میں زندگی کی حرارت برقرار رکھنے کے لئے بہت جتن کئے۔ مزدوریاں کیں' ہاتھ پھیلائے' خیرات مانگی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ہوس پرستوں کی بھوکی نگاہیں اس کے جسم پر پڑنے لگیں۔ لوگ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے پستیوں کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرنے لگے.........اور آخر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔ ایک ٹھٹھری ہوئی بے مہر شام کو زینب نے روٹی کے چند ٹکڑوں کے لئے اپنا آپ بیچ دیا۔ اس کی مجبوری خریدنے والے شخص کا نام جان محمد تھا۔ یہ شخص فارسٹ گارڈ تھا اور کسی نزدیکی گاؤں میں رہتا تھا۔ زینب ایک نالے کے کنارے' گھنے درختوں میں تین چار بار اس سے مل چکی تھی.........لیکن

آج وہ گئی تو روٹی کے ٹکڑوں کی بجائے اس کے حصے میں صرف ذلت اور زخم آئے۔ جان محمد اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تین چار آدمی اور تھے۔ ان کے تیور دیکھ کر زینب وہاں سے بھاگی۔ وہ خبیث اس کے پیچھے لپکے۔ زینب کا پاؤں ایک گڑھے میں گیا اور وہ چوٹ کھا کر گر پڑی۔ ان افراد نے شیطانیت کا ثبوت دیا.........اور اسے زخمی حالت میں چھوڑ گئے۔ سفاکی ملاحظہ ہو کہ زینب کے جسم پر ایک گرم چادر تھی۔ یہ چادر وہ پڑوسن سے مانگ کر لے گئی تھی۔ انہوں نے یہ چادر بھی چھین لی۔ وہ لٹی پٹی ان درختوں میں پڑی تھی جب میں اور سلیم وہاں پہنچے۔ وہ سمجھی اسے نوچنے کھسوٹنے والے پھر آگئے ہیں۔ وہ جان بچانے کے لئے درختوں میں بھاگ نکلی۔

زینب کی روئیداد سن کر میری آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ اولاد کی بھوک ماں کو کہاں تک لے جاتی ہے۔ یہ کوئی عورت ہی جان سکتی ہے۔ میں بھی چند گھنٹے پہلے اولاد کی خاطر ایک قیامت اپنے اوپر جھیل چکی تھی۔ ایک طرح ہم دونوں کا دکھ مشترک تھا۔ پچھلی رات کی ٹھٹھری ہوئی سردی میں اس چولہے کے سامنے بیٹھ کر میرے اور زینب کے درمیان تادیر گفتگو ہوئی۔ میں یہ جان کر حیران رہ گئی کہ زینب میرے بتائے بغیر ہی میرے بارے میں سب کچھ سمجھ رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ میں جاگیردار کے ظلم سے گھبرا کر اس کی حویلی چھوڑ آئی ہوں اور میرا ساتھی میرا میکے سے تعلق رکھنے والا کوئی ہمدرد ہے۔ وہ معاملہ فہم عورت تھی۔ اس نے کہا "چھوٹی چودھرانی جی! آخر یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ اگر نہ ہوتا تو آپ بھی نہ ہوتیں۔ وہ عورت خور حویلی ہے۔ آپ جیسی نہ جانے کتنی چودھرانیاں اس مقبرے میں دفن ہو چکی ہیں۔ میرا دادا بتایا کرتا تھا......"

اچانک گلی سے کچھ آوازیں آئیں اور زینب ٹھٹھک کر خاموش ہو گئی۔ میں نے بھی غور سے سنا۔ یوں محسوس ہوا جیسے دس پندرہ گھڑ سوار بھاگتے گلی سے گزرے ہوں۔ زینب نے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک لکڑی ٹیکتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ اب صبح ہونے والی تھی اور رات کی سیاہی میں دن کا اجالا جھلکنے لگا تھا۔ زینب بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی تو میں بھاگتی ہوئی سلیم کے پاس پہنچی۔ لحاف اس کے کندھوں پر تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا باہر سے آنے والی آوازوں پر غور کر رہا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ گھڑ سوار گلی میں ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ مختلف گھروں کے دروازے بھی کھٹکھٹائے جا رہے تھے۔ گاہے گاہے کوئی اونچی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ میرا خون رگوں میں جمنے لگا۔ آثار اچھے نہیں تھے۔ میں نے سلیم سے کہا۔

"زینب باہر جا چکی ہے۔ کہیں وہ کوئی.........گڑبڑ نہ کر دے۔"

سلیم نے کمرے سے نکل کر باہر کے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ مجھ سے بولا "ثناء! تم فرحان کو لے کر چھت پر چلی جاؤ مکان کی چھتیں ملی ہوئی ہیں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم کسی دوسرے مکان میں اتر جائیں گے۔ فی الحال میں یہاں کھڑا ہو کر سن گن لیتا ہوں۔"

سلیم کی تجویز معقول تھی میں فرحان کو لے کر سیڑھیوں کے بالائی سرے پر جا بیٹھی۔ گلی سے آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ یہ تکلیف دہ سلسلہ کوئی آدھ گھنٹے بعد ختم ہوا۔ دروازے پر دستک ہوئی سلیم نے کواڑ کھولے اور زینب گھبرائی ہوئی اندر آ گئی۔ اسے تنہا دیکھ کر میں بھی سیڑھیوں سے اتر آئی۔

وہ بولی "چوہدرانی جی' خدا کا لاکھ شکر کریں آپ کی اور ہم سب کی جان بچ گئی۔ یہ جاگیردار کے آدمی تھے۔ ڈیک نالے کے کنارے انہیں آپ کی خراب گاڑی ملی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ دونوں اس گاؤں میں آئے ہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے ان کے ساتھ کوئی کھرا اٹھانے والا نہیں تھا ورنہ وہ سیدھے میرے دروازے تک آجاتے مگر ابھی بھی خطرہ پوری طرح ٹلا نہیں وہ آگے گئے ہیں ہو سکتا ہے دوبارہ آئیں۔"

کچھ سوچ کر میں نے اپنی ایک طلائی چوڑی اتاری اور زینب کو تھماتے ہوئے کہا۔

"زینب جہاں اتنا احسان کیا ہے' تھوڑا سا اور کر دو۔ کسی طرح اس چوڑی کو فروخت کروا کر کچھ پیسوں کا انتظام کر دو۔ ہم چاہتے ہیں کہ آج اندھیرا ہوتے ہی تمہارے گھر سے نکل جائیں۔" زینب سوچ میں پڑ گئی شاید سوچ رہی تھی کہ یہ قیمتی چوڑی لے کر کس کے پاس جائے۔ پھر اس کے ذہن میں کوئی بات آئی بولی ٹھیک ہے میں اپنے بھائی کو بلواتی ہوں وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔

سلیم نے کہا "اس کے علاوہ ہمیں دو جوڑے کپڑے کی بھی ضرورت ہے" زینب بولی "ایک زنانہ جوڑا تو میرے پاس ہے' اور چوہدرانی جی کو ٹھیک بھی آئے گا مردانے جوڑے کا مسئلہ ہے۔ ابھی دن چڑھتا ہے تو پڑوسن سے بات کرتی ہوں۔"

میں نے کہا "زینب تم سمجھدار ہو۔ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پھر بھی جو
کچھ کرنا احتیاط سے کرنا۔"
سلیم نے کہا "تمہارے گھر میں ہاون دستہ تو ہے۔ چوڑی بھائی کو دینے سے پہلے اس
میں اچھی طرح کوٹ لینا۔"
وہ بولی "آپ فکر نہ کریں۔ میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔"
اس نے مجھے اور سلیم کو گھر کی پچھلی کوٹھری میں بند کر کے باہر سے تالا لگادیا اور
ہدایت کی کہ کوئی آواز نہ نکالیں اور بہتر ہے کہ بچے کو مسلسل سوتا رکھیں۔ وہ نہیں چاہتی
تھی کہ اس کے بچوں کو بھی ہماری موجودگی کا پتہ چلے۔ دوپہر ایک بجے آکر اس نے ہمیں
کپڑوں کے دو جوڑے دیئے اور بتایا کہ اس کا بھائی چوڑی لے کر جھنگ گیا ہوا ہے اور
شام سے پہلے پہلے واپس آجائے گا۔ وہ ہمارے لئے کھانا بھی لے کر آئی تھی جس میں
ساگ تندوری روٹی چاٹی کی لسی اور اچار شامل تھا۔ پتہ نہیں بیچاری نے یہ انتظام کیسے کیا
تھا۔ ہم دونوں زینب کے لئے دل میں بہت احسان مندی محسوس کر رہے تھے اور اس کا
احسان چکانے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ جانے سے پہلے اس کی مالی مدد کی جائے۔ میرے
جسم پر کچھ نہیں تو تیس پینتیس ہزار کا زیور موجود تھا اور میں اس قابل تھی کہ اس کی مدد
کر سکوں۔ شام سے ذرا پہلے اس نے دو تولے سونے کی قیمت جو اس وقت چار ہزار
روپے تھے لاکر میرے ہاتھ رکھ دی۔ تاہم اس کے ساتھ ہی وہ ایک بری خبر بھی لے کر
آئی تھی۔ اس نے ایک مڑا تڑا اخبار ہمارے سامنے پھیلا دیا۔ یہ اخبار اس کے بھائی نے
شہر سے خریدا تھا۔ اخبار کے پچھلے صفحے پر میری اور سلیم کی تصویر کے ساتھ یہ سنسنی خیز خبر
موجود تھی۔

"بیوی نے آشنا کے ساتھ مل کر شوہر کو قتل کردیا" تفصیلات میں درج تھا
"جاگیردار واصف چنگیزی کو کل ان کی بیوی شاہ نے اپنے آشنا سلیم کے ساتھ مل کر موت
کے گھاٹ اتار دیا۔ واصف چنگیزی پر عقب سے گولی چلائی گئی جو ان کی گردن کو چیر کر
دماغ میں پہنچ گئی۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔ ان کے مسلح محافظ رب نواز کو شدید زخمی
حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا ہے۔ حویلی کے دو اور ملازم جن میں واصف چنگیزی کا ڈرائیور
بھی شامل ہے معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ مجرموں کی تلاش میں پولیس سرگرمی سے چھاپے

مار رہی ہے۔"
یہ خبر مجھ پر سکتہ طاری کرنے کے لئے کافی تھی۔ میرے بدترین خدشات حقیقت کا
روپ دھار چکے تھے۔ میں جو ایک چیونٹی کی جان لینے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتی تھی آج
ایک قاتلہ تھی اور مجھ پر اپنے شوہر کو قتل کرنے کا الزام تھا۔ کتنی ہی دیر ہم دونوں ایک
دوسرے سے کوئی بات نہ کر سکے۔ ذہنوں میں اتھل پتھل سی مچی ہوئی تھی۔ صورت حال سنگین
تر ہوگئی تھی۔ اس خبر کا مطلب یہ تھا کہ جاگیرداروں کے پالتو غنڈے ہی نہیں پولیس بھی
ہمیں سرگرمی سے تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ اخباروں میں ہماری تصویریں شائع ہوچکی
تھیں اور اب اس چار دیواری سے باہر ہمارے لئے خطرات ہی خطرات تھے۔ زینب بھی
اس صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔ ایک عورت ہونے کے باوجود وہ اب تک نہایت
حوصلے اور جرات سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ معصوم بچوں کی ماں تھی ہماری وجہ
سے اس پر بھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ سکتے تھے۔ مگر وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہمیں
تحفظ دے رہی تھی۔ اس نے کہا چوہدرانی جی! فی الحال یہاں سے جانے کا خیال دل سے
نکال دیں۔ اس موت جوگی اخبار نے آپ کو ہر طرف نشر کر دیا ہے۔ آپ پر الزام بھی
بڑے سخت لگائے گئے ہیں۔ یہ سارا معاملہ ذرا ٹھنڈا ہولینے دیں۔ پھر یہاں سے نکلیں۔
میں اپنے دونوں بڑے بچوں کو بھی آپ کے بارے میں بتا دیتی ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ باہر
بات نہیں کریں گے۔ بس آپ یہ کوشش کریں کہ کاکا زیادہ روئے نہ۔"
زینب دروازے کو باہر سے تالا لگا کر چلی گئی اور ہم دیئے کی مدھم روشنی میں اپنی
اپنی سوچوں سے جنگ کرنے لگے۔ اور وہیں پر مجھ سے وہ غلطی ہوئی جو نہیں ہونی چاہئے
تھی۔ شاید اس غلطی کی وجہ یہ تھی کہ میں سلیم کے مزاج سے پوری طرح آگاہ نہیں
تھی۔ مجھے اس آتش فشاں کی خبر نہیں تھی جو اس کے سینے کی گہرائی میں ہروقت دہکتا رہتا
تھا اور جسے جگانے کیلئے صرف ایک اشارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ میں چونکہ اس وقت
خود بھی صدمے سے دوچار تھی اس لئے میں نے سلیم کو اس گفتگو کے بارے میں بتا دیا جو
چند ہفتے پہلے واصف چنگیزی اور میڈم نادرہ کے درمیان ہوئی تھی۔
میں نے سلیم پر واضح کر دیا کہ میری اور اس کی بربادیوں کی اصل جڑ میڈم نادرہ
ہی ہے۔ یہی وہ عورت ہے جس نے پرانی عداوت کی وجہ سے بدنیتی کا مظاہرہ کیا اور مجھے

واصف چنگیزی کی بیوی بنا کر حویلی کے جہنم میں دھکیل دیا اور یہی وہ عورت ہے جو اب ایک گہری سازش کے تحت واصف کو اس کے (سلیم کے) خلاف بھڑکا رہی تھی۔ میں نے کہا "سلیم! اسی لئے میں تمہیں بار بار حویلی سے چلے جانے کا مشورہ دیتی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ بدذات میری زندگی تو برباد کر ہی چکی ہے اب تمہیں بھی جاگیرداروں کے ہاتھوں قتل کروا دے گی۔ اس کے دل میں تمہاری دشمنی کی جڑیں بہت گہری اتری ہوئی ہیں۔ وہ ہر پل تمہاری خبر رکھتی تھی۔ اسے یہاں تک معلوم تھا کہ تم نے جیل سے رہا ہونے کے بعد ایک پستول خریدا ہے اور اب یہ پستول واصف کے خلاف کام آئے گا۔"

میں روتی رہی اور سلیم کے سامنے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتی رہی۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے سننے کا انداز بتا رہا تھا کہ میری باتوں سے اس کے بہت سے اندیشے درست ثابت ہو گئے ہیں۔

............یہ اس سے اگلی رات کا واقعہ ہے۔ کوئی گیارہ بارہ کا وقت ہو گا۔ دوران نیند کندھے سے اٹھنے والی ٹیس نے مجھے جگا دیا۔ چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی لالٹین کی مدھم لو کمرے کے ایک تہائی حصے میں معمولی روشنی بکھیر رہی تھی۔ یہ لالٹین کچھ دیگر سودا سلف کے ساتھ زینب آج ہی بازار سے خرید کر لائی تھی۔ میں نے حسب عادت سر اٹھا کر دیکھا فرحان گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ سلیم کی طرف اٹھ گئی۔ وہ میری طرف پشت کئے کھڑا تھا۔ اس کے پاؤں میں چپل تھی اور کندھے سے گولیوں کی پٹی لٹک رہی تھی۔ وہ کہیں جانے کے لئے تیار نظر آتا تھا اور شاید چند لمحے مزید میری آنکھ نہ کھلتی تو وہ کھڑکی کے راستے باہر نکل چکا ہوتا۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"کہاں جا رہے ہو سلیم؟"

اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ میں سرتاپا لرز گئی۔ اس کی آنکھیں کسی درندے کی طرح روشن تھیں۔ وہ بالکل ایک بدلا ہوا آدمی نظر آ رہا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں اسے پہلے بار دیکھ رہی ہوں۔ اس کے چہرے کی ایک ایک رگ تنی ہوئی تھی۔ میں نے حوصلہ کرکے پھر پوچھا "کہاں جا رہے ہو سلیم؟"

وہ عجیب آواز میں پھنکارا "ایک کام سے جا رہا ہوں۔ کل رات بارہ بجے سے پہلے آجاؤں گا۔"

"ایسا بھی کیا ضروری کام ہے۔ تمہیں معلوم ہے یہاں سے نکلنا کس قدر خطرناک ہے۔"

"بحث مت کرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔"

"کیا کام ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

"اس وقت نہیں بتا سکتا۔"

"لیکن میں بتا سکتی ہوں۔" میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم......... تم لاہور جا رہے ہو۔ میڈم نادرہ کو قتل کرنے کے لیے۔"

میں نے اس کے دل کی بات کہی تھی اور یہ وہ بات تھی جو اس کا کلیجہ ہلا سکتی تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ میں نے اسے جھنجھوڑ کر سرگوشی کی "بتاؤ......... بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

وہ کسی درندے کی طرح غرایا "ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہاری زندگی برباد کرنے کے بعد اس عورت کو اب جینے کا کوئی حق نہیں۔"

نہ جانے میرے اندر اتنا حوصلہ کہاں سے آ گیا۔ میں چند لمحے اس کی انگارہ آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ پھر ایک عجیب اعتماد کے سہارے میں نے نہایت تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں سلیم! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ ہم اس آگ میں اور نہیں کھیلیں گے......... ہم خاموشی سے کسی جانب نکل جائیں گے۔ ہمیں کسی سے انتقام نہیں لینا۔"

"یہ نہیں ہو گا ثناء۔ وہ عورت آج رات کی صبح نہیں دیکھے گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"پھر میرا آخری فیصلہ بھی سن لو۔ اس گھڑی کے بعد تم میری صورت کبھی نہیں دیکھو گے۔"

"مجھے اب کسی کی پرواہ نہیں" وہ جیسے غضب میں دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور کھڑکی کی طرف بڑھا۔ میں نے لپک کر اس کا کرتہ کھینچ لیا۔

"نہیں سلیم میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔" وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے کے مختصر رقبے میں ہم دونوں کے درمیان زبردست کشمکش شروع ہو گئی۔ شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر میں پوری جسمانی قوت سے اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی

اور وہ میرے ہاتھوں سے نکل نکل رہا تھا۔ اس کی قمیض پھٹ گئی تھی اور میرے بازوؤں پر بھی خراشیں آرہی تھیں۔ تاہم یہ ساری جدوجہد خاموش تھی۔ ہمارے درمیان جن تیز فقروں کا تبادلہ ہو رہا تھا وہ بھی سرگوشیوں میں تھے۔ سلیم کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی طرح مجھے جھٹک کر کھڑکی تک پہنچ جائے اور اسے کھول کر باہر نکل جائے۔ مجھ میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی کہ میں ابھی تک اس کی مزاحمت کر رہی تھی۔ میری کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلیم کا انداز دفاعی تھی۔ وہ مجھے کوئی ضرب لگانا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ اس جیسے طاقتور اور مشتعل مرد کا ایک ہی تھپڑ مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کر سکتا تھا.......... اس کشمکش کا انجام سلیم کی پسپائی پر ہوا۔ اچانک اس نے ہمت ہار دی۔ یکایک اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور ایک خوفناک ٹکر مٹی کی دیوار پر پڑی پورا کمرا جیسے ہل کر رہ گیا۔ پھر یکے بعد دیگرے وہ دیوار سے ٹکریں مارنے لگا۔ شاید آپ اسے مبالغہ سمجھیں، سلیم کے سر کی ضربوں سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پورا کمرا دھڑام سے ہمارے اوپر آگرے گا۔ اس کے سر میں کوئی عجیب سی قوت پوشیدہ تھی۔ میری نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس نے ہمارے گھر کے سامنے قاسم اعوان اور برادران کو ٹکریں مار مار کران کا بھرکس نکال دیا تھا۔ پھر حویلی میں اس نے جس طرح لکڑی کی کھڑکی توڑی تھی۔ وہ منظر مرتے دم تک میری آنکھوں میں نقش رہے گا۔ بڑا ڈرامائی منظر تھا وہ..........

میں نے سلیم کے بال کھینچ کر اسے بمشکل اس پاگل پن سے روکا۔ دھم دھم کی آوازیں سن کر زینب کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے ہلکی سی مخصوص دستک دی۔ سلیم اب ماتھا زمین پر ٹیکے ہچکیوں سے رو رہا تھا اس کا رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کوئی خوفناک ترین طوفان چڑھ کر اتر گیا ہو۔ میں نے دروازے کے پاس جاکر زینب کو بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ جاکر سو جائے۔ زینب چلی گئی تو میں سلیم کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ اس گھڑی وہ مجھے ایک روٹھا ہوا بچہ محسوس ہوا۔ ایک عجیب جذبے کے تحت میں نے اس کا کھردرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور دھیرے دھیرے اسے سمجھانے لگی۔ ہم دونوں کے درمیان وہ اب تک ایک طویل ترین گفتگو تھی مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ ہم نے اس رات اپنے آئندہ دنوں کی منصوبہ بندی کی۔ میں نے سلیم پر یہ بات کھول دی کہ میرے لئے سب سے مقدم چیز اپنے بچے کی سلامتی ہے۔ باقی

سب کچھ اس کے بعد آتا ہے۔ میں اپنے بچے کو حالات کی اس آگ سے بچا کر کہیں دور لے جانا چاہتی ہوں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب ہم تینوں اپنے ماضی سے ہر ناطہ توڑ لیں اور اس جاگیر کے خدائی فوجداروں کے اثر و رسوخ سے دامن بچا کر کوئی دور دراز کی پناہ گاہ ڈھونڈ لیں۔ میں نے سلیم کو اپنا نقطہ نظر سمجھانے کی سر توڑ کوشش کی اور مجھے اندازہ ہوا کہ اس میں کسی حد تک کامیاب ہوئی ہوں۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم دونوں کراچی نکل جائیں اور وہاں فرضی میاں بیوی کی حیثیت سے کم از کم دو برس نہایت خاموشی سے گزاریں۔ میرے پاس جو زیور ہے وہ ہماری ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ اگر کوئی سبب پیدا ہوا تو چھوٹا موٹا کاروبار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس دوران ہم یہ بھی فیصلہ کرلیں گے کہ آئندہ زندگی ہم نے کیسے گزارنی ہے۔ بحیثیت ایک عورت مجھے معلوم تھا کہ میری تجاویز میں سلیم کے لئے کافی کشش موجود ہے اور میں اس سلسلے میں مخلص بھی تھی.......... درحقیقت میں ماضی کو بھول کر ایک الگ نئی زندگی شروع کرنے کی خواہاں تھی ایسی زندگی جس میں میرا بچہ مستقبل کی آفتوں سے محفوظ رہ سکے.......... لیکن انسان سوچتا کچھ اور ہوتا کچھ ہے۔ میں بھی آنے والی گھڑیوں سے یکسر بے خبر تھی۔ سلیم کو اپنی تجاویز پر نیم رضامند کرنے کے بعد میں مطمئن ہو گئی۔ زینب کے گھر میں اگلا دن ہم نے روانگی کی تیاریوں میں گزارا۔ فیصلہ ہوا کہ کل صبح تین چار بجے ہم کچی سڑک کی طرف روانہ ہوں گے۔ اور چھ بجے والی پہلی بس کے ذریعے جھنگ پہنچ جائیں گے۔ زینب کے گھر میں وہ ہماری آخری رات تھی۔ سلیم سرِ شام ہی سو گیا تھا قریباً نو بجے بچے کو دودھ پلا کر میں بھی سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اس وقت میری نگاہ سلیم کے پستول پر پڑی۔ مجھے لگا جیسے دیوار سے لٹکا ہوا یہ پستول خون میں رنگا ہوا ہے۔ اس خون میں میرے شوہر کا خون شامل تھا اور ان لوگوں کا بھی جنہوں نے ابھی اس پستول سے قتل ہونا تھا۔ مجھے اس خونی ہتھیار سے شدید خوف محسوس ہوا۔ یہ ہتھیار سلیم کو اور اس کے ساتھ مجھے بھی سنگین ترین مجرموں کی صف میں کھڑا کر سکتا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ اس پستول کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے اسے ہولسٹر سے نکالا۔ سوئے ہوئے سلیم پر ایک نگاہ ڈالی اور بہ آہستگی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ کھڑکی کھول کر میں نے باہر جھانکا میرے سامنے دس پندرہ فٹ چوڑی گلی تھی اور گلی کے دوسرے کنارے پر کائی جمے جوہڑ کے سطح تھی۔ اس جوہڑ

میں سارا دن گاؤں کی بطخیں قیں قیں کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت ہر سو ٹھٹھری ہوئی خاموشی طاری تھی لہٰذا جب میں نے پستول اچھال کر جوہڑ میں پھینکا تو پانی میں چھپاکے کی آواز دور تک گئی۔ میں نے کھڑکی بند کی اور واپس آکر اطمینان سے لحاف میں لیٹ گئی۔ سونے سے پہلے میں نے اپنی دو طلائی چوڑیاں اتاریں اور تکیے کے نیچے رکھ دیں میں چاہتی تھی یہ چوڑیاں زینب کو میرے جانے کے بعد ملیں۔ یہ چوڑیاں میری طرف سے ان کوششوں کا اعتراف تھا جو زینب نے اپنی اور اپنے بچوں کی جان خطرے میں ڈال کر ہمارے لئے کی تھیں۔ خیالوں کے تانے بانے بنتے نہ جانے کس گھڑی آنکھ لگ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو ایک نامانوس شور پھیلا ہوا تھا۔ میں اور سلیم ساتھ ساتھ ہی اٹھے تھے۔ صحن میں چیخ وپکار کی آوازیں آرہی تھی۔ پھر خوفناک دھماکے سنائی دیئے اور یکے بعد دیگرے کئی گولیاں آکر دروازے کو لگیں۔ میں نے آہنی قفل ٹوٹ کر نیچے گرنے کی آواز سنی۔ تب ایک کڑکدار آواز سنائی دی۔ کسی نے ہم دونوں کو مشترک گالی دی اور بولا۔

"دروازہ کھول کر باہر آجاؤ ورنہ اندر ہی بھون کر رکھ دیں گے۔"

مجھے لگا جیسے ابھی تک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن نہیں یہ سب کچھ حقیقت تھا۔ سلیم نے مجھے کھڑکی کی طرف دھکیلا اور خود اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھا۔ ہولسٹر خالی تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے چکرا کر رہ گیا۔ "پستول کہاں ہے؟" وہ کراہا۔ میں بھلا کیا جواب دیتی۔ اس نے جلدی سے تکیہ اٹھایا' چارپائی کے نیچے دیکھا مگر وہ وہاں ہوتا تو ملتا۔ وہ چیخا "ثناء تم بھاگ جاؤ" ابھی اس کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور دو پستول بردار دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ اگلے شخص کے پستول سے شعلہ نکلا اور سلیم اپنا گھٹنا پکڑ کر دوہرا ہوگیا۔ میں نے فرحان کو سینے سے لگایا اور چیخ کر ایک کونے میں دبک گئی۔ تین افراد نے سلیم کو جکڑنا چاہا تو وہ پوری وحشت کے ساتھ ان سے بھڑ گیا۔ میں نے دو افراد کو اس کی ٹکریں کھا کر لڑکھڑاتے دیکھا۔ تیسرے نے اس کی سر پر ریوالور کا دستہ مارنا چاہا مگر اس نے سر بچا کر حملہ آور کے سینے پر ایسی ٹانگ ماری کہ وہ اچھل کر میرے قدموں میں آن گرا۔ اس وقت اس ایک شخص عقب سے آیا اور اس نے ایک فٹ لمبا چھرا نہایت بے دردی سے سلیم کی کمر میں گھونپ دیا وہ کراہ کر گھٹنوں کے بل گرا۔ میری آنکھوں کو کچھ اور دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔ کھڑکی بلندی پر تھی اور میں اس میں سے کود کر باہر

نہیں نکل سکتی تھی۔ نجات کا واحد راستہ دروازہ تھا۔ میں فرحان کے ساتھ جھکتی اور لپکتی ہوئی دروازے کی طرف گئی اس سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔ ابھی چند قدم آگے گئی تھی کہ کسی نے عقب سے زوردار دھکا دیا۔ میں اوندھے منہ گری۔ فرحان میری بانہوں سے نکل کر دور تک لڑھکتا اور چیختا چلا گیا اس وقت میری نگاہ اپنے دیور شجاع پر پڑی۔ اس کے ساتھ ایک لمبا تڑنگا شخص اور تھا دونوں کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر بے تابانہ فرحان کی طرف لپکنا چاہا لیکن تین سائے بلاؤں کی طرح مجھ پر جھپٹے اور مجھے جکڑ لیا شجاع بڑے خوف ناک انداز میں معصوم فرحان کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے خونی ہاتھ اس بے گناہ کی گردن تک پہنچتے۔ اندھیرے سے ایک عورت چیل کی طرح جھپٹی اور فرحان کو سینے سے لگا کر لنگڑاتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بھاگی یہ زینب تھی۔

"بھاگنے نہ پائے۔" لمبے تڑنگے شخص نے چلا کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ میرے دیور کے ساتھ خود بھی باہر کو بھاگا۔ زینب نے دروازے سے نکلتے نکلتے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ اس کا تعاقب کرنے والوں نے دروازہ بند پایا تو بوکھلاہٹ میں ناچ کر رہ گئے۔ آخر ایک شخص دیوار پھاند کر باہر گیا اور کنڈی کھولی۔ دروازے کھلتے ہی سب کے سب بھرا مار کر باہر نکل گئے۔ مجھ پر جھپٹنے والے دو بدمعاش بھی مجھے چھوڑ کر دروازے کی طرف بھاگے۔ اب صرف ایک شخص مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ نہ جانے کس طرح میں نے خود کو اس سے چھڑا لیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ شاید میں نے اس کی آنکھ میں انگلی ماری تھی یا اس کے پیٹ میں ضرب لگائی تھی۔ وہ تڑپ کر مجھ سے جدا ہوگیا۔ ایک لمحے کی چھوٹ غنیمت جان کر میں اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ کان ہر لحظہ گولی کی آواز پر لگے ہوئے تھے........ وہ گولی جو عقب سے مجھ پر چلائی جاتی تھی مگر قسمت میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ عقب سے کوئی بندوق میری طرف سیدھی ہوتی اور کوئی انگلی ٹرائیگر دباتی میں بیرونی دروازہ پار کر کے سامنے مونگروں کے کھیت میں گھس چکی تھی۔ یہ کھیت گھر کے عین سامنے واقعہ تھے۔ اگلا کھیت کماد کا تھا۔ یہ کافی اونچا تھا۔ اس میں گھس کر مجھے اندازہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی میں موت کو ٹالنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔ میری جوتی برآمدے میں میرے پاؤں سے نکل چکی تھی۔ دوپٹہ

صحن میں رہ گیا تھا اب میں ننگے سر اور ننگے پاؤں کھیت میں بھاگ رہی تھی۔ کھیت کے اونچے نیچے وٹوں پر تلووں کے زخمی ہونے کا کافی سے زیادہ سامان موجود تھا اور میرے تلوے زخمی بھی ہو رہے تھے۔ تاہم اس وقت یہ تکلیف نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں اپنے عقب میں ہاہاکار سن رہی تھی۔ جاگیردار کے کارندے پھیل کر میرے تعاقب میں آ رہے تھے۔ پھر میرے کانوں میں ایک اور آواز پڑی میں سرتاپا لرز گئی۔ یہ کتوں کی آواز تھی۔ حویلی کے شکاری کتوں کو میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ایسے ہی چند کتوں کو ہم نے حویلی سے فرار ہوتے وقت گولی ماری تھی۔ یہ تازی کتے خاص طور پر سدھائے گئے تھے اور مرتے دم تک اپنے شکار کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ ایک دفعہ میں حویلی میں ان درندوں کی درندگی کا مظاہرہ دیکھ چکی تھی۔ انہوں نے حویلی کی ملازمہ کے ایک معصوم بچے کو جو غلطی سے کتوں کی طرف چلا گیا تھا پلک جھپکنے میں تکہ بوٹی کر دیا تھا۔ وہ خونی منظر میرے تصور میں آیا اور اپنی کٹی پھٹی لاش میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔

"اے خدا میری مدد کر.......... اے مالک میری مدد کر" میں بھاگ رہی تھی اور زیرِ لب پکار رہی تھی۔

رات کی ٹھٹھری ہوئی تاریکی اور اونچے نیچے کھیتوں میں اوس سے بھیگی ہوئی زمین پر وہ ایک جان لیوا تعاقب تھا۔ مجھے وہ سب کچھ دھندلا دھندلا یاد ہے۔ میں بھاگ رہی تھی، لڑکھڑا رہی تھی، گر رہی تھی اور اٹھ رہی تھی۔ میرے چاروں طرف موت کی پرچھائیاں تھیں۔ گولیوں کی آوازیں اور غنڈوں کے للکارے اس ہنگامے کو اور بھی خوفناک بنا رہے تھے، پتہ نہیں میں کتنی دیر تک بھاگتی رہی۔ شاید دس منٹ، شاید بیس منٹ یا آدھ گھنٹہ، پھر مجھے اندازہ ہوا کہ موت کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ کتوں کی آوازیں مجھے اپنے عین عقب سے سنائی دینے لگیں۔ بس اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ایک آدھ ہانپتا غراتا کتا مجھے عقب سے دبوچنے والا تھا یا کوئی سنسناتی گولی انگارے کی طرح میری پشت میں اترنے والی تھی.......... ایکاایکی پوری رات کا چاند تاریک بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا اور ہر طرف اجالا پھیل گیا۔ مجھے اپنے سامنے صرف بیس گز کی دوری پر ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ یہ جیپ صرف دو تین سیکنڈ پہلے یہاں آکر رکی تھی اور اس کے پہیوں کی اڑائی ہوئی گرد ابھی تک فضا میں تھی۔ مجھے دیکھ کر چند افراد نے چھلانگیں لگائیں اور میری

طرف لپکے۔ میں اب چاروں طرف سے گھر چکی تھی۔ جھکائی دے کر میں نے ایک چادر پوش کے پہلو سے گزرنا چاہا مگر اس نے جھپٹ کر مجھے دبوچ لیا۔ میں نے دیوانہ وار خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ ایک بھاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہوش کر کڑیے.......... ہوش کر"

اس اجنبی آواز نے مجھے پہلی بار احساس دلایا کہ میں اپنے دشمنوں کے نرغے میں نہیں۔ یہ احساس اس وقت یقین میں بدل گیا جب اوپر تلے دو فائر سنائی دیے۔ میں نے مڑ کر دیکھا مجھ سے صرف دس گز کی دوری پر ایک کتا لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ یہ کتا جیپ سے کیے جانے والے فائر سے زخمی ہوا تھا۔ پلک جھپکتے میں کھیتوں سے کئی اور کتے برآمد ہوئے مگر مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی انہیں رخ بدلنا پڑا۔ جیپ سے تابڑ توڑ ہوائی فائرنگ کر کے انہیں دھمکا دیا گیا تھا۔ ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے کھینچ کر جیپ کے اوپر چڑھا دیا۔ کتے بری طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ جلد ہی ان کے رکھوالے بھی ہانپتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں زنجیریں تھیں اور تیور انتہائی خطرناک نظر آتے تھے۔ ان کے عقب میں تین عدد مسلح گھڑسوار تھے۔ ان کے کندھوں پر آویزاں گولیوں کی پیٹیاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ غالباً جاگیردار کے کارندے میرا تعاقب ٹولیوں میں بٹ کر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک "خوش قسمت" ٹولی اب میرے سامنے کھڑی تھی۔ جیپ کے سواروں کو دیکھتے ہی میرے تعاقب میں آنے والے اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ رکھوالوں نے آگے بڑھ کر کتوں کو زنجیریں پہنا دیں اور گھڑسوار گھوڑوں کو پرسکون کرنے کے لئے ان کی گردنیں تھپتھپانے لگے۔ اس دوران قریبی درختوں سے کچھ اور افراد بھی بھاگتے ہوئے آئے اور جیپ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں سے ظاہر تھا کہ وہ ابھی تک معاملے کی نوعیت سے بے خبر ہیں۔ تاہم ان کے ہاتھ اپنی رائفلوں پر تھے اور ان کے بشروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نام پتہ پوچھے بغیر گولی مار دیتے ہیں۔ میرے تعاقب میں آنے والے گھڑسوار اور پیدل افراد تھوڑی دیر جلتی نظروں سے جیپ والوں کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے رخ موڑا اور کھیتوں میں چلتے ہوئے اوجھل ہو گئے۔

حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے اردگرد کے ماحول پر توجہ دی۔ میں کوئی دس

مردوں کے نرغے میں تھی۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے دیکھ کر مجھے حوصلہ ہوتا۔ اگر ان کے دل بھی ان کی صورتوں کی طرح تھے تو اس ویرانے میں اور رات کے اس پہر میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ان میں سے ایک شخص جس کا قد لمبا' شانے گول اور چہرہ بھرا ہوا تھا' میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ بڑی بڑی مونچھوں نے اس کے چہرے کو اور بھی خوفناک بنا رکھا تھا۔ اس نے تہبند پر کڑھائی دار کرتا پہن رکھا تھا اور گلے میں سونے کا کینٹھا چمک رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر 35 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ رعب دار آواز میں بولا۔

"او کڑیے! یہ لچے تیرے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے؟"

اس کے سوال کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ ان لچوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کا مطلب تھا وہ واصف چنگیزی اور اس کے گھرانے کے بارے میں جانتا ہو گا۔ گو ہم واصف چنگیزی کی حویلی اور اس کی زمینوں سے کافی دور آ چکے تھے مگر واصف کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں تھا۔ اسے اور اس کے کارندوں کو پہچاننے والے دور دور تک مل سکتے تھے۔ دوسرا خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ یہ لوگ کوئی بھی ہیں بہرحال چنگیزی گھرانے سے ان کی لگتی ہے۔ غالباً کوئی پرانی عداوت وغیرہ ہے۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اپنے بارے میں بتانا چاہئے یا نہیں اور اگر بتانا چاہئے تو کیا؟ مجھے خاموش دیکھ کر وہ شخص گرجا۔

"کڑیے! میں نے تجھ سے کچھ پوچھا تھا؟"

میرا دل بھر آیا اور آنسو جو میں نے بمشکل آنکھوں سے دور روک رکھے تھے حفاظتی بند توڑ کر بہہ نکلے۔ میں کوشش کے باوجود اپنی ہچکیوں پر قابو نہ رکھ سکی اور میرے رونے کی صدا سناٹے میں دور دور تک پھیلنے لگی۔

"لو بھئی! یہ نیا ڈرامہ شروع ہو گیا" کینٹھے والے شخص نے ہنس کر کہا۔

اتنے میں دور کھڑا ایک شخص پکارا کر بولا "چودھری جی! چکوراں ڈگن لگ پئیاں نیں۔"

یکایک تمام افراد میں سنسنی سی پھیل گئی۔ ایک ہی لمحے میں انہوں نے مجھے فراموش کر دیا اور اس واقعے کو بھی جو چند منٹ پہلے یہاں رونما ہو چکا تھا۔ چودھری

نے پکار کر اپنے ایک کارندے کو حکم دیا۔

"اس کڑی کو چڑھاؤ جیپ میں اور اس کتے کو بھی رکھ کر لے آؤ۔"

اس کا اشارہ اس کتے کی طرف تھا جو ذرا دیر پہلے تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہوا تھا۔ ایک شخص نے مجھے دوبارہ جیپ پر چڑھنے کا حکم دیا۔ ایک دوسرے اجڈ سے شخص نے مردہ کتے کو پچھلی ٹانگوں سے پکڑ کر کھٹاک سے جیپ کے فرش پر دے مارا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور موڑ کاٹ کر نہایت تیزی سے درختوں کی طرف بڑھی۔ یہاں میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کئی افراد ٹارچیں لئے درختوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔ کبھی کبھی دھپ کی آواز آتی اور کوئی پرندہ کسی درخت سے زمین پر آ گرتا۔ چودھری کے کارندے اس کی طرف لپکتے اور اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیتے۔ ایک شخص ایک بھرا ہوا تھیلا جیپ میں رکھنے آیا تو میں نے دیکھا یہ پرندے چکور تھے۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا کیا گیا تھا کہ وہ بے دم ہو کر شاخوں سے نیچے گر رہے تھے۔ آدھ پون گھنٹے میں ان لوگوں نے کوئی چار تھیلے پرندوں سے بھر لئے۔ چاندنی رات میں چکور کے اس عجیب و غریب شکار سے فارغ ہو کر چودھری اور اس کے کارندوں نے شمال کا رخ کیا۔ مجھے رہ رہ کر فرحان کا خیال آ رہا تھا۔ زینب اسے لے کر بھاگی تھی۔ معلوم نہیں وہ پکڑی گئی یا نکل گئی تھی۔

اگر وہ پکڑی گئی تھی تو...... اس سے آگے میں سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ پھر میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب سلیم خنجر کا مہلک زخم کھا کر اوندھے منہ گرا تھا۔ "شاید اب تک وہ لوگ اسے دفن بھی کر چکے ہوں" آہ یہ کیا ہو گیا...... یہ سب کیا ہو گیا۔ کہیں یہ سب خواب تو نہیں۔ پھر میں نے اپنی خالی گود دیکھی۔ اپنی چھاتی کو اپنے بچے کے ننھے ہاتھوں کے لمس سے محروم پایا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سب خواب نہیں۔ "ہائے میرا بچہ" میرے سینے سے دلدوز سسکی نکلی اور میں ایک بار پھر رونے لگی۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے چودھری نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"ذرا صبر کر کڑیئے' گھر پہنچ کر تیری ساری کہانی سنیں گے اور اگر تیری مدد کر سکے تو مدد بھی کریں گے۔"

جیپ لہراتی ہوئی برگد کے دو بڑے درختوں کے نیچے رک گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے گھڑ سوار بھی یہاں آ کر ٹھہر گئے۔ یہ ایک ویران جگہ تھی۔ ایک طرف چند کچے کوٹھے

تھے۔ کوٹھوں کے سامنے دھونی رچی ہوئی تھی اور ایک دروازے کے اندر سے لالٹین کی
روشنی بھی نظر آرہی تھی۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور جیپ کی کھڑکھڑاہٹ سن کر ایک عمر
رسیدہ شخص لالٹین تھامے کوٹھے سے باہر نکل آیا۔ اتنی سخت سردی میں بھی اس کے جسم
پر ایک لنگوٹی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر چودھری نے اپنے ایک کارندے سے
کہا۔

"ہاشو! دو تھیلے بابے جی کے لئے ہیں" پھر اس نے بوڑھے کو مخاطب کرکے ہانک
لگائی "باباجی اپنا حصہ لے لیں آکر۔"

بوڑھا جھک کر چلتا جیپ کے پاس آیا۔ اس کے گلے میں مالائیں تھیں اور حلیہ
ملنگوں جیسا تھا۔ ہاشو نامی کارندے نے چکوروں سے بھرے ہوئے دو تھیلے بوڑھے کے
قدموں میں رکھ دیئے۔ بوڑھے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر درویشانہ انداز میں دعا دی۔

"اللہ تجھے تیرے مقصد میں کامیاب کرے' تو فقیروں کو خوش کرتا ہے اوپر والا تجھے
خوش کرے۔"

چودھری نے جیب سے کچھ روپے نکالے اور ملنگ کے ہاتھ میں تھما کر کہا "بابا!
لنگر کی روٹی کے لئے۔"

یہ روپے بھی فقیرانہ شان کے ساتھ رکھ لئے گئے۔ جیپ ایک جھٹکے سے آگے
بڑھی اور چند اونچے نیچے راستوں پر سفر کرنے کے بعد ایک گاؤں میں داخل ہوگئی۔ رات
کے اس پہر چودھری کا استقبال کرنے کے لئے گاؤں کے آوارہ کتوں کے سوا اور کون آسکتا
تھا۔ سو وہ آئے۔ اور ان کی دو رویہ قطاروں سے گزر کر جیپ پرانی طرز کی ایک حویلی کے
سامنے جا رکی۔ یہ مکان نما حویلی خالص دیہاتی طرز کی تھی۔ اس کے کھلے پھاٹک سے گزر
کر جیپ احاطے میں پہنچی۔ میرے ذہن میں کلبلاتے ہوئے اندیشے چیخنے چنگھاڑنے لگے
گاؤں سو رہا تھا اور میں اجنبی مردوں کے ساتھ ایک اجنبی چار دیواری میں تھی۔ چودھری
کے کہنے پر میں جیپ سے اتر تو آئی مگر اب میرا ہر قدم من من کا ہو چکا تھا۔ چودھری
تیز نظروں نے میری ہچکچاہٹ کو محسوس کرلیا۔ وہ اپنے نوکر سے بولا۔

"جا اوئے ہاشو! رضیہ کو بلا کر لا۔ وہ اسے زنان خانے میں لے جائے" رضیہ کا
سن کر میری جان میں جان آئی۔ اس کا مطلب تھا اس چار دیواری میں عورتیں بھی موجود

ہیں۔ تاہم میرا یہ اطمینان دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ چودھری نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے
کہا "میں ابھی تھانیدار کو لے آتا ہوں' اس کا بیان لینے کے لئے۔"

پولیس کا نام سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں مظلوم ہونے
کے باوجود مجرم بھی تھی۔ مجھ پر اپنے شوہر کے قتل کا الزام تھا اور قانون کے کاغذوں میں
مفرور تھی۔ میں نے بے ساختہ کہا "نہیں چودھری صاحب! پولیس کو اطلاع نہیں دینا' میں
آپ کو سب کچھ بتادوں گی۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دیتی ہوں...... لیکن...... لیکن
آپ" ایک بار پھر الفاظ میرے حلق میں گھٹ گئے اور میں ہچکیوں سے رونے لگی۔
چودھری اور موقعے پر موجود دوسرے افراد میری طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
ان کی نظروں کی چبھن میں بہت دیر پہلے سے محسوس کر رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ
میرے بتانے سے پہلے ہی یہ لوگ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ یہ گمان بھی ہو
رہا تھا کہ چودھری نے "پولیس" کی بات صرف میرا ردعمل دیکھنے کے لئے کی ہے۔
بہرحال اس موقع پر میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ ہوسکتا تھا یہ سب میرا وہم ہو۔
میرے جسم پر اس وقت ایک بوسیدہ سا دیہاتی لباس تھا۔ درحقیقت میں زینب کی اترن
پہنے ہوئے تھی۔ اپنی بول چال سے بھی میں نے کسی طرح کے شہری پن کا اظہار نہیں
ہونے دیا تھا۔ ہاتھوں کی طلائی چوڑیاں ابھی تک کسی نے نہیں دیکھی تھیں جو واحد شے
ان لوگوں کو کسی شبے میں مبتلا کر سکتی تھی وہ میرے کانوں کے وزنی جھمکے تھے۔ میں انہیں
بھی بار بار اپنے بالوں میں چھپانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔

چودھری نے اپنی گرم چادر میرے سر پر ڈال دی اور رضیہ نامی عورت سے بولا۔
"چل اس کو اندر لے جا" پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اچھا کڑیئے! چپ کر
اب' ہم نہیں بتاتے پلس کو۔"

رضیہ نے میرا بازو تھاما اور ساتھ لے کر زنان خانے کی طرف چل دی۔ زنان خانہ
ایک وسیع برآمدے اور پانچ چھ کمروں پر مشتمل تھا۔ برآمدے کے کچے ستونوں سے دو
روشن لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ میری آمد کی خبر یہاں تک پھیل چکی تھی اور بہت سی
عورتیں مجھے دیکھنے کے لیے جمع تھیں۔ یہ سب کی سب سوئی ہوئی اٹھی تھیں۔ بال بکھرے
ہوئے' ہونٹ اور آنکھیں سوجی سوجی' لباس شکن شکن' ان میں دو تین بوڑھی عورتیں

تھیں۔ باقی کی عمریں پندرہ اور تیس کے درمیان تھیں۔ ان سب کی نگاہوں میں بھی مجھے وہی چبھن محسوس ہوئی تھی جو اس سے پہلے میں مردوں کی نگاہوں میں محسوس کر چکی تھی۔ ایک دو کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹیں بھی نظر آئیں۔ پھر پچیس تیس برس کی ایک دراز قد خوبرو عورت آگے بڑھی۔ اس نے محبت سے میرا بازو تھام لیا اور بولی۔

”آ بہن! کھڑی کیوں ہے ادھر آرام سے بیٹھ جا۔“

ایک بوڑھی عورت نے کہا ”حمیدہ! ادھر سردی ہے۔ اسے اپنے کمرے میں ہی لے جا ویسے بھی گھبرائی ہوئی ہے بیچاری“ پھر وہ دوسری عورتوں اور لڑکیوں کو ڈانٹ کر بولی ”چلو ری چلو اپنے اپنے ٹھکانے پر چلو۔ کوئی تماشا نہیں لگا ہوا“ عورتیں جن میں زیادہ تر ملازمائیں تھیں۔ مختلف کمروں کی طرف کھسک گئیں۔

بڑھیا کی آواز حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ حمیدہ نامی وہ عورت مجھے لے کر ایک کمرے میں آ گئی۔ ایک طاقدان میں لالٹین روشن تھی۔ یہ کمرہ دیہاتی انداز میں سجا ہوا تھا۔ مٹی سے پوتی ہوئی دیواروں پر رنگین نقش و نگار‘ الماریوں میں برتنوں کی قطاریں‘ ایک کونے میں اناج کا ذخیرہ کرنے والا ”بھڑولا“ پڑا تھا۔ دوسرے کونے میں چارپائیوں کو اوپر نیچے رکھ کر چھت تک پہنچا دیا گیا تھا۔ میرے آنے سے پہلے کمرے میں حمیدہ کے علاوہ دو تین اور عورتیں بھی سو رہی تھیں۔ حمیدہ نے ان سب کو دوسرے کمرے میں جانے کی ہدایت کی۔

اب ہم دونوں تنہا تھیں۔ یہ گورے چٹے چہرے اور بھرے بھرے جسم والی عورت مجھے پہلی نگاہ میں ہی بھلی لگی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دوسری تمام عورتوں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ میں نے اس سے پہلا سوال یہی پوچھا ”میں کہاں ہوں؟“

وہ بولی ”تم پال پور گاؤں میں ہو۔ چودھری شباب کے گھر میں۔“

چودھری شباب کا نام سن کر میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی اور پھر ایک دم سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں سکتے کی حالت میں حمیدہ کا چہرہ دیکھتی چلی گئی۔ چودھری شباب کا نام میرے لئے نیا نہیں تھا۔ میں حویلی میں کئی بار یہ نام سن چکی تھی۔ میری معلومات کے مطابق شباب ایک خطرناک شخص تھا۔ چنگیزی گھرانے سے اس کی پرانی عداوت تھی۔ پچھلے دنوں حویلی میں یہ بات مشہور تھی کہ شباب کے کچھ پالتو غنڈے جیل سے مفرور ہیں اور وارداتیں کر رہے ہیں۔ حویلی میں خطرہ

ظاہر کیا جا رہا تھا کہ یہ لوگ حویلی کا رخ بھی کر سکتے ہیں...... اور اب میں اس چودھری شباب کے گھر میں تھی۔ حالات کا دھارا مجھے بہا کر کہاں سے کہاں لے آیا تھا۔ مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر حمیدہ نے بڑی محبت سے بالوں کی لٹ میری پیشانی سے ہٹائی اور بولی۔

”میرا خیال ہے تم بھائی شباب کا نام پہلے سے جانتی ہو؟“

”ہاں...... بہن“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”دیکھ میری بہن“ اس نے پیار سے میرے دونوں ہاتھ تھام کر کہا ”اب چھپانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہاں سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ تم کون ہو“ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ حمیدہ بولی ”بہرحال یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ بھائی شباب کی مرضی کے بغیر نہ پولیس یہاں پہنچ سکتی ہے اور نہ چنگیزیوں کا کوئی بندہ......“ میری پیشانی سخت سردی میں پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ میرے پہنچنے سے پہلے میری بربادی کے افسانے یہاں پہنچ چکے تھے۔ مجھے چودھری شباب اور اس کے ساتھیوں کی چبھتی ہوئی نظریں یاد آئیں۔ وہ دبی دبی سرگوشیاں یاد آئیں جو صحن میں عورتوں نے مجھے دیکھ کر کی تھیں۔ میں اپنے ہی احساس ندامت میں ڈوبنے لگی۔ آنکھوں نے ایک بار پھر ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی۔ مجھے روتا دیکھ کر حمیدہ نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ میں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ”ہائے میرا بچہ...... پتہ نہیں وہ کہاں ہوگا‘ کس حال میں ہوگا“ حمیدہ مجھے پچکارنے لگی۔ کچھ دیر بعد میرے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو حمیدہ نے کہا۔

”حوصلہ رکھ میری بہن! بھائی شباب سب کچھ ٹھیک کر لے گا۔“

اتنے میں دروازے پر کھنکارنے کی بھاری مردانہ آواز آئی اور چودھری شباب لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر آ گیا۔ کچھ دیر حوصلے تسلی کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا۔

”دیکھ بی بی! ہم نے تجھے پناہ دی ہے اور تیری پوری مدد بھی کریں گے لیکن یہ تب ہی ہو سکتا ہے کہ تو سارا حال احوال کھول کر بیان کرے۔“

میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی گود میں وہی مڑا تڑا اخبار پڑا تھا جس میں میری واپسی کا اشتہار لگا تھا۔ یعنی چند روز پہلے میرے شوہر کے قتل اور میرے فرار کی خبر چھپی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ زمیندار شباب اور اس حویلی کے تمام مکین میرے بارے میں قریباً سب کچھ جانتے ہیں اور ان سے اپنا آپ چھپا کر میں ان کی ہمدردیاں کھونے کے سوا

اور کچھ نہیں کروں گی۔ میں نے اپنے آنسوؤں پر ضبط کیا اور حویلی سے نکلنے کے بعد
تمام واقعات اختصار کے ساتھ اور ٹھہر ٹھہر کر ان کے گوش گزار کر دیے۔ جیپ خر
ہونے سے زینب کے گھر تک پہنچنے اور اپنے سسرالیوں کے شب خون سے لے کر فر
کی جدائی تک سب کچھ انہیں بتا دیا۔ دونوں بہن بھائی توجہ سے سنتے رہے۔ گاہے گا
سوال بھی پوچھتے رہے۔ میری روئیداد کے ختم ہوتے ہوتے چودھری شہاب اپنی جگہ
کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"بی بی! میرا خیال ہے کہ تو "ٹبے والی" گاؤں کی بات کر رہی ہے۔ میں ابھی ا
مخبر بھیج کر پتہ کرواتا ہوں کہ تیرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا ہے۔"

میں نے التجا کے لہجے میں کہا "شہاب صاحب! میرے بیٹے کا پتہ ضرور کرائیں
سکتا ہے زینب گاؤں ہی کے کسی گھر میں گھس گئی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ آس
کے کھیتوں میں کہیں چھپی ہوئی ہو۔"

یہ بات کرتے ہوئے میں نے پہلی بار نظر بھر کر چودھری شہاب کی صورت دیکھ
لالٹین کی روشنی میں اس کے خدوخال نمایاں تھے۔ چہرہ سخت گیر ضرور تھا مگر بدصو
نہیں تھا۔ وہ سرتاپا ایک دیہاتی باشندہ نظر آتا تھا۔

اگلے پانچ چھ روز میرے لئے بے حد ہیجان خیز تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرے
پاؤں زمین سے اکھڑ چکے ہیں اور میں ذرہ ذرہ ہو کر فضاؤں میں بکھری ہوئی ہوں۔ کچھ سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ صرف دو برس قبل کالج جانے اور خواب
دیکھنے والی لڑکی کن ان دیکھے راستوں پر نکل آئی تھی۔ وہ کتنی تیزی سے خانہ آبادی سے
خانہ بربادی کی منزل تک پہنچی تھی اور اب........ اس کی گود خالی تھی اور اسے سہارا
دینے والے بازو بھی ٹوٹ چکے تھے۔

"ٹبے والی" گاؤں کے جو حالات چودھری شہاب کی زبانی معلوم ہوئے تھے ان کے
مطابق زینب کا کسی کو کوئی پتہ نہیں تھا۔ گاؤں سے باہر ایک کنوئیں کے پاس اس کی
اوڑھنی پڑی ہوئی ملی تھی جس پر خون کے دھبے تھے........ سلیم کو شدید زخمی حالت میں
ملک کے سرکاری ہسپتال میں پہنچایا گیا تھا جہاں اس پر پولیس کا پہرا تھا اور اس کی حالت
بے حد نازک تھی۔ چودھری شہاب کے بندوں نے اپنے طور پر سراغ لگایا تھا کہ اس
سارے واقعے کا ذمے دار زینب کا بھائی تھا۔ وہی بھائی جو میری طلائی چوڑی بیچنے شہر گیا
تھا۔ زینب نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اسے ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس
نے انعام کے لالچ میں آ کر میرے سسرالی رشتے داروں کو میرے اور سلیم کے متعلق
اطلاع دے دی اور وہ ہم دونوں بلکہ فرحان سمیت تینوں کا قصہ پاک کرنے کے لئے ٹبے
والی گاؤں پہنچ گئے۔ چودھری شہاب نے بتایا کہ میرے آدمی زینب کے بھائی کو پکڑ کر لے
آئے مگر اسے کسی طرح بھنک پڑ گئی ہے اور وہ گاؤں سے غائب ہے۔

اب صورت حال یہ تھی کہ میرے سسرال والوں کو جو اب میرے جانی دشمن تھے

میرے سنے ٹھکانے کا علم ہو چکا تھا۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ میں اس وقت پال پور گاؤں میں زمیندار شباب کی تحویل میں ہوں۔ زمیندار شباب کوئی معمولی آدمی نہیں تھا ورنہ اب تک میرے ساتھ ساتھ اس کے ٹکڑے بھی ہو چکے ہوتے۔ میرے سسرالیوں کے سامنے اب دو راستے تھے۔ اول یہ کہ وہ براہ راست جا کر پولیس میں اطلاع دیں اور انہیں بتائیں کہ ان کی مفرور قاتلہ اس وقت چودھری شباب کی حویلی میں ہے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ پولیس کو بیچ میں لائے بغیر اپنے طور پر بزور بازو یہ معاملہ نمٹانے کی کوشش کریں۔ چودھری شباب کو پختہ یقین تھا کہ چنگیزی دوسرا راستہ ہی اختیار کریں گے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ان کے خاندان کا رواج ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ پانچ روز گزرنے کے باوجود ابھی تک پولیس نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ حالانکہ انہیں وقوعہ کے چار پانچ گھنٹے بعد ہی چودھری شباب کے دروازے پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اس کا مطلب تھا یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ بنے گی۔ تاہم چودھری شباب ہر صورت حال کے لئے تیار تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا
"بی بی! اگر پلس آئی بھی تو اسے شباب کی حویلی سے کچھ نہیں ملے گا۔"

اب دیکھنا یہ تھا کہ پولیس آتی ہے یا میرا دیور شجاع اپنے پالتو غنڈوں کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے۔ کسی تیسری طرف کا دھیان نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ وہ ایک سرد دوپہر تھی۔ دو تین روز بعد تھوڑی سی دھوپ نکلی تھی۔ حمیدہ نے بااصرار میرا سر دھلوایا اور چھت پر جا کر میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ اس دوران اس کی والدہ نے اسے نیچے صحن سے آواز دے دی۔ وہ نیچے چلی گئی۔ میں بھی نیچے جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ جوتی تلاش کر کے پہنی تو ایک دم چونکنا پڑا۔ بائیں پاؤں کی انگلیاں جوتی کے اندر کسی شے سے ٹکرائی تھیں۔ یہ ایک بند جوتی تھی جسے عام زبان میں "پمپی" بھی کہا جاتا ہے۔ جوتی کے اندر کوئی کاغذ ٹھنسا ہوا تھا۔ میں نے پاؤں نکال کر یہ کاغذ باہر کھینچا۔ یہ ایک مڑا تڑا نیلا لفافہ تھا۔ اس پر نیلی سیاہی میں ثنا محمود کے الفاظ دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا۔ یہ لفافہ یہاں کیسے آیا اور اس پر میرا نام؟ اچانک ہی مجھے کسی گھمبیر خدشے کا احساس ہوا۔ میں نے لفافہ لباس میں چھپایا اور تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے ایک کمرے میں آ گئی۔ اندر سے کنڈی چڑھا کر میں نے دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا۔ اندر کاپی سائز کا

ایک کاغذ تھا اور زخموں پر باندھنے والی سوتی پٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ ٹکڑے کی چار تہیں کی گئی تھیں۔ ان تہوں میں سفید روئی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی سے روئی کھول کر دیکھا۔ میری آنکھیں دہشت سے پھٹی رہ گئیں۔ روئی پر خون کے سرخ دھبے تھے اور ان دھبوں کے درمیان ایک ننھے منے بچے کی انگلی کی پور رکھی تھی۔ پور کو ناخن سمیت کاٹا گیا تھا اور کٹے ہوئے کنارے ہلکے سیاہ ہو چکے تھے۔ گوشت کی سیاہی مائل سرخی کے اندر سے نرم ہڈی کی سفیدی جھانک رہی تھی۔ میں جیسے پتھر ہو گئی۔ میری آنکھیں بھی پتھرا گئیں اور میرا دماغ بھی۔ میں جسم کے اس ٹکڑے کو پہچان سکتی تھی۔ یہ تو پوری ایک پور تھی۔ اگر اس انگلی کا ہزارواں حصہ بھی ہوتا تو شاید میں اسے پہچان لیتی۔ یہ ننھی پور میرے جسم کا حصہ تھی۔ یہ بارہا میری چھاتی پر رینگی تھی اور بارہا میرے ہونٹوں نے اسے چوما تھا۔ میں اسے کیوں نہ پہچانتی؟ کیوں نیم پاگل نہ ہو جاتی؟ میری نگاہیں، میری لرزتی کانپتی نگاہیں کاپی سائز کے صفحے پر جم گئیں۔ لکھا تھا۔

ثناء محمود!

یہ تیرے بچے کی انگلی ہے۔ بڑے پیار سے کاٹی ہے۔ پھر بھی کمبخت بڑا رویا چلایا ہے۔ تین گھنٹے ہو چکے ہیں ابھی تک شیطان نے منہ میں زبان نہیں ڈالی۔ مجبوری ہے اب خواب آور انجکشن لگانا پڑے گا.......... بچے کو نہیں خود مجھے اپنے آپ کو، آخر سونا بھی تو ہے۔ ایسے ہی پانچ انجکشن میرے پاس اور رکھے ہیں شاید اگلے ہفتے تک کام آ جائیں۔ تم سے خط و کتاب کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ جاری رہے گا۔ شاید پرسوں تمہیں ایک ایسا ہی خط اور ملے.......... اگر یہ خط و کتابت تمہیں پسند نہیں تو کل رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان خانقاہ ڈوگراں کے سامنے روہی نالے کی دوسری پلی پر پہنچ جاؤ۔ پڑھی لکھی ہو، میرا خیال ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں تنہا ہونا چاہئے۔ ویسے اگر تم کسی چاچے ماے یا ڈی آئی جی، کمشنر وغیرہ کو ساتھ لانے میں انٹرسٹڈ ہو تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ تاہم اس کے بعد نتائج کی تمام ذمے دار تم پر ہوگی۔ ہو سکتا ہے ان چھوٹے چھوٹے لفافوں کی بجائے مجھے ایک بڑا پارسل ارسال کرنا پڑے۔

تمہارا خیر خواہ

نظر آنے والی ہر شے میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ ذہن میں تیز آندھیاں

سی چل رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا میرا بچہ میرے سسرالی رشتے داروں کے قبضے میں ہے اور انہی میں سے کسی نے مجھے یہ خط لکھا ہے۔ لکھنے والا کون تھا؟ اور مجھے بلانے سے اس کا کیا مقصد تھا۔ اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہ سوال آیا کہ نیلا لفافہ میری جوتی میں پہنچا کیسے۔ غالباً یہ گھر ہی کے کسی ملازم یا ملازمہ کا کام تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی آنے جانے والے نے ہوشیاری سے یہ لفافہ میری جوتی میں رکھ دیا ہو۔ اس گھر کا معمول تھا کہ روزانہ صبح کے وقت زنان خانے میں لسی کی چار پانچ بھری ہوئی چاٹیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ زنان خانے کی سب سے عمر رسیدہ عورت جو رشتے میں چودھری شباب کی پھوپھی لگتی تھی ان چاٹیوں پر بیٹھ جاتی تھی اور گاؤں کی عورتیں اور بچے قطار اندر قطار زنان خانے میں آنے لگتے تھے ان کے ہاتھوں میں ڈول' بالٹیاں اور گڑوے وغیرہ ہوتے تھے۔ یہ لوگ دس گیارہ بجے تک لسی کے لئے آتے رہتے تھے ممکن تھا ان میں ہی سے کسی نے یہ لفافہ جوتی میں گھسیڑ دیا ہو.......... میں نے روتے ہوئے اس چھوٹی سی پور کو سینے سے لگایا اور نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑی۔

میرے سینے میں ماں کا دل تھا اور ماں کا دل کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ دل گواہی دے رہا تھا کہ اگر میں نے اس سانحے سے چودھری شباب یا اپنے کسی اور خیر خواہ کو آگاہ کیا تو میرا فرحان زندگی سے محروم ہو جائے گا۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا اس شقی القلب شخص کی بات مان لینی چاہئے۔ اس سوال کا جواب آسان نہیں تھا' میں مکمل طور پر اندھیرے میں تھی۔

میں ساری رات انگاروں پر لوٹتی رہی اور سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ کائنات میں صرف ایک ہی منظر اور ایک ہی آواز رہ گئی تھی۔ یہ منظر میرے فرحان کی سربریدہ انگلی کا منظر تھا اور یہ آواز اس کی روتی بلکتی صدا تھی۔ وہ اپنے سینے کی گہرائیوں سے رو رہا تھا اور مجھے پکار رہا تھا۔ مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک ماں کے لئے یہ دنیا کس قدر عبرت ناک مقام بن چکی تھی۔ صبح ہوئی تو میرا پورا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ دوپہر تک بخار اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ میں قریباً بے ہوش ہو گئی۔ بے ہوشی کی حالت میں نے خود کو فرحان کا نام پکارتے سنا۔ پھر میں نے حمیدہ کو دیکھا جو میری پیشانی پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ رات کسی وقت میں نے دیکھا ایک کمپاؤنڈر نما شخص مجھ پر جھکا ہوا میرے بازو میں انجکشن لگا

رہا ہے۔ پورے دو روز میں بخار میں بے حال رہی۔ تیسرے روز صبح کے وقت قدرے بہتر ہوا اور اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہوئی۔ منہ ہاتھ دھو کر میں نے ہلکا ناشتہ کیا اور تھوڑی سی چہل قدمی کرنے کے بعد دوبارہ بستر پر آلیٹی۔ ذہن پر ایک بار پھر خوفناک اندیشوں کی یلغار ہونے لگی تھی۔ یکایک مجھے اپنے سر کے نیچے تکئے میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی کاغذ غلاف کے اندر رکھا ہو۔ جسم جیسے اچانک بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گیا۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھی اور خوفزدہ نظروں سے تکئے کی طرف دیکھنے لگی۔ اتفاقاً اس وقت کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے لرزتا کانپتا ہاتھ تکئے کے غلاف میں ڈالا اور ایک کاغذ باہر نکال لیا۔ یہ ویسا ہی نیلا لفافہ تھا۔ اس کا ابھار محسوس کر کے دل میرے سینے میں پور پور ٹکنے لگا۔ میں نے لفافہ چاک کیا وہی کاپی سائز کا منحوس صفحہ اور وہی خون کے دھبوں والی سفید روئی۔ اس دفعہ مجھے روئی کھول کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میرے سینے سے ایک خاموش چیخ بلند ہوئی اور میں چکرا کر اوندھے منہ تکئے پر گر گئی۔ آپوں آپ میری ہچکیاں بلند ہونے لگیں اور آنسو آبشاروں کی طرح رخساروں پر بہنے لگے۔ اپنے بچے کی کٹی ہوئی انگلی میری مٹھی میں دبی تھی اور کانوں میں اس کی ہولناک چیخیں گونج رہی تھیں۔ خدا گواہ ہے میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ حالات اس قدر کٹھن اور انسان اتنا خطرناک و بے رحم ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے حیوان تھے یہ کیسے شیطان تھے جو ایک دودھ پیتے بچے کو تڑپا تڑپا کر مار رہے تھے۔ میرے دل میں آئی کہ سب نتائج سے بے پرواہ ہو کر پولیس سٹیشن پہنچ جاؤں اور جھولی پھیلا کر قانون سے "مدد" کی بھیک مانگوں۔ مگر پھر منحوس خط کے منحوس الفاظ میری نگاہوں میں گھوم گئے "پڑھی لکھی ہو میرا خیال ہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تمہیں تنہا ہونا چاہئے.........." اچانک مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ حمیدہ دوائی لے کر میری طرف آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے لفافہ اور روئی کا پرزہ لحاف میں چھپا لیا۔ میرے آنسو پونچھتے پونچھتے حمیدہ آن وارد ہوئی۔

"ہائے! تم تو رو رہی ہو۔ بخار کی بے ہوشی میں تو خوب باتیں ہو رہی تھیں۔ اب بخار اتر گیا تو رونا شروع کر دیا ہے۔ قسم ہے عجیب لڑکی ہو تم بھی۔" اس نے مجھے دوا پلائی اور پائنتی کی طرف بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ "تمہارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔ میں آج صبح تمہارے واسطے "بابے بوہڑ والے" کے پاس گئی تھی۔ بابے بوہڑ والے کو تم نہیں

جانتیں۔ بڑا پہنچا ہوا فقیر ہے۔ اسے بابا باز والا بھی کہتے ہیں۔ بڑے بڑے شکاری آتے ہیں
اس کے پاس۔ سنا ہے اسے سو کوس دور سے باز کا گھونسلہ نظر آجاتا ہے۔ بھائی شباب کو بڑا
یقین ہے بابے پر۔ پچھلے موسم میں اس نے دو باز پکڑے تھے بابے کے "تعویے" پر۔ میں
نے بابے سے تمہارے فرحان کے بارے میں پوچھا ہے۔ اس نے عمل کرکے بتایا ہے کہ
کاکا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور زینب کی گودی میں کھیل رہا ہے۔ چاند کی ستائیس تاریخ
سے پہلے پہلے اس کی خیر خبر تمہیں مل جائے گی۔ یہ دیکھو بیس روپے میں اس نے کتنا اچھا
تعویذ لکھ کر دیا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو بیس ہزار میں بھی لکھ کر نہ دیتا۔ اسے دستی چکی کے
ہتھے کے ساتھ باندھنا ہے۔ زینب جہاں بھی ہے کاکے کے ساتھ تمہاری طرف کھنچی چلی
آئے گی" میں حمیدہ کی باتیں سن رہی تھی اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس پگلی
کو کیا پتہ تھا کہ اس کے "بابے بوہڑ والے" کا علم ناقص اور محدود ہے۔ بیس روپے کے پر
لگا کر بھی یہ علم اس عقوبت خانے تک پرواز نہیں کر سکا جہاں کچھ درندہ صفت انسان ایک
معصوم بچے کو اپنی وحشت کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ حمیدہ کہہ رہی تھی "اللہ کرے کبھی بابے
کے منہ سے میرے لئے بھی ایسی ہی خوشخبری نکلے۔ پچھلی گرمیوں میں کہا تھا کہ اس عید پر
یوسف تجھے منا کر لے جائے گا مگر اس عید پر ڈیک نالے میں ایسا سیلاب آیا کہ پانچ روز
سارے راستے بند پڑے رہے۔ اب اس میں "بابے" کا بھی کیا قصور تھا۔ اس کمبخت
سیلاب کو بھی عین موقعے پر آنا تھا۔ اب اگلی عید پر بات پڑی ہے۔ دیکھیں کیا بنتا ہے"۔

حمیدہ شباب کی سگی بہن تھی اس کی شادی چار سال پہلے اپنے چچازاد سے ہوئی تھی
تھی۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی میاں بیوی میں ناچاقی ہوئی اور وہ میکے آبیٹھی۔ یہ تنازعہ ابھی
تک حل نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ کی خوبصورت جوانی ایک بے معنی ضد کی نذر ہوتی جا رہی
تھی۔ حمیدہ بڑی روانی سے بول رہی تھی۔ وہ بابے بوہڑ والے کی باتیں کر رہی تھی۔ (ابھی
وہی شخص تھا جسے چند روز پہلے شباب نے پرندوں سے بھرے تھیلے دیئے تھے) میں خ
ہوئے بھی کچھ نہیں سن رہی تھی اور سنتی بھی کیسے۔ میری سماعت میں تو طوفان کے شور
بجلی کے کڑاکوں اور ایک معصوم کی چیخوں کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔ حمیدہ کے جانے
کے بعد مجھے تنہائی ملی تو میں نے لیٹے لیٹے لحاف کی اوٹ لے کر لفافے میں سے خط نکالا
پڑھنا شروع کیا۔ وہی تحریر تھی۔ لکھا تھا۔

"ثنا محمود! وعدے کے مطابق تمہیں دوسرا خط لکھ رہا ہوں۔ شاید خط ملنے میں
تھوڑی سی تاخیر ہو جائے لیکن مل جائے گا۔ تمہارا بچہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے بس تھوڑی
دیر کے لئے بے ہوش ہوگیا تھا۔ اب ہوش میں ہے اور کلکاریاں مار رہا ہے۔ اس کی
کلکاریاں تم آکر سن لو تو خدا کی قسم تمہارا دل باغ باغ ہو جائے۔ ابھی اس کے ہاتھوں پر
آٹھ انگلیاں باقی ہیں۔ انگلیوں کی حد تک تمہارے پاس سوچنے کے لئے کافی وقت ہے۔
ہاں اگر کسی دفعہ خط نہ بھی مل سکے تو یہ نہ سمجھنا کہ انگلیوں کی تعداد میں گڑبڑ ہوگئی
ہے۔ ہر دو روز بعد تم ایک انگلی اپنے حساب میں سے کم کر سکتی ہو۔ باقی میری پیشکش اپنی
جگہ برقرار ہے۔ تم کل یعنی بروز جمعرات آٹھ اور دس بجے کے درمیان روہی کی پلی پر
آسکتی ہو۔ اس کے علاوہ میری وارننگ بھی اپنی جگہ برقرار ہے۔ ان خطوط کے بارے میں
کسی کو بتانے کا صرف ایک ہی مطلب ہوگا۔ اس کی موت.......... گڈ بائے۔

تمہارا خیر خواہ

میں نے خط مٹھی میں بھینچ لیا اور اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنے میں
مصروف ہوگئی۔

رات ابر آلود اور تاریک تھی۔ کماد اور مونجی کے کھیتوں کے درمیان میں پگڈنڈی
[illegible] آگے بڑھ رہی تھی۔ میرے جسم پر عام لباس کے علاوہ صرف ایک گرم چادر
تھی۔ یہ چادر حمیدہ کی تھی اور میں اس کے سرہانے سے اٹھا کر لائی تھی۔ حمیدہ میرے
ساتھ کی چارپائی پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ کیا پوری حویلی ہی سو رہی تھی۔ صرف مردانے
کے سامنے دو بندوق بردار پہرہ دے رہے تھے۔ یہ پہریدار بھی چودھری شباب نے
میری حفاظت کی خاطر مقرر کئے تھے۔ خود وہ کسی قسم کے حفاظتی انتظامات کا قائل ہی نہیں
تھا۔ وہ کہتا تھا یہ پورا گاؤں ایک دوسرے کا پہریدار ہے اور ہمیں کسی کی چوکیداری کی
ضرورت نہیں۔ ان ہی پہریداروں سے نظر بچا کر جو میری حفاظت میں مقرر تھے میں
حویلی کے عقبی حصے میں چلی آئی تھی اور ایک چھوٹے سے دروازے کی کنڈیاں گرا کر
باہر نکل آئی تھی۔ اب میرا رخ روہی نالے کی دوسری پلی کی طرف تھا۔ میں جانتی تھی کہ
ایک محفوظ پناہ سے نکل کر ایک سفاک دشمن کا لقمہ بننے کے لئے جا رہی ہوں لیکن
اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے جسم میں میری زندگی ہی کہاں تھی جو

میں خود کو کسی پناہ گاہ میں محفوظ کرتی۔ میری زندگی تو دشمنوں کے قبضے میں تھی۔ میرا بچہ .... جسے وہ درندے لخت لخت کر کے میری ممتا کا امتحان لے رہے تھے اور میری سخت جانی کی آزمائش کر رہے تھے۔ اس تاریک اور پر خطر رات میں اپنے دس ماہ کے معصوم کی ادائیں میری رہنمائی کر رہی تھیں۔ اس کی چنچل مسکراہٹ مجھے رستہ دکھا رہی تھی۔ وہ اپنے ننھے منے زخمی ہاتھ اٹھا اٹھا کر مجھے بلا رہا تھا۔ میں سرتاپا ماں تھی اور اس ان دیکھے تاریک رستے پر میرا ہر عضو آنکھ بن گیا تھا۔ آوارہ کتوں سے بچتی اور کہیں کہیں کھیتوں میں گھومنے پھرنے والے کسانوں سے کنی کتراتی میں روہی نالے پر پہنچ گئی اور پھر نالے کے ساتھ ساتھ پلی کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی میں پلی سے کوئی ایک فرلانگ دور ہی تھی کہ ایک ڈھیلی ڈھالی پگڑی والا شخص لالٹین تھامے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔

"کہاں جانا ہے بہن؟" اس نے دیہاتی انداز میں پوچھا۔ میں چادر کی اوٹ سے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری "بال پور سے آئی ہو؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا وہ بولا "میں آپ کو پہچان گیا ہوں چھوٹی جاگیردارنی! جاگیردار جی نے مجھے آپ کو لانے کے لئے بھیجا ہے"

"کون سا جاگیردار؟" میں نے رک کر پوچھا۔

"چودھری وہاب علی صاحب۔"

وہاب علی کا نام سن کر میں چکرا گئی۔ یہ میرے جیٹھ کا نام تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں۔ یہ شخص بیرون ملک مقیم تھا اور وہیں اس نے شادی کر لی تھی۔ اپنی بعض مصروفیات کی وجہ سے یہ میری شادی پر بھی نہیں آسکا تھا۔ ہاں اس کی تصویر میں نے حویلی کے البم میں اور کئی کمروں میں دیکھی تھی۔ اس کی شکل میرے مرنے والے شوہر سے بہت ملتی تھی۔ ہاں چہرہ کچھ فربہ اور مونچھیں کچھ مختصر تھیں۔ اس کی مکمل شبیہ میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ تو کیا یہ وہ شخص تھا جو درندگی کی ہر انتہا پار کر کے میرے معصوم بچے پر قیامت توڑ رہا تھا۔

"کہاں ہے یہ شخص؟" میں نے بے پناہ نفرت سے پوچھا۔

"آپ کو سامنے والے کنویں تک چلنا ہوگا" اس نے مختصر جواب دیا۔ میں نے چ

لمحے سوچا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مجھے کنویں پر لے آیا یہاں بگڑی تگڑی شکلوں والے تین "چادر پوش" اور موجود تھے ان میں سے دو کو میں پہچان گئی۔ وہ حویلی کے ہی آدمی تھے۔ ان کے پیچھے جو پرانی شیورلیٹ کار کھڑی تھی وہ بھی حویلی ہی کی تھی۔ کم ظرف مردوں کی مخصوص عادت کے مطابق انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھورا۔ پھر ایک شخص جس کا نام شاید سراج تھا مصنوعی احترام سے بولا۔

"مالکن! جاگیردار جی کو یقین تھا کہ آج آپ ضرور آئیں گی۔ چلئے وہ آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کہاں؟"

"زیادہ لمبا سفر نہیں' آدھ پون گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔"

"کہاں پہنچ جائیں گے' میرا بچہ کہاں ہے؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔ سراج نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جیسے بتانا چاہتا ہو کہ دوسرے افراد کے سامنے یہ ذکر مناسب نہیں۔ دبے ہوئے لہجے میں بولا "مالکن! ہمیں اوپر سے جو حکم ملا ہے آپ کو بتا دیا ہے۔ اب ہم حاضر ہیں۔ اگر آپ جانا چاہیں تو گاڑی میں بیٹھ جائیں۔"

میرے چاہنے یا نہ چاہنے کا تو سوال ہی کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنے لخت جگر کا نام لے کر خود کو حالات کے تیز دھارے پر پھینک دیا تھا۔ اب یہ دھارا مجھے کہیں بھی لے جاتا۔ میں گاڑی میں آبیٹھی۔ تینوں افراد سمٹ سمٹا کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

اونچے نیچے کچے راستوں پر یہ سفر کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد ختم ہوا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں دوبارہ اپنے سسرالی گاؤں کے قرب وجوار میں پہنچ چکی ہوں۔ گاڑی ایک جوہڑ کے سامنے سنگتروں اور کنووں کے باغ میں رکی۔ بہت گھنا باغ تھا۔ جگہ جگہ ڈھیروں کی صورت میں بہت سا پھل پڑا تھا۔ ہر طرف خوشبو ہی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم گاڑی سے اترے اور پیدل چلتے ہوئے ایک عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔ پختہ اینٹوں کی یہ خوبصورت عمارت ڈیڑھ دو کنال رقبے میں واقع تھی۔ کہیں قریب ہی کوئی مشین سی چل رہی تھی۔ عمارت کے اندرونی حصے میں بجلی کی روشنی دیکھی تو اندازہ ہوا کہ یہ "مشین" جنریٹر ہے۔ ہم دروازے کے سامنے پہنچے۔ دستک پر ایک خوابیدہ ملازم نے دروازہ کھولا۔ وسیع صحن

سے گزار کر مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ میرے کان اپنے بچے کی آواز سننے کے لئے بے قرار ہو گئے مگر کیا پتہ وہ یہاں تھا بھی یا نہیں؟ سبزی کاٹنے والی وہ تیز چھری جو میں نے اپنے لباس کے نیچے چھپا رکھی تھی' بری طرح میری پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔ پال پور کی حویلی سے نکلتے ہوئے نہ جانے کیوں میں نے یہ چھری پاس رکھ لی تھی۔ کس قدر حیرت کی بات تھی کہ میں جو چند ہفتے پہلے تک ایک مرغی ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی اور ایک مچھر کو انگوٹھے تلے دبانا میرے بس میں نہیں تھا کسی کو زخمی کرنے' دھمکانے یا مارنے کے لئے ایک چھری اپنے ساتھ لئے پھرتی تھی۔ درست تھا کہ ابھی تک میں نے کسی کو مارا یا زخمی نہیں کیا تھا اور نہ ہی مجھ میں اتنی ہمت تھی لیکن میں نے ایک نیت تو کی تھی۔ ایک قدم تو اٹھایا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ چند روز پہلے میں نے ننھے سلیم کو قاتلوں کے نرغے میں بے بسی سے ڈھیر ہوتے دیکھا تھا اور اس سانحے نے مجھے لاشعوری طور پر ہتھیار کی اہمیت کا احساس دلا دیا تھا۔ اس سانحے کا سبب میں ہی تو تھی جس نے اس کا پستول جوہڑ میں پھینک کر اسے ننگی جارحیت کے خونی جبڑوں میں دے دیا تھا۔ پتہ نہیں اب وہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ فرحان کے غم میں سے سلیم کی مظلومیت کا دکھ کونپلوں کی طرح پھوٹنے لگا۔ آہ......... میں نے اسے چاہ کر برباد کر دیا تھا۔ انتظار کی وہ شام جو اس نے ایک ہوٹل کے کیبن میں بیٹھ کر گزاری تھی اس کی ساری زندگی پر حاوی ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی ہی اندھیروں میں ڈوب گئی تھی۔ اسے اس شام تک لانے والا کون تھا؟ میں ہی تو تھی۔ میں ہی تو تھی جس نے اس سیدھے سادھے انسان کو اتنا پوجا تھا کہ ظلم اور قہر کے سارے دیوتا اس کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔

دفعتاً مجھے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ دروازہ کھلا اور چھ فٹ قد کا ایک کیم شحیم شخص اندر آ گیا۔ میں اپنے جیٹھ وہاب علی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ اپنی تصویروں سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ امریکہ میں رہ کر مشرقی روایات اور رہن سہن کو قطعی فراموش کر چکا ہے۔ اگر اس کا رنگ تھوڑا سا صاف ہوتا تو شاید مجھے اسے بطور پاکستانی پہچاننے میں بھی دشواری ہوتی۔ اس کی مونچھیں بالکل صاف ہو چکی تھیں۔ بال پیشانی سے اڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے فربہ جسم کو نیلی جین اور سرخ شرٹ میں سمیٹ رکھا تھا۔ صرف اس کی ہلکی براؤن آنکھیں مجھے جانی پہچانی لگیں۔ کیونکہ ان میں

واصف کی طرح نفرت اور بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ چند لمحے بے تاثر چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بولا "بیٹھ جاؤ" میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی بوتل سے گلاس بھرنے کے بعد اسے بے تکلفی سے میز پر رکھ دیا "بچہ لینے آئی ہو؟" اس کے لہجے کی نفرت اور تیزی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ "ہاں" میں نے حوصلہ جمع کر کے کہا۔

"کس کا بچہ ہے وہ؟"

"آپ کے چھوٹے بھائی کا" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"جسے تم نے اپنے کسی لگتے کے ساتھ مل کر قتل کیا ہے۔"

"یہ سب جھوٹ ہے۔"

"تو پھر سچ کیا ہے؟"

"اگر میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں تو آپ انصاف کریں گے؟"

"انصاف چاہنے والے بھاگتے نہیں' قانون سے چھپتے نہیں پھرتے۔"

"قانون کو یہاں تک پہنچنے کون دیتا ہے۔ یہاں کا قانون تو یہی ہے نا۔"

میں نے اپنے بچے کی کٹی ہوئی پوریں روئی سمیت صوفے پر رکھ دیں۔ یکایک وہاب علی کسی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ اس کا زور دار تھپڑ میرے منہ پر پڑا اور میں لڑھکتے فرش پر دور تک لڑھک گئی۔ "انصاف مانگتی ہے بدذات کمینی'۔ انصاف مانگتی ہے" وہ غرایا اور لاتوں گھونسوں سے مجھے بری طرح پیٹنے لگا۔ وہ غصے میں دیوانہ ہو رہا تھا اور نشے نے اس کی ہر ضرب کو شدید تر بنا دیا تھا۔ سبزی کاٹنے والی چھری بے وقعت شے کی طرح میرے لباس کے نیچے سے پھسل کر فرش پر لڑھک گئی۔ میں جیسے تند و تیز لہروں کی زد میں تھی۔ بخار کی شدید نقاہت کے بعد یہ تشدد مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں نیم بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ رات کسی پہر ہوش آیا۔ کمرے میں زیرو کا مدھم بلب جل رہا تھا۔ میں اکیلی تھی۔ دروازہ باہر سے بند تھا اور کھڑکیوں پر لوہے کی گرلیں تھیں۔ میں دروازہ پیٹنے لگی اور چلانے لگی "کوئی ہے...... کوئی ہے" کوئی نہیں تھا یا کوئی سنتا نہیں چاہتا تھا۔ تھک ہار کر میں کمرے کی اکلوتی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میرے پورے جسم پر چوٹیں آئی تھیں لیکن کندھے کی ضرب شدید تھی۔ گوشت پھٹ گیا تھا اور خون نے پوری

آستین بھگو رکھی تھی۔ کمرے کی سخت سردی میں اس تکلیف نے مجھے کراہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ساری رات میں نے اسی طرح جاگتے سوتے میں گزاری۔ اگلے روز ایک ملازم شخص نے آکر میری مرہم پٹی کی اور ناشتہ دیا۔ میں اس سے وہاب علی کے بارے اور اپنے بچے کے بارے پوچھتی رہی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ شخص مجھے یہاں لانے والوں میں شامل تھا۔ راستے میں ان لوگوں کا رویہ مختلف تھا لیکن یہاں پہنچتے ہی سب نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔

شام تک میں اس کمرے میں بند رہی۔ وہ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری تھا۔ میری پیاسی نگاہیں اپنے بچے کو دیکھنے کے لئے ترس رہی تھیں۔ وہ کہاں تھا' کس دیوار کے پیچھے تھا' کس چھت کے نیچے تھا' میں اس سے قریب رہ کر بھی اس سے بہت دور تھی۔ کیسا امتحان تھا' یہ کیسی آزمائش تھی...... شام کے وقت سراج مجھے کھڑکی کے پاس نظر آیا۔ میں نے اسے پاس بلایا اور اس کی منتیں کرنے لگی کہ وہ ایک بار مجھے میرے بچے کی شکل دکھا دے۔ اس نے پہلے تو یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی بچہ اس عمارت میں موجود ہی نہیں۔ پھر میرے بڑھتے ہوئے اصرار اور منت سماجت کے پیش نظر اس کے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ اس نے میرے بندھے ہوئے ہاتھوں پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔

"میں مالک کے حکم کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔"

میں نے روتے ہوئے کہا "اپنے مالک کو اس کے بچوں کا واسطہ دو اور اس سے کہو مجھ پر اور ظلم نہ کرے۔"

سراج سوچتا ہوا اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ وہاب علی کا تو کوئی بچہ ہی نہیں' میں اسے کس کا واسطہ دے رہی ہوں۔ حویلی میں اکثر یہ باتیں ہوا کرتی تھیں کہ وہاب علی بے اولاد ہے۔ یہ اس کی محرومی نہیں آئیڈیالوجی تھی۔ میں نے اس کے ایک خط میں خود پڑھا تھا جو اس نے اپنی ماں کے نام کینیڈا میں لکھا تھا۔ وہ بچوں کو جھنجھٹ سمجھتا ہے اور اسے فی الحال ان کی خواہش بھی نہیں۔ وہ ان مغرب زدہ لوگوں میں سے تھا جو صرف اپنی ذات کے لئے جینا چاہتے ہیں...... اور آج میرا بیٹا اس بے حس و بے درد شخص کے قبضے میں تھا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا یہ اس جیسا سنگدل

ہی کر سکتا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میری رحم کی کوئی درخواست اس کے لئے قابل قبول ہوگی مگر تھوڑی دیر بعد میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ سراج کوئی چیز کمبل میں لپیٹے میری طرف چلا آ رہا ہے۔ میری حسیات سمٹ کر میری آنکھوں میں آ گئیں۔ میں کھڑکی کی آہنی گرل سے چپک کر کمبل کی طرف دیکھنے لگی۔ مجھ سے کوئی دس فٹ دوری پر سراج ایک بلب کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک جانب سے کمبل ہٹایا۔ میرے فرحان کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ میرا پھول' میرا چاند میرا شہریار سو رہا تھا۔ بلب کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ اور بھی زرد نظر آ رہا تھا۔ پتلے ہونٹ' ننھی سی ناک اور لانبی پلکیں میرا دل سو ٹکڑے ہو گیا۔ جی چاہا ہوا بن کر گرل کے آہنی پیچ و خم سے گزر جاؤں اور اپنے لال کو سینے سے چمٹا لوں۔ میں نے اپنی دونوں بانہیں گرل میں سے نکال دیں اور بے حد عاجزی سے کہا۔

"اسے میرے پاس لاؤ' خدا کے لئے میرے پاس لاؤ۔"

"نہیں بی بی! صاحب کا حکم نہیں" اس نے خشک لہجے میں کہا۔

اس عمارت میں آنے کے بعد سراج نے مجھے مالکن یا چھوٹی چودھرانی کی بجائے بی بی کہنا شروع کر دیا تھا۔ میں اپنے نالوں کو سینے میں دبائے یک ٹک فرحان کو دیکھتی رہی۔ خدا کا شکر تھا کہ وہ سویا ہوا تھا۔ اگر وہ جاگ رہا ہوتا اور اپنی معصوم آنکھوں میں حسرت بھر کر میری طرف دیکھتا' منہ بسورتا اور سراج کی بانہوں میں مچلتا تو میں مر نہ جاتی؟ اس جگہ میری موت واقع نہ ہو جاتی؟ کچھ دیر بعد سراج اسے لے کر واپس چلا گیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ضبط کا ہر بند ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے دروازے پر بے تحاشہ مکے برسائے اور وہاب علی کو خدا رسول کے واسطے دیئے کہ وہ میرے بچے کو چھوڑ دے۔ میری ہر فریاد سنگلاخ دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ آخر میں بے دم ہو کر مسہری پر گر پڑی اور درد کی ان لہروں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی جو میرے زخمی کندھے سے اٹھ رہی تھیں۔ درحقیقت یہ [illegible] زخم تھا جو کوئی ڈیڑھ ہفتہ پہلے میرے شوہر کی چلائی ہوئی گولی سے آیا تھا۔ فرحان کو بچانے کی کوشش میں میں ریوالور کی زد میں آ گئی تھی اور گولی کندھے کا گوشت پھاڑتی گزر گئی تھی۔ یہی زخم رات وہاب علی کے ہاتھوں کھل گیا تھا......

اچانک دروازے کے پاس آہٹ ہوئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دیوار گیر کلاک پر
دوڑائی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ دروازے کے باہمی قفل میں دو دفعہ چابی گھ
اور وہاب علی اندر آگیا۔ اندر آکر اس نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا۔ صوفے پر بیٹھ کر
دیر عینک کے پیچھے سے مجھے گھورتا رہا' پھر بولا۔

"ہیلو ثنا محمود کیسی ہو؟" اس کی آواز میں آج عجیب طرح کا لوچ تھا۔ اس سے
کہ میں کچھ بولتی اسے جیسے کچھ یاد آیا۔

"ہاں یہ تمہاری چھری کل رات گر گئی تھی" اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ
اور چھری نکال کر میرے سامنے تپائی پر رکھ دی۔

میرے اور اس کے درمیان پڑی یہ چھری بالکل بے کار چیز لگ رہی تھی۔ اگر
مجھے قتل کرنا چاہتا تو شاید ایک ہاتھ سے گلا گھونٹ کر ہلاک کر سکتا تھا اور اگر میں اسے
نقصان پہنچانا چاہتی تھی تو یہ چھری اس کے لئے قطعاً ناکافی تھی۔ یہ تو ایسا ہی تھا
گرانڈیل ہاتھی کو اعشاریہ پچیس کی گولی سے ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں
بے بسی پر سسک اٹھی۔

اس نے اطمینان سے اپنی دونوں ٹانگیں تپائی پر رکھیں اور بولا "قتل تو تم چھ
کے بغیر بھی کر سکتی ہو۔"

اس کے لہجے میں نہایت سفاک قسم کا طنز پوشیدہ تھا۔ میں نے ٹھٹھک کر اس ان
نما حیوان کی طرف دیکھا اور ذہن میں خطرے کی ان گنت گھنٹیاں بج اٹھیں۔ وہاب علی
اپنی جیکٹ کی جیب سے چھوٹی بوتل برآمد کی اور سیاہی مائل ہونٹوں سے لگا کر گھ
گھونٹ پینے لگا۔ وہ شکل سے ہی بلا نوش دکھائی دیتا تھا۔ وہ انسان کی کھال میں درند
اور میں مامتا کی ڈور سے بندھ کر اس کی کچھار میں چلی آئی تھی۔ نہ جانے کیوں اچانک
پر وہی کیفیت طاری ہونے لگی جو واصف کو اپنے سامنے غضب ناک دیکھ کر طاری ہو
کرتی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں کی سکت جاتی رہی اور میں خود کو ایک احمق اور کمزور عو
محسوس کرنے لگی۔ مجھے لگا جیسے واصف دوبارہ زندہ ہو گیا ہے اور مجھے جرم بے گنا
سزا دینے کے لئے سراپا عتاب بنا ہوا ہے۔ مجھے اور کچھ نہیں سوجھا اور میں چارپائی
اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔ اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ چٹخنی تک پہنچتا' وہاب

لپک کر اسے پکڑ لیا۔

"خدا کے لئے مجھے جانے دو...... مجھے اپنے بچے کے پاس جانے دو" میں نے فریاد
کی۔

اس نے جھومتے ہوئے مستی خیز انداز میں کہا "یہ معاملہ اتنا آسان نہیں' مجھے
سوچنے کا موقع دو۔"

اس کا طرز تخاطب' بے غیرتی کا تیر تھا جو میرا سینہ چھلنی کر گیا۔ میں نے اپنا بازو
چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ ہاتھ لہرا کر بولا "ٹرائی ٹو انڈر سٹینڈ' ڈونٹ بی فلش' او کم
آن...... کم آن" اس کے اندر مغرب بول رہا تھا۔ موقع پرست' ننگا اور وحشی مغرب۔
یہ "مغرب" کسی کا بھائی نہیں تھا' کسی کا غم خوار نہیں تھا' اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں
تھا۔ میرے اندر مزاحمت کرنے والی عورت جاگ اٹھی۔ میں نے قوت صرف کر کے اپنا
بازو وہاب کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اسے جھٹکا لگا اور بوتل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور
صوفے پر جا گری۔ اس کا نشہ جیسے ہرن ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر خونی نظروں سے مجھے دیکھتا
رہا' پھر دروازہ کھول کر اور اسے باہر سے مقفل کر کے چلا گیا۔

جاتے جاتے وہ تپائی پر رکھی ہوئی چھری بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ میں بے دم ہو کر
چارپائی پر گر گئی۔

شاید دس پندرہ منٹ گزرے تھے جب مجھے فرحان کے رونے کی آواز سنائی دی۔
میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جا
رہی تھی۔ غالباً وہ کسی نزدیکی کمرے میں تھا۔ میرے کانوں میں پگھلا سیسہ انڈیلا جانے لگا۔
میں نے ہونٹ بھینچ کر اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ مگر یہ آواز تو ہر رکاوٹ کو پار
کر کے براہ راست میرے دل میں گونج رہی تھی۔ میں بے قرار ہو کر اٹھی اور ایک بار پھر
دروازہ پیٹنے لگی۔ مجھ پر جیسے دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ میں
کتنی زور سے دروازے پر مکے برسا رہی ہوں۔ دروازے کے سفید تختے پر خون کے دھبے
نمودار ہوئے تو پتہ چلا کہ انگلیوں سے کھال چھل گئی ہے۔ چیخ چیخ کر میرا گلا بیٹھ گیا اور میں
نڈھال ہو کر لڑھکتے فرش پر گر گئی۔

وہ رات میری زندگی کی بھیانک ترین رات تھی۔ فرحان رہ رہ کر ساری رات

روتا رہا اور میں اس کمرے میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتی رہی۔ میں نے آہ و پکار کی روئی چلائی' دیواروں سے سر ٹکرایا لیکن کسی نے مجھ بدنصیب پر رحم نہیں کھایا۔ لگتا تھا ان دیواروں میں رہنے والا ہر شخص گونگا اور بہرہ ہے۔ کہتے ہیں جہنمی جہنم میں ہزار ہا سال خدا کو پکارتا رہے گا اور نامعلوم زمانوں بعد باری تعالیٰ ایک بار اس پکار کا جواب دے گا۔ میری وہ رات بھی ایک ایسے ہی جہنم میں گزری تھی۔ میں پکار پکار کر ہار جاتی تھی تو دل ہی دل میں کہتی تھی۔

"میرے لال! میں تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتی' مجھے معاف کر دے' میں مجبور ہوں' خدا کے لئے چپ ہو جا...... خدا کے لئے سو جا۔"

...... اور پھر صبح ہوئی۔ اس رات کی صبح جو ہزار راتوں پر بھاری تھی۔ فرحان تھک کر سو گیا یا شاید میری طرح اس کا بھی گلا بیٹھ چکا تھا۔ آج مجھے ناشتہ دینے کے لئے دروازہ بھی نہیں کھولا گیا۔ کھڑکی کی گرل کے اندر سے ہی کچھ ڈبل روٹی اور چائے کمرے کے اندر رکھ دی گئی۔ ناشتے کا ہوش کسے تھا اور میں کیوں کرتی ناشتہ؟ جب میرے دودھ پر کسی کا حق باقی نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے سراج نظر آیا۔ کھڑکی کے پاس پہنچا تو ادھر ادھر دیکھ کر گرل کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ "بی بی! یہ نیا مالک بڑا ظالم ہے۔ اگر آپ کسی طرح اپنے بچے کی جان بچا سکتی ہیں تو بچا لیں' جو بھی یہ کہتا ہے مان لیں۔ مجھ سے تو اب سب کچھ دیکھا نہیں جاتا۔ میں تو بیماری کا بہانہ کر کے جا رہا ہوں یہاں سے۔"

میں نے کہا "سراج! اتنے بے غیرت کیوں ہو گئے ہو تم سب' کیا تم نے خدا کو جان نہیں دینی' تمہارے بھی تو بچے ہوں گے۔ کس طرح برداشت ہو رہا ہے تم سے یہ ظلم؟"

"نہیں ہوتا بی بی' اسی لئے تو جا رہا ہوں۔"

میں نے روتے ہوئے کہا "کچھ اور نہیں کر سکتے تو...... پولیس کو ہی اطلاع دے دو۔ میرے میکے تک ہی خبر پہنچا دو......"

وہ سرتاپا کانپ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کو پہلے کبھی اتنا خوفزدہ نہیں دیکھا تھا۔ "نہیں بی بی جی' یہ نیا مالک کسی اور ہی ٹائپ کا شخص ہے' بس کچھ نہ پوچھیں جی" اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا "پرسوں میرے چچازاد بھائی رمضان نے آپ کے بچے کی انگلی کاٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس ظالم نے اس کا پورا پنجہ ٹوکے سے کٹوا دیا۔ وہ دیکھیں' کیاری کے پاس ابھی تک پڑا ہوا ہے۔"

میں نے سراج کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ دور صحن کے کونے میں ایک بلی کسی کالی سی چیز پر منہ مار رہی تھی۔ میرا دل اچھل کر رہ گیا اور نگاہ خود بخود اس شے سے ہٹ گئی۔ سراج کہہ رہا تھا "اس نے اٹھانے کی اجازت بھی نہیں دی۔ کہہ رہا تھا' یہیں پڑا رہنے دو' خود ہی کتے کھا جائیں گے" سراج کی باتیں سن کر میرا سر گھوم رہا تھا۔ وہ بولا

"بی بی جی! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آپ ہی بتائیں میں آپ کی کیا مدد کروں!"

میرے سینے میں کوئی گولا سا گھومنے لگا۔ میں نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

"اچھا جی رب راکھا" سراج نے آزردہ لہجے میں کہا اور برتن اٹھا کر تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔

وقت پل پل سرکتا رہا۔ سہ پہر تین بجے کے قریب دروازے پر آہٹ ہوئی۔ پھر پٹ کھلے اور کوئی عورت جلدی سے اندر آ گئی۔ یوں لگا جیسے اسے کسی نے دھکا دیا ہے۔ اس کے پیچھے دروازہ فوراً ہی مقفل ہو گیا۔ عورت نے رخ میری طرف کیا تو میں اس کی صورت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ زینب تھی۔ اس کے سر پر ایک سفید پٹی بندھی تھی اور کپڑے بے حد میلے ہو رہے تھے۔ میں حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ زینب کے ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے اور صابن کی ایک ٹکیہ تھی۔ اس نے یہ چیزیں تپائی پر رکھیں اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کتنی ہی دیر مجھ سے چمٹی وہ اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے ایک پاؤں پر ابھی تک پٹی موجود تھی۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"بہن! مجھے معافی دے دے' میں مرن جوگی تیرے کاکے کو بچا نہیں سکی۔ میں نے تیرے کاکے کو لے کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ مسجد کے پیچھے والی گلی سے ہو کر میں نمبردار مشتاق کے کھیتوں میں نکل گئی تھی۔ غنڈے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ میرا پیر زخمی نہ ہوتا تو شاید میں ان کی پہنچ سے نکل جاتی۔ اشفاق کے کھیتوں میں انہوں نے مجھے جا لیا۔ ایک نے پورے زور سے میری سر پر لاٹھی ماری۔ میں چکر کھا کر گر گئی۔ انہوں نے مجھے گالیاں دیں اور بچہ مجھ سے چھین لیا۔ اتنے میں ایک کار میرے پاس آ کر رکی۔ انہوں نے بچے کو کار کی پچھلی سیٹ پر پھینک دیا۔ میں تو بس بے ہوش ہی ہو چکی تھی۔ مجھے بھی

تھسیٹ گھسات کر انسوں نے کار میں ڈال دیا۔ کافی دیر چلنے کے بعد کار اس باغ میں داخل ہوئی اور کوٹھی کے سامنے آ کر رک گئی۔ اب پچھلے چھ دنوں سے میں یہاں ہوں......."

زینب یوں بات کر رہی تھی۔ جیسے یہ سب کچھ ابھی ابھی اس کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور رنگ مٹی کی طرح ہو رہا تھا۔ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا وہ ایک بہادر عورت تھی۔ چند روز پہلے اپنے گھر میں اس نے جس طرح اپنی اور ہماری مرہم پٹی کی تھی اور ایک انسانیت سوز المیے کا شکار ہونے کے باوجود جس طرح اپنے ماتھے پر بل نہیں آنے دیا تھا وہ سب مجھے یاد تھا....... مگر آج یہ بہادر عورت پتے کی طرح لرز رہی تھی اور اس کی میلی آنکھوں میں خوف کے آنسو تھے۔ وہ بولی "یہ لوگ بڑے سخت ہیں بہن! بالکل جانور ہیں....... اور....... اور کاکے کے ساتھ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے....... بس کچھ نہ پوچھو۔ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی' پتہ نہیں وہ اسے کیا کرتے ہیں۔ وہ معصوم ساری ساری رات چیختا رہتا ہے۔ میرا تو کلیجہ ٹکڑے ہو گیا ہے ان چھ دنوں میں۔"

اس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے باندھ دیے "یہ دیکھ بہن! میرے جڑے ہوئے ہاتھ' مجھے نہیں پتہ کیا ہو جائے گا؟ یہ تیرے سسرال والے بڑے ظالم لوگ ہیں۔ ان میں ایک سے بڑھ کر ایک جلاد ہے۔ کاش تو ان لوگوں میں نہ آئی ہوتی۔ اب تو جو بھی ہے بھگتنا پڑے گا۔ جو یہ کہتے ہیں مان لے اور اگر بچا سکتی ہے تو اپنی اور اپنے بچے کی جان بچا لے......."

زینب مجھے یہاں کے حالات سے باخبر کر رہی تھی اس نے بتایا کہ "وہاب نامی شخص اس مکان کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ یہاں آٹھ دس مسلح آدمی اور ہیں۔ اسے روزانہ ان کے لئے کوئی سو روٹیاں پکانی پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پورا دن بیل کی طرح مصروف رہتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے۔ یہاں ایک خانساماں اور دو ملازم بھی ہیں لیکن وہ صرف چودھری وہاب کا کام کرتے ہیں۔ زنیب نے روتے ہوئے بتایا "چودھری وہاب کہتا تھا ہماری تجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تو اسی طرح محنت سے کام کرتی رہی تو دو تین ہفتے بعد تجھے چھوڑ دیں گے....... پر ان کا کوئی اعتبار نہیں بہن! نشہ کر لیتے ہیں تو ان کی آنکھیں بڑی خوفناک ہو جاتی ہیں۔"

میں نے کہا "زینب! تو مجھ سے بڑی ہے اور عقل والی بھی ہے تو ہی بتا میں کیا کروں' کہاں جاؤں؟"

میرے پاس بھی سوال تھے اور زینب کے پاس بھی' جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ زینب نے کپڑوں کا جوڑا میرے ہاتھ میں تھمایا اور کہا "منہ ہاتھ دھو کر پہن لے" تین چار دن سے مجھے اپنے تن من کا ہوش نہیں تھا۔ بال پریشان تھے۔ لباس جگہ جگہ سے ادھڑا اور پھٹا ہوا تھا۔ کندھے سے بہنے والا خون کپڑوں پر اکڑ کر رہ گیا تھا۔ زینب کے اصرار پر میں نے ملحقہ غسل خانے میں جا کر منہ پر چند چھینٹے مارے اور بال باندھ کر لباس بدل لیا۔ لیکن بدلتے ہوئے کندھے کے زخم نے خون کے آنسو رلا دیے۔ بہرحال جیسے تیسے یہ بھی گزر گزری۔

اس دوران دروازے پر زور سے دستک ہونے لگی۔ کسی نے زینب کو مخاطب کر کے کہا۔

"او لنگڑی! کیا اندر الف لیلیٰ شروع کر دی ہے۔ چل باہر آ جا فٹافٹ۔"

زینب نے گھبرا کر میرے خون آلود کپڑے سمیٹے اور چہرے پر ان گنت خدشے لئے باہر نکل گئی۔ دروازہ پھر مقفل ہو گیا۔

اور پھر دوسری رات آ گئی۔ یہ رات میرے مقدر کی طرح تاریک تھی۔ میں نے زیرو کا بلب بھی روشن نہیں کیا تھا اور گہری تاریکی میں چارپائی پر لیٹی تھی۔ میرے اندر ایک خوفناک جنگ جاری تھی۔ یہ جنگ ایک ماں اور ایک عورت کے درمیان تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ زندگی میں کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک شام میرے نیم مردہ جسم کو ایسے خوفناک فیصلے کی سولی پر لٹکنا ہو گا۔ کاش میں مشت خاک ہوتی۔ نہ مجھ میں شعور ہوتا نہ میرا کسی سے رشتہ ہوتا۔ رات سرد تھی اور مجھے ذرا سردی لگ رہی تھی۔ کیا آج رات پھر میرے کانوں کو فرحان کی چیخوں کا عذاب سہنا ہو گا۔ کیا آج کی رات پھر ہزار راتوں کو اپنے اندر سمیٹ لے گی۔ میری سماعت ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ آخر بھاری قدموں کی مخصوص آواز آئی۔ دروازے کے قفل میں چابی گھومی اور وہاب علی اندر آ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے لائٹ آن کی۔ کچھ دیر مخمور نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ یہ نظریں مجھ سے کہہ رہی تھیں "اے بے وقوف عورت! میری مٹھی

میں تیرے بچے کا سکون بند ہے۔ یہ مٹھی کھولوں گا تو ہر طرف آہ و پکار گونجنے لگے گی
تو جانتی ہے سفاکی میں میرا نام ہے۔ میں شیطان مردود ہوں اور میرے شر کی انتہا تیرے
تصور کی پرواز سے بہت اونچی ہے" کمرے کی خاموشی نہایت معنی خیز تھی۔ وہ فاتحانہ انداز
میں مسکراتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا........

اب آگے اور کیا لکھوں۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ نہیں چھپاؤں گی
اور میں آپ سے کچھ چھپا بھی نہیں رہی۔ لیکن قلم میں اتنی ہمت نہیں کہ مزید تفصیلات
بیان کر سکوں...... ایسی پستی میں گرنا کون گوارا کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے جس کے پاس
کوئی چارہ نہیں رہتا جو چاروں طرف سے گھر جاتا ہے' جس کے لئے زندگی اور موت برابر
ہو جاتی ہے۔ وہ سب کچھ مجھے ایک دہشت ناک خواب کی طرح یاد ہے۔ نہ میں زندوں
میں تھی اور نہ مردوں میں۔ پھر وہاب نے ہوس کے بستر پر مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔
ایک دوپہر میں نے وہاب سے کہا تھا۔

"وہاب! اپنا وعدہ پورا کرو' میرا بچہ مجھے لوٹا دو۔"

وہی سفاک مسکراہٹ وہاب کے چہرے پر ابھری جو اسے انسان سے زیادہ ایک
حیوان سے مشابہ کرتی تھی۔ سگار کا ایک گہرا کش لے کر اس نے کہا۔

"ڈونٹ وری شا محمود! میں وعدے کی خلاف ورزی کرتا ہوں نہ کسی کو کرنے
دیتا ہوں۔ مغرب میں یہی تو چند ایک اصول ہیں جو اسے مشرق سے ممتاز کرتے ہیں۔"

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"کل کسی وقت" اور وہ بھاری قدموں سے ٹھک ٹھک فرش بجاتا باہر چلا گیا۔

اپنے بچے کی صورت دیکھنے کے لئے اب مجھے کل تک اور انتظار کرنا تھا۔
عجیب بات ہے انتظار کی گھڑیاں جب مختصر رہ جاتی ہیں تو اور بھی کٹھن ہو جاتی ہیں۔ جیسے
جیسے شام ہوئی اور پھر گھٹا ٹوپ تاریکی نے ہر شے کو ڈھانپ لیا۔ میں اب کمرے کا بلب
روشن نہیں کرتی تھی۔ روشنی سے مجھے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ بڑا سکون ملتا تھا
تاریکی کا حصہ بن کر...... دیوار گیر کلاک کی ٹک ٹک سست گام ازلی لمحوں کو آگے
طرف دھکیلتی رہی۔ غالباً دس گیارہ کا وقت تھا جب کسی نے دروازے کے قفل میں
آواز چابی گھمائی اور آہستگی سے اندر آگیا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ وہاب

نہیں تھا۔ شاید اس کا کوئی کارندہ تھا یا دوست۔ اس نے دروازہ اندر سے مقفل کیا تو میں
اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ انجانے خدشے جاگ اٹھے۔

"کون؟" میں نے زخمی لہجے میں ڈوبی ہوئی سرگوشی کی۔

"شی" کی طویل آواز آئی۔ نووارد مجھے خاموش ہونے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس
نے چند قدم بڑھا کر کھڑکی کا پردہ برابر کیا اور پھر لائٹ آن کر دی۔ مجھ سے دو فٹ کی
دوری پر ایک چادر پوش شخص کھڑا تھا۔ چادر کے نیچے سے اس کی سفید شلوار اور کالی
جوتی نظر آ رہی تھی۔ اس کی عمر پینتیس چالیس کے درمیان تھی۔ کنپٹیوں کے بال سفید
ہو چکے تھے۔ اس کے چہرے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ مجھے اپنا خوف کم ہوتا محسوس
ہوا۔ وہاب کے قہرناک چہرے کی دھوپ میں جلنے کے بعد یہ چہرہ مجھے چاند کی مانند ٹھنڈا اور
مہربان لگا۔

"بیٹھ جاؤ بی بی" اس نے دیہاتی لہجے میں کہا "مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"
میں بیٹھ گئی۔ وہ ایک کرسی تک گیا اور اسے گھسیٹنے کی بجائے بڑے آرام سے اٹھا
کر چارپائی کے پاس لے آیا۔ اس پر بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں بولا "میرا نام رحمت ہے جی'
اگر آپ کو ڈر نہ لگے تو میں یہ بتی بجھا دوں!"

ایک اجنبی مرد کے ساتھ اندھیرے مقفل کمرے میں بیٹھنا ایک جوان عورت کے
لئے کتنا دشوار تھا۔ مگر میں ایسے حالات سے گزر چکی تھی کہ اب کچھ بھی میرے لئے عجیب
نہیں رہا تھا۔ دوسرے رحمت کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں خاموش ہو کر رہ
گئی۔ خاموشی کو نیم رضامندی جان کر اس نے بتی بجھا دی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد
اس کی لرزاں سرگوشی فضا میں ابھری۔

"بی بی جی! میں نے زینب کو یہاں سے نکال دیا ہے۔ اب آپ کو نکالنے آیا ہوں۔
بس تھوڑی دیر ٹھہر جائیں۔ منشی خان ٹھیک گیارہ بجے افیم کا سوٹا لگا کر سو جائے گا۔ میں
کمرے میں جا کر آپ کے بچے کو اٹھا لاؤں گا۔ پھر آپ پچھلے دروازے سے باہر نکل
جائیں۔"

میں نے بے پناہ حیرت سے رحمت کی بات سنی۔ زینب کی رہائی کی خبر میرے لئے
بالکل غیر متوقع تھی۔ میں نے پوچھا "اب کہاں ہے زینب؟"

وہ بولا "بی بی جی! ذرا آہستہ بولیں....... زینب اس وقت باغ سے باہر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے کہ آپ کو لے کر کہاں جانا ہے اور کیسے جانا ہے۔"

"کک....... کوئی خطرہ تو نہیں؟" میرے اندر ممتا کی بزدلی عود کر آئی۔

"خطرہ تو ہے بی بی جی، مگر جان بچانے کی کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔"

رحمت نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے کہی تھی کہ میرے اندر بے نام وسوسے جاگ اٹھے۔ میں نے کہا "مگر چودھری وہاب نے تو مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ کل تک مجھے اور میرے بچے کو چھوڑ دے گا۔ ہم دونوں کے درمیان سب کچھ طے ہو چکا ہے۔"

"بڑی بھولی ہیں بی بی جی آپ....... آپ کو کچھ پتہ نہیں، یہ وہاب کس شیطان کا نام ہے۔ میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا لیکن یہ آپ سوچیں بھی نہ کہ یہ شخص آپ کو یہاں سے زندہ نکال دے گا۔"

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ننھے فرحان کی صورت آنکھوں میں گھومنے لگی۔ رحمت بولا "یہ نیا مالک بڑی کتی شے ہے بی بی جی، ہم تو حیران ہو رہے ہیں اس کے کرتوت دیکھ دیکھ کر۔"

میں نے کہا "لیکن اس نے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میرا بچہ مجھے دے دے گا۔"

"ضرور دے گا، لیکن اس نے یہ وعدہ تو نہیں کیا کہ آپ کی جان بخشی بھی کر دے گا....؟..... زینب تو شاید آٹھ دس دن اور جی لیتی لیکن آپ....... خیر چھوڑیں اس بات کو" ایک لمحہ خاموش رہ کر اس نے کہا۔

"آپ زخمی تو نہیں؟" میرا مطلب ہے آپ کو تین چار کوس پیدل چلنا ہوگا۔ یہ ایک گرم چادر میں ساتھ ہی لے آیا ہوں۔" اس نے ایک ٹھنڈا سا وزنی کپڑا میری جھولی میں رکھ دیا۔

رحمت کی باتیں نہایت خوفناک تھیں مگر اس سے بھی خوفناک بات یہ تھی کہ ان باتوں میں سچائی کی جھلک تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہاب جھوٹا ہے اور یہ شخص سچا۔ اگر یہ سچا نہ ہوتا تو میرے بچے کے لئے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے محروم نہ ہوتا۔ سراج نے اسی کے بارے میں بتایا تھا کہ اس نے وہاب کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا اور وہاب

نے ٹوکے میں دے کر اس کا پنجہ کٹوا دیا تھا۔ بعد میں زینب نے بھی یہی بات بتائی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ شخص رحمت ہی نہیں، رحمت کا فرشتہ بھی ہے جو مجھے اس عذاب سے نجات دلانے کے لئے حکم ربی سے یہاں پہنچا ہے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ تاریکی ہم دونوں کے درمیان ایک بلند و بالا دیوار کی طرح حائل تھی۔ اس دیوار کی دونوں طرف ہم اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ آئندہ لمحوں سے وابستہ اندیشے خوفناک اژدہوں کی طرح چنگھاڑ رہے تھے۔ دیوار گیر کلاک کی چمک دار سوئیاں دھیرے دھیرے بارہ کے ہندسے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اچانک اندھیرے میں رحمت کی آواز ابھری۔

"بی بی جی! یہ....... یہ زینب سے آپ کی جان پہچان کیسے ہوئی؟"

رحمت کے سوال نے مجھے حیران کر دیا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زینب کو بہت پہلے سے جانتا ہے۔

زینب کا لفظ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں جو ہلکی سی جھجک نمودار ہوئی اس نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"کیا تم زینب کو جانتے ہو؟" میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

"جی ہاں!" اس نے کراہ کر کہا "پیچھے سے ہم دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں بلکہ ہمارے گھر ایک ہی گلی میں تھے۔"

میں نے پوچھا "زینب نے تم سے میرا ذکر کیا تھا؟"

"کچھ زیادہ بات نہیں ہو سکی جی بس اس نے ایک دن چلتے چلتے اتنا بتایا تھا کہ آپ اس کی کوئی سہیلی ہیں۔ چودھری وہاب علی سے آپ کے رشتے داری ہے۔ اس وقت آپ یہاں آئی بھی نہیں تھیں۔ پانچ چھ دن پہلے کی بات ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ چودھری کے قبضے میں جو بچہ ہے وہ آپ کا ہے اور میں اسے کسی طرح بچانے کی کوشش کروں۔"

"میرا بچہ کیسا ہے رحمت!" میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے جی، ہاتھ کے زخم اب ٹھیک ہیں۔ سارا دن سویا رہتا ہے۔"

میں نے کہا "اور تمہارے ہاتھ کا کیا حال ہے؟"

"یہ....... یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر آپ کو کس نے بتایا؟"

"زینب نے اور اس سے پہلے تمہارے بھائی سراج نے' تم نے میرے فرحان کی جان بچائی
ایک انگلی بچانے کے لئے اپنی پانچوں انگلیاں کٹوائیں رحمت...... میں کس منہ سے تمہارا
شکریہ ادا کروں!" میں ہچکیوں سے رونے لگی۔

وہ میرے رونے سے گھبرا کر بولا "آہستہ بی بی جی...... آہستہ...... کوئی سن لے
گا۔"

میں نے دوپٹہ منہ میں دبا کر آواز روک لی۔ رحمت جذباتی لہجے میں بولا "میں نے
اپنی مری ماں کی قسم کھائی ہوئی ہے کہ آپ تینوں کو یہاں سے نکال کر چھوڑوں گا۔ اس
کے بعد یہ حرامزادہ انگریز میرے ٹوٹے بھی کروا دے تو پرواہ نہیں" رحمت کی باتوں میں
کسی پرانی کہانی کے زخم مہک رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھڑی کی بڑی سوئی چھوٹی پر سبقت لے گئی اور بارہ کے ہدف کو
چھونے لگی۔ رحمت اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں جوتی پہن لوں
اور چادر کو جسم کے گرد لپیٹ کر گرہ دے لوں۔ میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ میرا
دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا یہ قدم میری مصیبتوں
میں اضافہ کرے گا یا کمی۔ رحمت دروازے سے کان لگا کر کچھ دیر سن گن لیتا رہا۔ پھر اس
نے ہاتھ بڑھا کر بتی جلا دی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا' وہ خاصا پراعتماد دکھائی دے رہا تھا۔
اس نے چادر کے نیچے بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابی نکال لی۔ اس کا دوسرا ہاتھ گردن
سے بندھی پٹی میں جھول رہا تھا۔ اس نے چابی سوراخ میں ڈالی اور آواز پیدا کئے بغیر قفل
کھول دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر سے آستین تھوڑا سا کھسک گئی۔ میں اس کے
پاس ہی کھڑی تھی۔ تقریباً تین فٹ کی دوری پر۔ بلب کی روشنی میں اتفاقاً میری نگاہ اس
کلائی پر پڑ گئی۔ وہاں پکی نیلی روشنائی سے ایک لفظ لکھا ہوا تھا۔ ایسے الفاظ عموماً میلوں
ٹھیلوں میں لوگ اپنی جلد پر لکھواتے ہیں۔ رحمت کی جلد پر لکھا ہوا یہ لفظ اس کے کردار
کی بہت سی گرہوں کو کھول گیا۔ رحمت نے مجھے کوئی کہانی نہیں سنائی تھی۔ صرف اس
کے لہجے نے تھوڑی دیر پہلے ایک چھوٹا سا اشارہ دیا تھا اور اب اس کی کلائی پر کندہ
اس اشارے کو وسیع و عریض معنی پہنا رہا تھا۔ کلائی پر زینب لکھا تھا اور ایک چھوٹے
دل کے ساتھ تیر کا نشان بنا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے یہ لفظ اور یہ نشان میری نگاہ

اور دوسرے ہی لمحے رحمت بتی بجھا کر اور دروازہ کھول کر باہر کی تاریکی میں رینگ،
گیا۔ میں سب کچھ فراموش کر کے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالنے لگی اور اس کی واپسی کا انتظار
کرنے لگی...... یہ انتظار طویل ثابت ہوا۔ کوئی دس منٹ بعد کھڑکی کی گرل پر ہلکی سی
دستک ہوئی میں نے پردہ کھسکا کر دیکھا۔ دوسری طرف رحمت کا ہیولا تھا۔ اس نے سرگوشی
میں کہا۔

"وہ کمینہ منشی خاں' ابھی جاگ رہا ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کرنا ہو گا۔"

میں لرزتے قدموں پر وہیں کھڑی رہی۔ لمحے سیکنڈوں میں اور سیکنڈ منٹوں میں
بدلتے رہے۔ اچانک میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کوئی دس پندرہ گز کی دوری سے
ایک کراہ سنائی دی اور پھر کوئی دھڑام سے کچی زمین پر گر گیا...... کراہ سے پہلے بھی ایک
آواز آئی تھی اور میں اس آواز کو کسی حد تک پہچان گئی تھی۔ وزنی لکڑی یا لوہے سے
کسی کے سر پر زوردار ضرب لگائی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کام شروع ہو چکا ہے۔ میرا
اندازہ کہہ رہا تھا کہ چوٹ کھا کر گرنے والا رحمت نہیں کیونکہ گرنے کی آواز کے بعد ایک
اور پھر گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ غالباً رحمت نے منشی خاں کو نشانہ بنایا تھا۔ تین چار منٹ
میں نے سولی پر لٹکتے گزار دیئے۔ آخر دروازے کے پاس تیز قدموں کی آواز آئی۔ رحمت
نے دروازہ کھولا اور اندر آ گیا۔

گہری تاریکی کے باوجود مجھے پتہ چل رہا تھا کہ وہ سخت گھبرایا ہوا ہے۔ مرتعش آواز
میں بولا "بی بی جی! چلیں۔"

"کہاں؟"

"میں بتاتا ہوں۔"

"لیکن میرا بچہ!"

"بس...... بچے کو رہنے دیں۔ وہ اس وقت نہیں مل سکتا۔ کم از کم اپنی زندگی بچا
لیں......"

اس کے لہجے نے میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی۔ کتنا سنگ دل ہو گیا تھا وہ۔
کتنی بے رحمی سے میرے دل کو مسل رہا تھا۔ مرد تھا نا' اسے کیا معلوم تھا ماں کیا ہوتی
ہے۔ اپنے شیرخوار کے بغیر اسے کہیں سے جانا کیسا لگتا ہے۔ وہ تو مجبوراً اکیلی بازار بھی

جاتی ہے تو اس کا دل گھر میں پالنے کے پھندنوں میں اٹکا رہتا ہے اور یہ گھر نہیں تھا۔ ا[illegible] سفاک شخص کی قتل گاہ تھی۔ میں یہاں اپنے زخمی فرحان کو چھوڑ کر کیسے چلی جاتی۔ [illegible] اتنی تیزی سے پیچھے ہٹی جیسے رحمت کی بجائے موت کا فرشتہ دیکھ لیا ہو۔ "نہیں رحمت [illegible] اپنے بچے کے بغیر نہیں جاؤں گی۔"

وہ لرزاں سرگوشی میں بولا "بی بی جی! سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے کچھ نہیں سمجھنا" میں فیصلہ کن لہجے میں بولی "اور مجھے یہاں سے جانا [illegible] نہیں۔"

وہ کچھ دیر الجھن زدہ انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ لگتا تھا اس کے پاس بو[illegible] کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں۔ میں نے کہا "کیا بات ہے کیوں نہیں آسکتا فرحان؟ کہاں [illegible] وہ؟"

"اچھا....... آپ یہیں ٹھہریں۔ میں پھر کوشش کرتا ہوں" اس کے لہجے میں عج[illegible] سی شکستگی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ باہر نکل گیا۔ اس دفعہ اس کی واپسی پانچ منٹ [illegible] ہوئی۔ وہ تقریباً بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمبل تھا اور کمبل میں کوئی [illegible] لپٹی ہوئی تھی۔

"آیئے میرے ساتھ" اس نے کہا۔ میں نے کمبل چھو کر فرحان کی موجودگی کا [illegible] کیا اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔ خشک ہوا نے پورے جسم میں سردی کی لہر دوڑا دی۔ میرے سر پر تاروں بھرا آسمان تھا۔ کئی دنوں کی قید با اذیت کے بعد آخر میں کھلے آسما[illegible] تلے آگئی تھی۔ آزادی کی منزل ابھی دور تھی لیکن امید کی کرن افق سے پھوٹ رہی تھی۔ ایک دیوار کے سائے سائے چلاتا رحمت مجھے ایک برآمدے میں لے آیا۔ ایک نیم تاری[illegible] کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور بڑی احتیاط سے کھس[illegible] کھسک کر آگے بڑھا۔ مجھے بھی ایسا ہی کرنا پڑا۔ اس کے بعد ہم ایک ڈیوڑھی نما کمرے [illegible] داخل ہوئے۔ ڈیوڑھی کے آخری سرے پر لکڑی کا ایک پرانا پھاٹک نظر آرہا تھا۔ پھاٹ[illegible] میں موٹی زنجیر پڑی تھی اور وزنی تالا لگا ہوا تھا۔ کہیں کہیں جالے بھی نظر آرہے تھے۔ [illegible] تھا اس راستے کو شاذونادر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ رحمت اس پھاٹک کی دلیز پر بیٹھ گیا [illegible] مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سرگوشی میں بولا۔

"بی بی جی! اس پھاٹک سے نکل کر سیدھی چلتی جانا' نالے کی چھوٹی سی پلی آئے گی۔ اس پلی کو پار کرو تو سامنے ہی پیپل کا اکیلا درخت ہے۔ اس درخت کے نیچے کھڑی ہو جانا' زینب وہاں پاس ہی کماد کے کھیت میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ خود ہی تم کو دیکھ لے گی۔"

اس نے فرحان کو کمبل سمیت زمین پر رکھ دیا۔ پھر پھاٹک کا ایک پٹ ایک ہاتھ سے پکڑا اور دوسرے پٹ پر ٹانگ جما کر پورا زور لگایا۔ چرچر کی آواز آئی اور پھاٹک کے دونوں تختوں میں نیچے کی جانب تھوڑا سا فاصلہ پیدا ہوگیا۔ یہ فاصلہ بمشکل اتنا تھا کہ میں سکڑ سمٹ کر اس میں سے گزر سکتی تھی۔ رحمت کے اشارے پر میں نے ایسا ہی کیا۔ نیچے جھک کر پہلے میں نے اپنا سر گزارا اور پھر جسم کو موڑ توڑ کر درز میں سے گزار دیا۔ پورا جسم خراشوں سے بھر گیا اور کندھے کا زخم کھل کر خون اگلنے لگا۔ اس کے بعد رحمت نے کمبل میں لپٹا ہوا فرحان بھی میرے سپرد کر دیا۔ اس نے کہا۔

"بی بی جی! اب جو کچھ بھی ہے خدا کا شکر کرو۔ چودھری وہاب آپ دونوں کو مارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ سچ پوچھتی ہو تو........ باغ کے پچھواڑے آپ دونوں کے لئے زمین بھی کھودی جا چکی ہے۔"

میں نے لرز کر فرحان کو سینے سے بھینچ لیا۔ رحمت نے زخمی زخمی لہجے میں کہا۔

"بس جی اب جلدی کرو نکل جاؤ یہاں سے پیپل تک پہنچنے سے پہلے کہیں رکنا نہیں' رب راکھا۔"

میں نے اٹھ کر دیکھا۔ میرے پیچھے تاروں کی روشنی میں ایک کچے راستے کے خدوخال نظر آرہے تھے۔ دور دور تک چارے کے کھیت تھے اور گنے کی فصل تھی۔ مالٹے اور کینو کے پودے غالباً میری بائیں جانب رہ گئے تھے۔ ایک یخ ہوا ہڈیوں میں اترتی جارہی تھی۔ میں نے مڑ کر ایک نظر اس منحوس عمارت کو دیکھا جہاں بقول رحمت ہمارے لئے ایک قبر بھی کھودی جا چکی تھی اور فرحان کو بازوؤں میں لے کر تیز قدموں سے کچے راستے پر بڑھنے لگی۔ تقریباً ڈیڑھ فرلانگ تک میں سیدھی چلتی چلی گئی۔ اچانک مجھے عجیب سا احساس ہونے لگا۔ میرے بازوؤں میں فرحان کا وزن ہمیشہ سے زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔ کمبل کے اندر اس کی ننھی کمر کی لچک کچھ نامانوس سی لگ رہی تھی...... اور پھر وہ گرمی'

جو اسے چھاتی سے لگا کر میرے بدن میں دوڑ جاتی تھی، آج کہاں تھی...... کہاں تھا خوشی اور طمانیت کا وہ احساس، میرے اندر سے ایک خاموش چیخ بلند ہوئی۔ میں نے جلدی سے بیٹھ کر فرحان کا کمبل کھولا۔ میرے ہاتھ اس کے گداز رخساروں پر آ گئے۔ انگلیاں اس کی جلد سے مس ہوئیں اور زمین میرے قدموں کے نیچے ڈگمگانے لگی۔

"فرحان...... فرحان" میں نے بے پناہ لاڈ سے کہا۔ اس کے چہرے کو تھوڑا سا جھنجھوڑا، تھوڑا سا ہلایا۔ اسے اپنے بازوؤں میں ہلکورا دیا۔

"فرحان! آنکھیں کھول میرے بچے، اپنی ماں کو دیکھ، اسے رو کر منا...... کوئی دکھڑا بتا......" دل سے ایک جگر پاش آواز صور اسرافیل کی طرح بلند ہوئی "فرحان یہاں نہیں ہے...... فرحان کہیں بھی نہیں ہے......" ذہن نے چلا کر کہا۔

"نہیں، وہ بے ہوش ہے، گہری بے ہوشی میں ہے۔"

دل چلایا "وہ گرمی کہاں ہے؟ وہ نرمی کہاں ہے؟ وہ لوچ کہاں ہے؟ کہاں ہے تیرا فرحان؟ اب کسے ڈھونڈ رہی ہے۔ اس کمبل میں؟" میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا، پھر میں چیخی، ہاں مجھے یاد ہے چیخی تھی۔ میری آواز کھیت کھیت اور منڈھیر منڈھیر بکھرتی چلی گئی۔ "فرحان...... فرحان" میری پکار سے بیکراں وسعتیں دہلنے لگیں۔ میں اسے چومنے لگی، چاٹنے لگی، اسے بھینچنے لگی، "میرے لال آنکھیں کھول، میری جان حرکت کر" لیکن حرکت کہیں نہیں تھی، آنکھیں ساکت تھیں۔ میں اٹھی اور بھاگتی چلی گئی۔ مغرب کی طرف یا شاید مشرق کی طرف، یا شاید کسی دوسری طرف، میں رو رہی تھی اور بھاگ رہی تھی۔ میرے قدموں کے نیچے خار ٹوٹ رہے تھے۔ میری آنکھوں کے آگے تاریکیوں کے دیو ناچ رہے تھے۔ میرے پیچھے آوارہ کتوں کے گروہ لپک رہے تھے۔ آوازیں تھیں اور پکاریں تھیں مگر میں بھاگ رہی تھی۔ اب مجھے سمجھ آ رہی تھی کہ رحمت میرے بچے کو لینے گیا تھا تو خالی ہاتھ کیوں آ گیا تھا۔ اس نے زخمی لہجے میں کیوں کہا تھا۔

"وہ اس وقت نہیں مل سکتا۔ تم از کم اپنی زندگی بچا لیں......" ہاں میں اب سب کچھ سمجھ رہی تھی لیکن دل کچھ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میں مکمل طور پر دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ پتہ نہیں میں اس حالت میں کب تک اور کہاں تک بھاگی۔ پھر میں نے خو

کو ایک گاؤں میں پایا۔ ایک ہراساں چہرے نے پوچھا "کیا بات ہے بہن؟"

"ڈاکٹر کہاں ہے؟" میں چلا کر پوچھا

ایک دوسرے شخص نے داہنی طرف اشارہ کیا اور میرے ساتھ بھاگنے لگا۔ میرے پیچھے بھی قدموں کی آوازیں تھیں۔ تاریک گھروں کے دروازے دھڑ دھڑ کھل رہے تھے۔ خوابیدہ آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ پھر میں نے ایک لالٹین کی روشنی میں گاؤں کے ڈاکٹر کو دیکھا۔ اس نے میرے بچے کو لکڑی کی ایک میز پر سیدھا لٹایا۔ اسٹیتھسکوپ سے اس کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ ٹارچ سے اس کی آنکھوں کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور ہاتھ لرز رہے تھے۔ یا شاید صرف مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ میری سوالیہ نگاہیں ڈاکٹر کے چہرے پر تھیں۔ یہ چہرہ مجھے ایک جواب دینے والا تھا۔ میری زندگی کا سب سے اہم جواب۔ اس سر کو اقرار میں ہلنا تھا یا انکار میں۔ سر کی انہی دو جنبشوں کے درمیان میری زندگی اٹکی ہوئی تھی۔

میں سراپا فریاد اور دعا بنی ڈاکٹری معائنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ میں بے زبان خاموشی ڈاکٹر سے التجا کر رہی تھی "اچھی طرح دیکھنا، خوب غور سے دیکھنا، جلدی میں فیصلہ مت دینا، یہ کوئی معمولی فیصلہ نہیں یہ میرا بچہ ہے، میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میری کل کائنات ہے......" آخر ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ کانوں سے ہٹایا۔ رحم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور انکار میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں نے بھی کچھ کہا تھا لیکن مجھ میں اتنی تاب ہی کہاں تھی کہ اس کے ہونٹوں کو سن سکتی۔ میں کسی جنگلی عورت کی طرح جھپٹی اور ڈاکٹر کی میز سے اپنا بچہ جھپٹ لیا "تم جھوٹ بولتے ہو بکواس کرتے ہو کس نے بنایا ہے تمہیں ڈاکٹر، اجڈ، دیہاتی، جاہل" میں نے فرحان کو سینے سے لگایا۔ اس کی ننگی زخمی انگلیوں کو چوما اور وہاں موجود لوگوں سے فریاد کرنے لگی۔

"بھائیو! مجھے کسی طرح شہر پہنچا دو۔ میں اسے ہسپتال لے جاؤں گی۔ شہر میں میرا بھائی خود ڈاکٹر ہے۔ وہ اسے بچا لے گا۔ خدا کے لئے جلدی کرو۔"

لوگوں کی نظروں میں آنسو چمک رہے تھے۔ ان میں سے کچھ شاید میری ذہنی حالت پر بھی شک کر رہے تھے۔ میں سمجھ گئی کہ ان میں سے کوئی میری مدد نہیں کرے گا۔ میں نے بچے کو لیا اور ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی باہر نکل آئی۔

"کہاں سے آئی ہو بہن' تمہارے شوہر کا کیا نام ہے؟" ایک عورت بازو کھینچ کھینچ کر مجھ سے پوچھ رہی تھی اور یہ کوئی اکیلی عورت نہیں تھی' کئی مرد و زن تھے۔ وہ سب مجھ سے سوال پوچھ رہے تھے۔ مجھے روکنے کی سعی کر رہے تھے۔ میں انہیں دھکیلتی اور کاٹتی ہوئی کھیتوں کی طرف نکل گئی اور ایک بار پھر بھاگنے لگی۔ مجھے بس ایک اندازہ سا تھا کہ شہر اس طرف ہوگا۔

چند فرلانگ کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ یہ گاؤں سے ہی میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ان سے بچنے کے لئے میں ایک خشک برساتی نالے کے اندر دبک کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ان کی لالٹینوں کی روشنیاں اور ان کی آوازیں دور چلی گئیں تو میں اپنی تاریک پناہ گاہ سے نکلی اور ایک بار پھر اپنے بے سمت سفر پر روانہ ہو گئی۔ کوئی صدا پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

"شا تیرا بچہ مر چکا ہے۔ اس کے جسم کا خون اس کی کٹی ہوئی انگلیوں سے رس رس کر نکل چکا ہے۔ اب اس کے بدن میں لہو کی بوند ہے نہ زندگی کی رمق" مگر میں تھی کہ کسی صورت یہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔ مجھے اپنے پیچھے آنے والے ہر شخص سے خوف آ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا لوگ مجھ سے میرے زندہ فرحان کو چھین کر دفن کر دیں گے۔ میں گرتی پڑتی بھاگتی رہی۔ آخر کہیں قریب سے ٹیوب ویل چلنے کی آواز آئی۔ سخت سردی کے باوجود میرا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا اور پیاس اتنی شدید تھی کہ جون جولائی کی دوپہروں میں بھی کیا ہوگی۔ ٹیوب ویل کا پانی گرنے کی آواز آئی تو میں اس آواز کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ میں پانی پی رہی تھی کہ پاس والے کوٹھے کے پیچھے سے تین چار افراد برآمد ہوئے۔ پتہ نہیں وہ راستے میں میرے پیچھے لگے تھے یا اس ٹیوب ویل پر پہلے سے موجود تھے۔ ان میں ایک نے پوچھا۔

"بی بی! کیا بات ہے' اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

میں نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "بھائی! اگر تمہارے پاس کوئی سواری ہے تو مجھے شہر تک لے چلو۔ میرا بچہ سخت بیمار ہے۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتی ہوں" ایک شخص نے آگے بڑھ کر فرحان کو دیکھنا چاہا تو میں جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ "نہیں۔ نہیں ہوا لگ جائے گی' کمبل مت ہٹاؤ۔"

وہ نرمی سے بولا "بی بی! دیکھنے تو دو" ہاتھ میں پکڑی لالٹین اونچی کرکے اس نے فرحان کو ایک نظر دیکھا۔ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سانس کی حرکت محسوس کرنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے ساتھیوں سے کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا۔

"کس کی ہے تو؟" اس نے پوچھا۔ اس کی جہاندیدہ نگاہیں میرے خون آلود کرتے سے پھسلتی ہوئی میری کلائیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جہاں ابھی تک سونے کی بیش قیمت چوڑیاں موجود تھیں۔ سب کچھ لٹ گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ چوڑیاں ابھی تک میرے جسم سے جدا نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے ادھیڑ عمر شخص کے سوال کا جواب دینے کی بجائے پکار کر کہا۔

"مجھ سے کچھ نہ پوچھو' پہلے مجھے بچے کی جان بچا لینے دو۔"

وہ دکھ سے بولا "بیٹی! اب اس کو کیوں لیے پھرتی ہے یہ تو.........."

"خبردار!" میں نے چلا کر کہا "خبردار...... ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا یہ میرا بیٹا ہے۔ میں زندہ ہوں تو یہ کیسے مر سکتا ہے۔ یہ بھی زندہ ہے...... خبردار کچھ نہ کہنا۔"

میں نے فرحان کو پھر بانہوں میں جکڑا اور اندھا دھند بھاگنے لگی۔ یوں لگتا تھا میرے پیچھے آسیبی پرچھائیاں لپک رہی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں اپنا پاگل پن محسوس بھی کر رہی تھی پھر بھی ہوش میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ دل کی آرزو تھی کہ کاش یہ سب ایک خواب ہو۔ اچانک میں ٹھٹک کر رک گئی۔ مجھے راستہ کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا۔ کہیں قریب ہی جنریٹر کی گھوں گھوں سنائی دے رہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر دیکھا۔ بھاگتے بھاگتے میں پھر انہی کھیتوں میں نکل آئی تھی جہاں سے میں نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ بیس تیس قدم بھاگ کر میں نے ایک کھیت پار کیا اور دائیں جانب دیکھا تو چند کھیتوں کی دوری پر اس منحوس عمارت کی نیم روشن چار دیواری نظر آئی جہاں میں نے اپنا سب کچھ گنوایا تھا۔ میرے اندر ایکا ایکی ایک آتش فشاں دہک اٹھا تصور میں چوہدری وہاب کی مخصوص مسکراہٹ چمکی اور تن بدن میں شعلے لپک گئے۔ میرے دل کی گہرائیوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی۔ کاش میرے پاس کوئی بندوق ہو' پستول ہو خنجر یا کلہاڑی ہو۔ میں چیختی چلاتی اس مکان کے اندر گھس جاؤں۔ جو میرے سامنے

آ کے اسے ہلاک کر ڈالوں اور اس چار دیواری کے سب سے بڑے شیطان کو اتنے کچوکے
لگاؤں کہ اس کی ہر بوٹی علیحدہ علیحدہ ہو کر پھڑکنے لگے لیکن ہتھیار کہاں تھا؟ وہ شے کہاں
تھی جو میری ناتوانی کو توانائی میں بدل سکتی اور وہاب کے پہریداروں کے درمیان سے میرا
راستہ بنا سکتی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ ہتھیار کیا ہوتا ہے اور کسی وقت اس کی
ضرورت کتنی شدت سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ میں اپنی کیفیت ٹھیک طرح بیان نہیں کر
پا رہی۔ یوں سمجھ لیں کہ پانی میں ڈوب کر مرتے ہوئے شخص کو جتنی ضرورت ہوا کی ہوتی
ہے اتنی ہی طلب مجھے ہتھیار کی تھی۔ میں نے دیوانوں کی طرح اپنے چاروں طرف دیکھا۔
درختوں، فصلوں اور منڈیروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو وہ گھونسلوں میں چھپا
ہوا تھا یا آسمان پر چمک رہا تھا یا دور کے کھیتوں میں بھونک رہا تھا۔ میں غم و غصے سے بے
قابو ہو کر درختوں کے درمیان گھری ہوئی اس عمارت کی طرف بڑھی۔ قریباً نصف فرلانگ
کا وہ فاصلہ مجھے نصف گز کی طرح محسوس ہوا۔ یوں لگا میں اڑتی ہوئی اس فاصلے کو پاٹ گئی
ہوں۔ یہ عمارت کا پچھلا حصہ تھا۔ میں گھوم کر عمارت کے پہلو میں آگئی اور وہاں سے صدر
دروازے پر پہنچ گئی۔ میں نے پہچان لیا یہی دروازہ تھا جہاں سے ایک ہفتہ پہلے مجھے گزار کر
جہنم میں داخل کیا گیا تھا۔ دروازہ بند تھا میں نے پوری قوت سے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔
"دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو" میں حلق کی پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔
ذرا دیر بعد وزنی کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔ میں نے اپنے
سامنے ایک بوڑھے شخص کو پایا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ میں چیل کی طرح
اس پر جھپٹی۔ وہ میرا دھکا لگنے سے دور جا گرا۔ لاٹھی ٹن ٹن کی آواز سے پختہ فرش پر
لڑھکتی چلی گئی۔
میں نے فرحان کو ایک طرف چارپائی پر ڈالا اور اندرونی حصے کی طرف بڑھی۔
یکایک ایک ہٹا کٹا شخص نکل کر میرے سامنے آگیا۔ میں نے اسے زوردار دھکا دیا۔ اس
نے گرتے گرتے بھی میرا بازو پکڑ لیا۔ میرے جسم میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آگئی
تھی۔ میں نے پے در پے اس کے پیٹ میں ٹھوکریں ماریں اور خود کو چھڑا لیا۔ میرے
ذہن میں صرف ایک ہی تصور تھا اور وہ تھا وہاب کے مسکراتے چہرے کا۔ میں اس چہرے
کی مسکراہٹ اس طرح نوچنا چاہتی تھی کہ اس کے پیچھے ہڈیوں اور بے نور آنکھوں کے

سوا کچھ باقی نہ بچے۔ میں نے ایک ایک دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ کوئی دروازہ کھلا ہوا
نہیں تھا۔ ایکا ایکی دو مردوں نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش
کی لیکن خالی ہاتھ کہاں تک ان کا مقابلہ کرتی۔ اتنے میں دروازہ کھولنے والا بوڑھا بھی ان
کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ان تینوں نے مجھے بے بس کر دیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔
میں چیخ چیخ کر ایک ہی فقرے کی تکرار کیے جا رہی تھی۔
"چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو مجھے۔"
اتنے میں بیرونی دروازے کی طرف سے بہت سی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دروازہ
کھلا اور کئی افراد اندر گھس آئے۔ انہوں نے ہاتھوں میں لاٹھیاں پکڑی ہوئی تھیں۔ یہ
وہی لوگ تھے جو شروع سے میرے پیچھے آ رہے تھے۔ ان میں اس بستی کے لوگ بھی تھے
جہاں دیہاتی ڈاکٹر نے فرحان کو دیکھا تھا۔ ٹیوب ویل پر ملنے والے افراد بھی تھے اور وہ
کسان بھی تھے جنہوں نے اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مجھے بھاگتے دوڑتے
دیکھا تھا۔ ان سب کے چہروں پر تجسس تھا، حیرانی تھی اور دکھ تھا۔ وہاب کے ملازم اب
مجھے بے دریغ پیٹ رہے تھے۔ یہ سب نئے ملازم تھے اور اس سے پہلے میں نے انہیں
کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ حویلی میں اور نہ اس ڈیرے پر۔ مجھے پٹتے دیکھ کر ایک لمبا تڑنگا
شخص آگے آیا۔ اس نے مجھے حویلی کے ملازموں سے چھڑانے کی کوشش کی اور انہیں بتایا
کہ وہ نور پور کا نمبردار ہے۔ ملازم اس نمبردار کو بالکل خاطر میں نہیں لائے۔ صرف اتنا ہوا
کہ انہوں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔
وہ مجھے چھوڑنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھے۔ ان میں سے ایک نے رعب سے کہا۔
"نمبردار جی! ان لوگوں سے کہیں اپنا کام کریں، یہ بڑی حویلی کا معاملہ ہے۔"
ایک شخص نے ہمت کر کے پوچھا "لیکن یہ ہے کون؟ اس کا قصور کیا ہے؟"
وہاب کے کارندے نے طنزیہ لہجے میں کہا "معمولی قصور ہے۔ اس نے جاگیردار
صاحب کو قتل کیا ہے۔ اب کہو کچھ لگتی تو نہیں تمہاری؟"
سوال پوچھنے والا سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے چیخ کر کہا۔
"یہ جھوٹ بولتے ہیں، ظالم ہیں یہ، انہوں نے پچھلے جمعے سے مجھے اس مکان میں
قید کر رکھا ہے...... وہ پڑی ہے میرے معصوم کی لاش، جسے ان درندوں نے تڑپا تڑپا کر

مارا ہے۔ دیکھو! اس کمسن کو...... دیکھو ذرا" میرے ذہن پر ایک بار پھر دھند چھانے لگی میں پاگلوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور ان کے ہاتھوں کی گرفت میں تڑپنے لگی۔

نمبردار اور دوسرے لوگ اب بغور میری شکل دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خوف و ہراس تھا۔ ایک شخص نے زور سے کہا "ہاں...... ہاں یہی ہے وہ' میں نے تصویر دیکھی تھی اخبار میں" لوگ اب مجھے پہچان گئے تھے اور میرے گرد ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے بہت چیخ و پکار کی لیکن کوئی میری یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ مجھے اس مکان میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے اور میرے بچے کو قتل کیا گیا ہے۔ چودھری وہاب کے کارندے کہہ رہے تھے "یہ پاگل ہوگئی ہے' چودھری وہاب صاحب نے تو ابھی تک اس باغ میں قدم بھی نہیں رکھا۔ یہ پاگل پن میں خود ہی اپنے بچے کو مار لائی ہے۔"

"میں پاگل نہیں ہوں' میں پاگل نہیں ہوں" میں چلانے لگی۔ آہنی ہاتھوں کی گرفت مجھ پر سخت ہوتی جا رہی تھی۔ "میں نے اپنے بچے کو نہیں مارا۔ انہوں نے مارا ہے' ان سب نے مارا ہے۔" میری پکار لوگوں کے شوروغل میں دبتی جا رہی تھی۔ کسی سخت ہاتھ نے ایک مضبوط رسی میرے جسم کے گرد لپیٹنی شروع کر دی۔ میرے دونوں بازو بھی اس رسی کی گرفت میں آتے چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں میرا اوپری دھڑ قطعی طور پر جکڑا جا چکا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا "تھانے لے کر چلو" کوئی کہہ رہا تھا "پہلے حویلی لے جاؤ" ایک آواز کانوں میں پڑی "فاحشہ ہے' اس کو یہیں پتھر مار مار کر مار دینا چاہئے" ایک جوشیلی آواز آئی "ہاں یہیں مار دینا چاہئے" ایک اور آواز "نہیں پہلے حویلی لے کر جانا چاہئے"...... "چلو...... چلو...... چلو" بہت سی آوازیں میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ مجھے پیچھے سے دھکیلا اور آگے سے کھینچا جانے لگا۔ میں ہر قدم پر مزاحمت کر رہی تھی۔ میری نگاہیں اپنے فرحان کی لاش ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں نے چیخ کر کہا "رک جاؤ...... رک جاؤ...... مجھے اپنے لال کی صورت تو دیکھ لینے دو۔" اس کا منہ تو چوم لینے دو!"

کسی کو مجھ پر رحم نہ آیا۔ وہ مجھے مارتے اور کھینچتے ہوئے باہر لے آئے اور ایک جلوس کی صورت میں آگے بڑھنے لگے۔ وہ میری زندگی کا خوفناک ترین سفر تھا۔ خدا اس

شخص کو ذلت کی اس انتہا سے بچائے۔ میرا جسم زخم زخم اور لباس تار تار تھا۔ میں اٹھ رہی تھی اور گر رہی تھی۔ جاگیردار کے زر خرید کتے میرے چاروں طرف بھونک رہے تھے۔ ان کے پیچھے تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ ہو سکتا ہے ان کے دلوں میں میرے لئے ہمدردی ہو۔ مگر اس ہمدردی کو انہوں نے کسی خوفناک راز کی طرح دل کے نہاں خانوں میں چھپا لیا تھا۔ طاقت کے سامنے کمزور جذبوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ میرے بھائی بھی تو میرے ہمدرد تھے۔ انہیں بھی تو پتہ تھا کہ میں کن حالات سے گزر رہی ہوں مگر میرے بھائی اور میرے خون کے سارے رشتے مجھ سے نگاہیں پھیر کر مصلحت کے خول میں چھپ چکے تھے۔ اپنی بے حسی کے لئے ان کے پاس یہی جواز کافی تھا کہ میں نے عدالت میں اپنے شوہر کے حق میں بیان دیا تھا۔ اب میرے ساتھ جو کچھ بھی ہو جاتا اس میں میرا ہی قصور تھا۔ خود غرضی و طاقت کی آندھی نے ضمیر کے چراغ بجھا دیئے تھے۔

لوگ مجھے دھکیلتے اور کوستے ہوئے اس حویلی تک لے آئے جہاں آج سے دو برس پہلے میں دلہن بن کر اتری تھی۔ میرے قدموں میں سرسوں کا تیل بہایا گیا تھا اور پھول نچھاور کئے گئے تھے۔ آج پھولوں کی جگہ میرے پاؤں میں ٹوٹے ہوئے کانٹے تھے اور سونے چاندی کی جگہ مجھ پر پتھر نچھاور کئے جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا چودھری وہاب حویلی کی بیرونی بالکونی میں کھڑا تھا۔ یہ بالکونی بڑے گیٹ کے عین اوپر واقع تھی۔ اس کے ساتھ دو بندوق بردار محافظ بھی تھے۔ وہاب کی آنکھوں میں میرے لئے نفرت ہی نفرت تھی۔ مجھے پکڑ کر لانے والوں میں سے ایک نے بالکونی میں جا کر اس سے کچھ بات چیت کی۔ اس بات چیت کے بعد چودھری وہاب بالکونی میں تھوڑا سا آگے آیا اور تقریر کرنے والے انداز میں بولا۔

"بھائیو! میں جانتا ہوں' چودھری واصف کی ناگہانی موت نے آپ کو صدمے سے بے حال کر رکھا ہے۔ اس کی موت کی ذمے دار آپ کے سامنے ہے۔ اس قاتلہ کی سزا تو یہی تھی کہ اسے اسی جگہ سنگسار کر دیا جاتا۔ مگر کچھ بھی ہو ہمیں قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا آپ ذرا تحمل سے کام لیں۔ میں نے انسپکٹر خورشید محمد کے پاس بندہ بھیج دیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں پولیس پہنچ جاتی ہے۔"

ایک شخص چلا کر بولا "ہم نہیں مانتے پولیس کچہری کو' اس عورت نے ہمارے ان

داتا کو مارا ہے' ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

ایک بوڑھے نے پکار کر کہا "مارو...... ہاں مارو اس بچے کھانی ڈائن کو"

میں اس خرانٹ بوڑھے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ یہ واصف کے بے دام کے غلاموں میں سے ایک تھا اور اس کی بیٹی واصف کی رکھیل تھی۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا پھر بھی مجھے اتنی سمجھ آ رہی تھی کہ یہ جو کچھ ہونے لگا ہے چودھری وہاب کے ایما پر ہو رہا ہے۔ وہ اپنے شرمناک گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مجھے اس جگہ مروا دینا چاہتا ہے...... یہ سب کچھ جان کر بھی میرے دل میں کوئی ہراس پیدا نہیں ہوا۔ اب میں زندہ رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اپنے بچے کے بغیر ہر سانس میرے لئے بوجھ تھا۔ اس بوجھ کو اٹھائے اٹھائے میں جیلوں اور کچہریوں میں کہاں بھٹکتی پھرتی۔ میں موت کی آخری اذیت جھیلنے کے لئے تیار ہو گئی۔

"مارو...... مارو" اب ہر طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔

خاموش اکثریت پر جاگیردار کے گنے چنے نمک خواروں کا شور غالب آتا جا رہا تھا۔ پلک جھپکنے میں بے رحم سفاک ہاتھوں نے مجھ پر پتھروں ڈنڈوں اور لاٹھیوں کی بارش کر دی مگر ایسا صرف ایک یا دو سیکنڈ کے لئے ہوا۔ اس سے پہلے کہ میرے جسم سے خون کے فوارے چھوٹتے اور گوشت چیتھڑوں میں بدلنے لگتا...... یکایک جابر ہاتھ رک گئے۔ ضربوں کا سلسلہ ختم گیا۔ میں نے دیکھا میرے چاروں طرف جاگیردار کے کارندے کائی کی طرح پھٹ رہے ہیں۔ بھگدڑ کے ساتھ گھوڑوں کی ٹاپیں بھی گونج رہی تھیں۔ پھر مجھے کچھ فاصلے پر لہراتی ہوئی مشعلیں نظر آئیں۔ یہ مشعلیں تیزی سے قریب پہنچ رہی تھیں۔ میرے بالکل پاس سے کوئی چلایا۔

"شباب کے آدمی آ گئے...... شباب کے آدمی۔"

وہی سراسیمگی دیکھنے میں آئی جو تین ہفتے پہلے میرے اور سلیم کے فرار ہوتے وقت دکھائی دی تھی۔ دفعتاً گولیاں چلنے لگیں۔ اب چاروں طرف گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ میں بھاگ کر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ میرے سامنے حویلی کی بالکونی میں ایک شخص کو گولی لگی اور وہ تڑپ کر نیچے پختہ فرش پر آ گرا۔ اس کے بعد بالکونی کی چھت پر لگا ہوا لیمپ چکنا چور ہو گیا اور اردگرد تاریکی پھیل گئی۔ چند گولیاں ٹھک ٹھک کی آواز

سے درخت کے تنے میں پیوست ہوئیں۔ یہ جگہ اب غیر محفوظ تھی۔ میں اٹھ کر بھاگی تو ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ ڈھاٹے میں سے صرف چمک دار آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے زور مار کر خود کو چھڑانا چاہا تو آواز آئی۔

"میں شباب ہوں' آؤ میرے ساتھ۔"

میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ مجھے کھینچتا اور سنبھالتا ہوا ایک گھوڑے تک لے آیا۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس نے مجھے اٹھا کر گھوڑے پر سوار کر دیا اور عقب سے سہارا دے کر سنبھال لیا۔ ایک گھڑسوار نے قریب آ کر تیز لہجے میں کہا۔

"چودھری جی! آپ نکل جائیں ہم سنبھالتے ہیں ان کو"

چودھری شباب نے تحکم سے کہا "نہیں ساول...... سارے نکل چلو اگر ان کتوں نے پیچھا کیا تو ٹبوں کے پار گھیر لیں گے' چل دے آواز اور بلا سب کو۔"

"نہیں چودھری جی' میری بات مانیں' آپ نکل چلیں۔"

اسی دوران گولیاں ہمارے سر کے اوپر برگد کے پتوں سے تڑ تڑ ٹکرانے لگیں "نکلیں چودھری جی" اس شخص نے لجاجت سے کہا اور گھوڑا گھما کر جوابی فائر کرنے لگا۔ چودھری شباب نے لگام کو جھٹکا دیا اور گھوڑا ایک چکری لے کر آگے بڑھنے لگا۔ رات کے پچھلے پہر کی خنکی میں کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح لوگ حویلی کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ ہمارے عقب میں فائرنگ اب مزید شدت اختیار کر گئی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے کے دشوار گزار سفر کے بعد میں نے خود کو ایک حویلی کے دروازے پر پایا۔ یہ حویلی درختوں کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ گھوڑے کی ٹاپیں گونجیں تو لکڑی کے پھاٹک میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک ادھیڑ عمر شخص لالٹین لئے برآمد ہوا۔ ہمیں دیکھنے کے بعد وہ جلدی سے اندر چلا گیا۔ "کریم بخش" اس نے کسی کو آواز دی۔ ذرا دیر بعد پانچ چھ مسلح آدمی اندر سے نکل آئے۔ انہوں نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر چودھری کو شباب کو سلام کیا اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔

چودھری شباب نے کہا "اس بی بی کو اندر لے جاؤ اور حفاظت سے رکھو" پھر مجھ سے مخاطب ہوا "میں کل کسی وقت چکر لگاؤں گا تمہیں یہاں کسی کا ڈر نہیں ہونا چاہئے۔"

شباب کی آواز میرے کانوں میں جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔ میری آنکھیں

خشک ہو چکی تھیں لیکن دل مسلسل رو رہا تھا۔ اپنے بچے کا مرا ہوا چہرہ میری نگاہوں میں
تھا۔ دو افراد نے بڑے احترام سے مجھے گھوڑے سے اتارا۔ ایک شخص نے شاب سے
پوچھا۔

"چودھری جی، استاد نہیں آیا؟"

"وہ بھی آتا ہی ہو گا" چودھری نے جواب دیا اور گھوڑا موڑ کر تاریکی میں اوجھل
ہو گیا۔ مجھے گھوڑے سے اتارنے والے بڑے احترام سے اندر لے آئے۔ یہ کافی وسیع
حویلی تھی مگر لگتا تھا مدت سے بے آباد پڑی ہے۔ ہر چیز گرد میں اٹی ہوئی تھی۔ کمرے
سازوسامان سے خالی تھے۔ ایک جگہ اینٹوں کا عارضی چولہا اور جست کے ٹوٹے پھوٹے
برتن بکھرے تھے۔ ایک دوسرے کمرے میں پیال کے کچھ بستر بچھے ہوئے تھے اور ان پر
میلی رضائیاں پڑی تھیں۔ ان بستروں کے بیچوں بیچ پختہ فرش پر آگ جل رہی تھی اور
آگ کے دھوئیں نے چھت کو سیاہ کر رکھا تھا۔ ایک ہال نما کمرہ جو شاید حویلی کا ڈرائنگ
روم تھا اور جہاں چند خوبصورت پینٹنگز ابھی تک آویزاں تھیں اصطبل کے طور پر
استعمال کیا جا رہا تھا۔ قریباً چھ عدد گھوڑے یہاں بندھے ہوئے تھے اور ان کی بو سے پوری
حویلی مہک رہی تھی۔ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں ایک چارپائی پر
بدبودار بستر پڑا تھا۔ کمرے میں موجود اشیاء سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کسی مرد کا قیام
ہے۔ میں گم صم سی بستر پر بیٹھ گئی۔ میری آنکھیں صحرا کی طرح ویران ہو چکی تھیں۔ ایک
پرتپش چبھن کے سوا ان میں کچھ نہیں تھا۔ میرا فرحان مر چکا تھا لیکن میں نہ بین کر رہی
تھی اور نہ میرے ہاتھ سینہ کوبی کے لئے اٹھ رہے تھے، نہ بال نوچ رہی تھی اور
دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھی۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی میری، کچھ دیر بعد ایک
شخص نے گرما گرم چائے کا پیالہ میرے سامنے رکھ دیا اور ایک پٹی مجھے دیتے ہوئے کہا
میں اپنے کندھے پر باندھ لوں۔ میں نے پٹی باندھی اور نہ چائے پی۔ اس طرح بیٹھی
رہی...... آخر میری زندگی کی منحوس ترین رات کا اندھیرا صبح کے اجالے میں بدل گیا
کوئی دس بجے کے قریب پختہ فرش پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجیں اور سات آٹھ افراد حویلی
میں آ گئے۔ وہ سب تیز تیز لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ چند لمحوں بعد میرے کمرے کا
دروازہ کھلا اور ایک بے حد خوفناک شکل والے شخص نے اندر جھانکا۔ اس کی پیشانی

پر کسی کلہاڑی یا تلوار وغیرہ کا زخم تھا۔ اس زخم نے پیشانی کے ساتھ ساتھ اس کی ناک کو
بھی دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک نظر دیکھنے سے لگتا تھا جیسے مٹی کے ٹوٹے ہوئے
برتن کو اناڑی پن سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس کی خود رو داڑھی کانٹوں کی مانند
تھی اور مونچھوں نے بالائی ہونٹ مکمل طور پر چھپا رکھا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے ایک
بازو سے خون بہہ رہا ہے، دوسرا ہاتھ اس نے ماتھے تک اٹھایا اور بولا "سلام بی بی جی۔"
میں نے اسے جواب نہیں دیا۔ غالباً وہ بھی جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ دروازہ
بھیڑ کر واپس چلا گیا۔ اس کی آواز سے میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی ڈھاٹا پوش تھا رات
جسے چودھری شاب نے ساول کہہ کر مخاطب کیا اور جس نے چودھری سے کہا تھا وہ مجھے
لے کر نکل جائے۔

اب کسی ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ساول جسے اس
کے ساتھی استاد ساول کہہ کر بلا رہے تھے انہیں رات والے معرکے کی بابت بتا رہا تھا۔
اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ رات ہمارے آنے کے بعد چنگیزیوں کی حویلی کے سامنے
زبردست لڑائی ہوئی ہے۔ دو گھنٹے جاری رہنے والی فائرنگ میں دونوں طرف سے دو دو آدمی
مارے گئے ہیں اور قریباً ڈیڑھ درجن زخمی ہوئے ہیں۔ میں سب کچھ سن رہی تھی لیکن
دماغ کسی بات کا اثر قبول نہیں کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا یہ واقعات میرے اردگرد نہیں ہو
رہے بلکہ کسی کہانی کا حصہ ہیں۔ دوپہر کے وقت ایک شخص کھانے کی ٹرے اٹھائے اندر
داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ وہ رحمت تھا۔ اس کی آنکھیں اشک بار
تھیں۔ لرزاں ہاتھوں سے اس نے ٹرے میرے قریب رکھ دی اور اپنی ہچکیوں کو دبانے
کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھے آپ کے بچے کی موت کا بڑا دکھ ہے بی بی جی! پر کیا کیا جائے، اللہ کی رضا
یہی تھی۔ آپ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کریں" وہ دیر تک مجھے پرسا دینے کی
کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ لاہور سے میرے عزیزوں نے بچے کی میت
وصول کرنے کے لئے پولیس سے رابطہ قائم کیا ہے اور امید ہے کہ شام تک پوسٹ مارٹم
کے بعد میت انہیں دے دی جائے گی...... اس نے مجھے کھانا کھلانے کی بہت کوشش کی
لیکن ناکام رہا۔ جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہا۔

"بی بی جی! زینب کا بھی کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

میرے اگلے دو تین دن بالکل بے حسی کی کیفیت میں گزرے۔ صرف سینے میں ایک چنگاری سی تھی جو کبھی بھڑک کر شعلہ اور کبھی الاؤ بن جاتی۔ چودھری شہاب کے آدمی ہر طرح میرا خیال رکھ رہے تھے اور رحمت تو ہر وقت میری دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔ اس حویلی کے بارے مجھے جو کچھ پتہ چلا تھا اس کا لب لباب یہ تھا۔

یہ حویلی ایک مقامی زمیندار کی تھی۔ زمیندار کو فلمیں بنانے کی لت پڑ گئی تھی اور وہ جائیداد بیچ کر لاہور جا آباد ہوا تھا۔ یہ حویلی چونکہ ایک پرسکون جگہ پر تھی اور کبھی کبھار شوٹنگ میں بھی کام آتی تھی لہٰذا زمیندار نے حویلی اور اردگرد کی کچھ زمین رکھ چھوڑی تھی۔ یہاں دیکھ بھال کے لئے خانو نامی ایک چوکیدار رہتا تھا۔ چودھری شہاب کے کچھ بندوں نے جیل سے فرار ہونے کے بعد اس حویلی میں پناہ لی تھی۔ چوکیدار خانو کو انہوں نے ذرا دھمکا کر اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ جیل سے فرار ہونے والے کل پانچ آدمی تھے جن میں سے ایک جاگیرداروں کے ساتھ لڑائی میں ہلاک ہو گیا تھا اور باقی چار جن میں استاد ساول بھی شامل تھا اس حویلی میں تھے۔ یہ سب خطرناک لوگ تھے اور چودھری شہاب کے ایک اشارے پر ہر کام کر گزرتے تھے۔ رحمت کی زبانی مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ پولیس نے "پال پور" سے چودھری شہاب کے پانچ آدمی گرفتار کر لئے ہیں اور وہ خود ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کے لئے شہر گیا ہوا ہے۔

اپنے بارے میں رحمت نے مجھے بتایا تھا کہ اس رات مجھے اور مردہ فرحان کو حویلی سے نکالنے کے بعد، وہ ایک پگڑی کی کمند بنا کر خود بھی حویلی سے باہر آ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ سیدھا نہر کے پار سرکاری رکھ میں پہنچا تھا جہاں پروگرام کے مطابق زینب نے مجھے لے کر پہنچنا تھا۔ یہاں محکمہ جنگلات کا ایک پرانا ریسٹ ہاؤس تھا اور اس رات وہی ریسٹ ہاؤس ہم تینوں یعنی میرے، زینب اور رحمت کے ملنے کی جگہ تھی۔ مگر وہاں صرف رحمت پہنچ سکا تھا۔ میں فرحان کی موت میں دیوانی ہو کر کہیں سے کہیں نکل گئی تھی اور زینب بھی نہ جانے کیوں وہاں تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ہم دونوں کی تلاش میں ناکامی کے بعد رحمت اکیلا ہی چودھری شہاب کے گاؤں پال پور چلا گیا تھا۔ درحقیقت شروع سے اس کا پروگرام یہی تھا کہ مجھے اور زینب کو حویلی سے نکالنے کے بعد چودھری شہاب کے پاس

لے جائے گا۔ اس پورے علاقے میں چودھری شہاب ہی وہ واحد شخص تھا جو چنگیزیوں کے کسی باغی کو پناہ دینے کا سوچ سکتا تھا۔

فرحان کا مرا ہوا چہرہ دیکھنے کے بعد نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور جا چکی تھی۔ میں ساری رات چھت کی کڑیاں گنتی اور سارا دن خاموش بیٹھی رہتی۔ رحمت میرا دھیان بٹانے میرے پاس آ بیٹھتا بات سے بات نکالتا' خود ہی سوال کرتا اور خود ہی جواب دینے لگتا۔ اس کی گفتگو کچھ اس طرح ہوتی تھی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ میرا خیال ہے ٹھیک ہی ہے۔ رات نیند آئی یا نہیں؟ آنکھوں سے تو لگتا ہے آج بھی جاگتی رہی ہیں۔ چودھری صاحب آج بھی نہیں آئے۔ پتہ نہیں کس چکر میں ہیں۔ میرا خیال ہے آج ضرور شکل دکھائیں گے۔" رحمت ایک ہمدرد اور غمگسار شخص تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہر وقت ایک اداسی سی ٹپکتی رہتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا تھا اس کا ماضی کسی دل گداز کہانی کا امین ہے۔ ایک روز وہ خود ہی مجھے کہانی سنانے بیٹھ گیا۔ اس روز سارا دن زینب کو تلاش کرنے کے بعد واپس آیا تھا اور نڈھال سا میرے کمرے کے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

"بی بی جی! آپ بھی سوچتی ہوں گی۔ میرا اور زینب کا کیا رشتہ ہے' میں کیوں اس کے لئے اتنی مصیبت اٹھا رہا ہوں۔ کچھ کچھ اندازہ تو آپ کو بھی ہو گیا ہو گا۔" پھر وہ خیالوں میں گم ہو گیا۔

"یہ آج سے گیارہ بارہ سال پرانی بات ہے۔ میں اور زینب ایک دوسرے کو بے
حد چاہتے تھے۔ بڑی پاک صاف محبت تھی ہم دونوں کی۔ ایک دوسرے دیکھ دیکھ کر جیتے
تھے ہم' جدائی کا خیال بھی نہیں تھا ہمارے دماغوں میں' پورے گاؤں کے لڑکے مجھ سے
حسد کرتے تھے کہ زینب جیسی سوہنی کڑی میرے بس میں ہے۔ ہمارے گھرانوں میں
کی رشتہ داری بھی تھی۔ بات جب پھیلنے لگی تو بڑوں نے ہماری منگنی کر دی۔ اس
لڑکپن میں ہی زینب میری منگ بن گئی۔ میں ایک یتیم لڑکا تھا۔ ماں باپ بچپن میں
فوت ہو گئے تھے۔ صرف ایک چھوٹا بھائی تھا' جسے میں بیٹے کی طرح سمجھتا تھا اور باپ بن
کر پال رہا تھا۔ میں جاگیرداروں کا کاماں تھا اور نوعمری میں ہی میں نے سخت محنت سیکھ لی
تھی۔ چودھری واصف مجھے انگریزی میں "نوبے کا لڑکا" کہا کرتے تھے۔ آپ کو پتہ نہیں
کہ سخت سردی میں زخمی مرغابی کو ٹھنڈے ٹھار پانی سے نکال کر لانا کتنا مشکل ہوتا ہے
میں چودھری صاحب کے لئے یہ کام کیا کرتا تھا۔ وہ شکار پر ہمیشہ مجھے ساتھ رکھا کرتے تھے
میرا کام چودھری صاحب کے گھوڑوں اور شکاری کتوں کی دیکھ بھال تھا اور یہ کام میں
تک بڑی محنت سے کرتا رہا ہوں۔ لڑکپن سے میرے دل میں دو ہی خواہشیں تھیں
ایک زینب کو حاصل کرنا اور دوسرے اپنے چھوٹے بھائی "جانی" کو کسی قابل بنانا۔
اسے پڑھا رہا تھا اور تیسری جماعت کے بعد اسے اس کے خالو کے پاس شہر بھیج دیا تھا
وہیں رہتا تھا۔ میں نے اسے کبھی گاؤں میں نہیں آنے دیا۔ اگر کبھی خون زیادہ جوش مارتا
تو شہر جا کر اس سے مل آتا تھا۔ اس کا تعلیمی خرچا پورا کرنے کے لئے مجھے ضرورت سے
زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی مگر میں پرواہ نہیں کرتا تھا۔ زینب کی محبت میں کچھ اتنی

تھی کہ میں ہر مشکل ہنس کر سہہ لیتا تھا۔ آپ یقین نہیں کریں گی بی بی جی! میں سارا سارا
دن اور ساری ساری رات کام کیا کرتا تھا۔ سارا دن جانوروں کی دیکھ بھال اور راتوں کو
کھیتی میں کام۔ ان دنوں خون میں جوش بھی کچھ زیادہ تھا۔ یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ سونا ہے
آرام بھی کرنا ہے۔ ان ہی دنوں ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ زینب کا ایک دعویدار
پیدا ہو گیا۔ یہ ساتھ والے گاؤں کا نوجوان جراح دین محمد تھا۔ دین محمد کے باپ قدرت علی
سے زینب کے باپ اکبر نے اپنی شادی پر دو سو روپیہ بیاج پر قرض لیا تھا۔ یہ قرض اب
بڑھتے بڑھتے بیس سالوں میں پانچ ہزار روپیہ ہو چکا تھا۔ قدرت علی کا بیٹا دین محمد اس رقم کی
وصولی چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا یا تو قرض چکا دو یا زینب کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ زینب
کا بوڑھا باپ اس بارے میں سخت پریشان تھا۔ مجھے جب اس بات کا پتہ چلا تو تن من میں
آگ لگ گئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جیسے بھی ہو زینب کے سر سے اس قرض کی گالی اتار
کر رہوں گا۔ ایک روز میں زینب سے ملا اور اس سے وعدہ کیا کہ جب تک میں تیرے
باپ کا قرض نہ اتار لوں گا تجھے چھوؤں گا اور نہ تیری شکل دیکھوں گا۔ زینب اس دن
رونے لگی تھی۔ اس نے کہا تھا "رحمت! میرے اور اپنے درمیان ایسے قول کی دیوار
کھڑی نہ کر جو پورا نہ ہو سکے' تیرے دو ہاتھ ہیں کوئی چار ہاتھ نہیں' کتنا کام کرے گا تو'
اپنی ہڈیاں رول لے گا اپنی' یہ میرے باپ کا مسئلہ ہے وہ کسی نہ کسی طرح حل کر ہی لے
گا۔"

میں نے زینب کی کوئی بات نہیں مانی تھی اور اسے دلاسہ دے کر گھر واپس بھیج دیا
تھا۔ اس کے بعد ڈھائی تین برس مجھے اپنے آپ کا ہوش نہیں رہا۔ میں نے جاگیردار کی
حویلی میں' ان کے اصطبل میں' ان کے کھیتوں میں ہر جگہ خون پسینہ بہایا اور پائی پائی جمع
کرتا رہا۔ آخر وہ دن آیا جب میری مٹھی میں پانچ ہزار روپے کے نوٹ تھے اور دل میں
حوصلہ تھا کہ اب میں اپنی زینب کو ہر بندش سے آزاد کر سکوں گا...... مگر قدرت میری
بھولی پر مسکرا رہی تھی۔ میں نے سوچا کچھ تھا اور ہوا کچھ۔ میں صبح اٹھ کر کنوئیں کی
طرف جا رہا تھا کہ چودھری صاحب کے دو ملازموں نے مجھے راستے میں روک لیا۔ انہوں
نے کہا تمہیں فوراً حویلی میں بلایا گیا ہے۔ میں حویلی میں پہنچا تو رب نواز بڑے ٹھاٹ سے
اپنی کرسی پر بیٹھا تھا...... رب نواز کو تو آپ جانتی ہیں نا...... وہی جو انگریزی رائفل کے

ساتھ ہر وقت دم کی طرح چودھری واصف کے ساتھ رہتا تھا۔ آج کل وہ ہسپتال
ہے۔ رب نواز کے پاس ہی دونوں منشی بیٹھے ہوئے تھے اور میز پر بہی کھاتے کھلے
تھے۔ میں وہاں پہنچا تو رب نواز نے مجھے ایک طرف بیٹھنے کا حکم دیا۔ بڑے منشی نے
پرانے کھاتے کے کچھ صفحے الٹ پلٹ کئے اور اسے رب نواز کے سامنے رکھ دیا۔ رب
نواز نے کہا۔

"رمے' تجھے پتہ ہے نا کہ تو پکا کاماں ہے؟" میں نے "ہاں" میں جواب دیا۔ رب
نواز نے پوچھا۔ "یہ بھی پتہ ہے کہ پکا کاماں کا کس کو کہتے ہیں؟" میں نے انکار میں سر ہلا
اور یہ بات تھی بھی صحیح' میں بچپن سے سنتا آیا تھا کہ ہم حویلی کے "پکے کامے"
لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ "پکا کاماں" کس کو کہتے ہیں۔ رب نواز نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے
مجھے گھورا اور بولا "پکا کاماں وہ ہوتا ہے جو جاگیردار کے پاس گروی ہو' اس پر قرضہ
ہے۔ وہ جاگیردار کی مرضی کے بغیر کام چھوڑ سکتا ہے اور نہ کہیں جا سکتا ہے۔ بڑے
جاگیردار صاحب کے زمانے میں تو بھاگنے والوں کو ٹکٹکی پر لگا کر ان کی چمڑی ادھیڑ دی
تھی مگر ہمارے جاگیردار واصف صاحب دل کے نرم ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کو ٹکٹکی
نہیں چڑھایا اور اس کا نتیجہ پتہ ہے کیا نکلا ہے...... اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب تک
کے کوئی ایک سو "پکے کامے" حرامی پن دکھا چکے ہیں...... اور ان میں تیرا بھائی بھی
ہے جو شہر میں خیر سے تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ جاگیردار صاحب نے کل حکم دیا ہے
ایسے جتنے بھی "کامے" بھاگے ہوئے ہیں انہیں پکڑ کر لایا جائے اور جاگیر میں کام پر
جائے۔ اب تو بتا تیری مرضی کیا ہے؟"

میری آنکھوں کے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا جاگیردار کے کارندے
میرے بھائی کو پکڑ کر لے آئیں گے۔ اس کی پینٹ بو شرٹ اتار کر اور اس کا سر مونڈ کر
اسے لنگوٹی پہنائی جائے گی اور کھیتوں میں کام پر لگا دیا جائے گا۔ میں سر سے پیر تک
گیا۔ وہ کہاں تھا اتنے جوگا' اسے تو پتہ ہی نہیں تھا محنت مشقت کیا ہوتی ہے۔ وہ تو
کے خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے رب نواز کی منت کی کہ مجھے ایک بار جاگیردار صاحب
بات کر لینے دو۔ وہ مکاری سے مسکرایا اور اس نے بتایا کہ جاگیردار صاحب کل
والی گاڑی سے کراچی چلے گئے ہیں اور اب تو ولایت جانے والے جہاز میں بھی بیٹھ

ہوں گے۔ میں سمجھ گیا کہ جاگیردار صاحب مجھے اور مجھ جیسے دوسرے بدنصیبوں کو اپنے
خونخوار کتے کے حوالے کر کے چلے گئے ہیں۔ اب ہم تھے اور رب نواز کا ڈنڈا تھا......
ابھی رب نواز مجھ سے باتیں ہی کر رہا تھا کہ اس کے کارندے کسی قریبی گاؤں سے تین
چار "پکے کاموں" کو پکڑ کر لے آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ ان سب کے ہاتھ
رسیوں میں بندھے ہوئے تھے اور انہیں بری طرح مارا گیا تھا۔ وہ چوروں کی طرح سر
جھکائے کھڑے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹنے لگا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر رب نواز سے کہا۔

"خاں جی! کسی طرح بچت نہیں ہو سکتی۔ میرا بھائی جانی تو کڑیوں کی طرح ہے۔
اس سے کہاں گھوڑوں کی مالش کی جائے گی اور کسی چلائے جائے گی؟"

رب نواز نے شیطانی ہنسی ہنس کر کہا "تو دیکھنا یہاں تو کڑیاں بھی تیر کی طرح
سیدھی ہو جائیں گی وہ تو پھر منڈا ہے۔"

میں نے رب نواز کے قدموں میں سر رکھ کر کہا "خاں جی! کچھ رحم کرو۔"

وہ بولا "رحم میرے قدموں میں نہیں اس رجسٹر میں ہے۔ انگوٹھے لگے ہوئے ہیں
یہاں پر تیری تین پشتوں کے' آٹھ ہزار روپیہ فی بھائی قرضہ ہے تم دونوں پر' بھائی کو شہر میں
رکھنا چاہتے ہو تو چار دن کے اندر اندر آٹھ ہزار روپیہ لے آؤ ورنہ بھائی کو لے آؤ.........
ہاں...... چار دن کی مہلت بھی تمہیں دے رہا ہوں ورنہ ابھی مشکیں باندھنے والوں
کو بھیج دیتا اس کی طرف.........؟

میں دل پر بہت بھاری بوجھ لئے گھر چلا آیا...... اب ایک طرف میرا بھائی تھا اور
دوسری طرف میری محبت' مجھے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ قرض چکانے والا
ایک تھا اور قرض خواہ دو' دونوں ایک سے ایک بڑھ کر سخت تھے۔ رہائی کسی بھی طرف
نہیں تھی۔ وہ دن میرے لئے بہت سخت تھے۔ آخر سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ
کچھ بھی ہو جائے بھائی کی زندگی تباہ نہیں ہونے دوں گا۔ وہ میرا بھائی ہی نہیں بیٹا بھی تھا۔
میں نے اس پر سب کچھ قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ منت سماجت کر کے رب نواز کو چھ
ہزار روپے پر راضی کیا اور ایک ہزار قرض لے کر بھائی کی آزادی کی قیمت چکا دی۔ اس
واقعے کے دو مہینے بعد زینب کی شادی دین محمد سے ہو گئی۔ جس رات زینب کی شادی تھی

میں بہت رویا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرا سب کچھ لٹ گیا ہے اور زندہ رہنے کا کوئی فا
نہیں مگر اس روز شہر سے میرے بھائی کا خط آیا جس میں اس نے لکھا کہ اس نے دسو
امتحان پاس کر لیا ہے۔ میرے اندر جیسے پھر جینے کی آس بندھ گئی۔ میں نے سوچا رح
علی تو نے کچھ کھویا ہی نہیں کچھ پایا بھی ہے اور کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔"

اپنی کہانی کے اس موڑ پر رحمت سانس لینے کے لئے رکا' پھر کھوئی ہوئی آواز
بولا "بی بی جی! میرا بھائی اب برسرروزگار ہے۔ محکمہ جنگلات میں ملازم ہے۔ کوئی بڑا اف
نہیں بنا مگر اپنی روٹی عزت سے کما رہا ہے اور افسروں میں رکھا بھی کیا ہے۔ ماشاء اللہ
پیسے بھی جمع کر چکا ہے اب جلد ہی شادی کر دوں گا اس کی' بڑا بھلا مانس ہے۔ اتنا نیک
کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ اس کی شادی کی بات کرتا ہوں تو لڑکیوں کی طرح شرما جاتا ہے۔"

میں نے دیکھا رحمت کی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن تھا۔ وہ جیسے تصور
بھائی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے نگاہیں ملیں تو ٹھٹھک سا گیا۔ سر جھکا کر بولا "آپ
سوچ رہی ہوں گی بھائی کی شادی کی باتیں کر رہا ہے' مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں
آپ کا اندازہ درست ہے بی بی جی' میں نے شادی نہیں کی اور اب تو عمر بھی گزر
ہے۔ اب سرا باندھتا کیا اچھا لگوں گا۔ سچ پوچھیں تو مجھے اب کوئی آرزو بھی نہیں۔ صر
ایک ہی تمنا ہے کہ بھائی کو بیاہوں اور اسے پھلتا پھولتا دیکھوں۔ رات دن اسی فکر
رہتا ہوں کبھی سوچتا ہوں جاگیرداروں سے بگاڑ کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ میری زند
اب کوئی بھروسا نہیں رہا۔ جانی کے فرض سے جتنی جلدی سبکدوش ہو جاؤں اچھا ہے
اس کے بال بچے دیکھنا تو شاید اب میری قسمت میں نہیں ہے" باتیں کرتے کرتے رح
یک دم اداس ہو گیا۔ بے خیالی میں اپنے زخمی ہاتھ کو سہلاتا ہوا بولا۔

"سمجھ نہیں آتی' زینب کدھر چلی گئی ہے۔ میں نے اسے ریسٹ ہاؤس کا را
اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ کوئی مشکل بھی نہیں تھا۔ پل کی سیدھ میں چلتے جانا تھا آگے
راستہ آتا ہے۔ یہی ایک راستہ ہے پکی سڑک تک پہنچنے کا۔ بچے بچے کو معلوم ہے
راستے کا۔ تقریباً ایک کوس چل کر اسے ریسٹ ہاؤس میں پہنچ جانا تھا۔ اس ریسٹ ہاؤ
نگران میرا اپنا بھائی ہے۔ فارسٹ گارڈ ہے وہ' اسے میں نے سب کچھ سمجھا رکھا تھا
بیچارا ساری رات جاگتا رہا پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے وہ۔"

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اس طویل گفتگو کے دوران میں نے پہلی بار
اپنی زبان کھولی "کیا نام ہے تمہارے بھائی کا؟" میں نے ایک موہوم خدشے کے تحت
پوچھا۔

"جان محمد جی...... ویسے میں ہمیشہ اسے جانی کہتا ہوں۔ وہ ہے بھی تو میرا دل جانی'
وہ میرا سب کچھ ہے بی بی جی' بڑے لاڈ دیکھے ہیں میں نے اس کے......"

رحمت پتہ نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔
کانوں میں "جان محمد" کے الفاظ گونج رہے تھے۔ یہ نام ایک دفعہ پہلے بھی سن چکی تھی۔
زینب نے اس شخص کا نام لیا تھا۔ اس رات جب وہ لٹی پٹی ہمیں درختوں کے جھنڈ میں
ملی تھی اور اپنے گھر چولہے کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنی بپتا سنائی تھی اس نے کہا تھا کہ
اس کی عزت برباد کرنے اور اسے ذلیل و خوار کرنے والے شخص کا نام جان محمد ہے اور
اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ فارسٹ گارڈ ہے...... "فارسٹ گارڈ جان محمد" میں زیرلب
بڑبڑائی' اور ایک ہی لمحے میں ساری صورت حال مجھ پر واضح ہوتی چلی گئی۔ واقعات کی
بہت سی کڑیاں خودبخود مربوط ہو گئیں۔ اس کا مطلب تھا رحمت نے اس رات بے خبری
میں زینب کو ایک ایسے شخص کی طرف بھیج دیا تھا جو اس کی جان اور عزت کے لئے بہت
بڑا خطرہ تھا۔ رحمت جسے اپنا "نیکو کار بھائی" کہہ رہا تھا وہ ایک بے رحم لٹیرا بھی تھا۔ یقینی
بات ہے کہ زینب اس تک پہنچی تھی اور اس نے اسے اپنی ہوس کی قید میں ڈال دیا تھا
یا...... جان سے مار دیا تھا' اس شخص سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ اگر
میرا اندازہ درست تھا اور یہ جان محمد وہی تھا تو پھر زینب کے بارے کوئی اچھی امید رکھنا
نادانی تھی۔

رحمت نے میرے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھے تو بولا "بی بی جی! کیا بات ہے؟ کیا
آپ...... جانی کو جانتی ہیں؟"

"نہیں" میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رحمت کو اس
طوفان سے کیسے آگاہ کروں جو میرے سینے میں ہلچل مچا رہا تھا۔ وہ شخص جس نے پوری
زندگی اپنے بھائی کی بہتری کے لئے وقف کر دی تھی اور اسے ایک باعزت شریف انسان
بنا کر خوش ہو رہا تھا۔ اب اس کا اصل چہرہ دیکھے گا تو اسے کیسا لگے گا؟ یہ سوچ کر ہی میری

روح لرز گئی۔ رحمت الجھی الجھی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا "کل میں زینب کے گاؤں بھی گیا تھا۔ اس کے بچوں کا برا حال ہے۔ لاوارث بچوں کا کون بنتا ہے اور ان سے تو گاؤں کے لوگ ویسے بھی کنی کترا رہے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ زینب نے جاگیردار کے قاتلوں کو پناہ دے کر بڑی بے وقوفی کی ہے اور اب اس کے اور اس کے بچوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے۔ کوئی ان کے سر پہ ہاتھ رکھنے کی ہمت نہیں کر رہا۔ میں رات کے اندھیرے میں گیا تھا اور تین چار دن کا راشن ایک پوٹلی میں باندھ کر ان کے صحن میں پھینک آیا ہوں۔ اللہ کرے انہیں مل گیا ہو......" رحمت بہت سی باتیں کر رہا تھا لیکن میں کچھ نہیں سن رہی تھی۔ میرا ذہن تو فارسٹ گارڈ جان محمد اور زینب میں الجھا ہوا تھا۔ اس بے رحم شخص نے نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟ میں نے سر درد کا بہانہ کر کے رحمت کو باہر بھیج دیا اور آنکھیں بند کر کے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگی۔

اگلے روز کی بات ہے۔ رحمت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کہا دیکھو رحمت، جان محمد تم سے چھوٹا ہے اور چھوٹوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ کبھی معمولی اور کبھی سنگین۔ میرا خیال ہے کہ تمہارے بھائی سے بھی ایک سنگین غلطی ہوئی ہے۔ لیکن امید کرتی ہوں کہ تم بڑے پن کا ثبوت دو گے اور اس معاملے کو تحمل سے سلجھانے کی کوشش کرو گے......" اس کے بعد میں نے نسبتاً نرم لفظوں میں اور احتیاط کے ساتھ ساری بات رحمت کے گوش گزار کر دی اور اسے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے خدشہ ہے زینب اس وقت بھی ریسٹ ہاؤس میں جان محمد کے پاس ہو گی۔

رحمت بے پناہ تحیر اور کرب کے عالم میں یہ سب کچھ سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں اس نے مجھ سے کچھ سوالات بھی کیے جن کے میں نے تسلی بخش جوابات دیئے۔ آخر میں اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس حالت میں وہ مجھے بے حد قابل رحم شخص محسوس ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا لیا اور دیر تک دائیں بائیں سر ہلاتا رہا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا بی بی جی! مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

پھر اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ میں سخت پریشانی کے عالم میں دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی اور دعا کرتی رہی کہ کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے۔

رحمت سے گفتگو کے بعد اب مجھے اس بات میں ذرہ برابر شک نہیں رہ گیا تھا کہ رحمت کا بھائی فارسٹ گارڈ جان محمد وہی ہے جس کا تذکرہ کئی روز پہلے زینب نے کیا تھا.........

رحمت کی واپسی قریباً تین گھنٹے بعد ہوئی۔ زینب بھی اس کے ساتھ تھی۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھا۔ اس وقت شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ زینب سرتاپا کسی بڑی چیک دار چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ رحمت اسے میرے کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے قریب سے رحمت کی صرف ایک جھلک دیکھی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں جیسے خون تیر رہا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے چلا گیا تھا۔ اندر آ کر زینب نے چادر الٹ دی اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ رونے اور بین کرنے لگی۔

"چودھرانی جی یہ کیا ہو گیا۔ تیری گود کو کس کی نظر کھا گئی۔ ہائے ربا' کیا بگاڑا تھا اس معصوم نے کسی کا........"

وہ بڑے دردناک الفاظ میں فرحان کو یاد کر رہی تھی۔ اس کے گرم آنسو میری گردن کو بھگو رہے تھے لیکن میری اپنی آنکھوں میں نمی تک نہیں تھی۔ بس ایک جلن سی تھی پلکوں کے نیچے۔ دل جیسے پتھر ہو کر رہ گیا تھا۔ میں پورے ہوش و حواس میں تھی اس کے باوجود مجھے رونا نہیں آ رہا تھا۔ فرحان کو رو دھو کر زینب میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے سپاٹ آواز میں پوچھا "کہاں تھی تو؟"

زینب میرے سوال کو نظرانداز کر کے بولی "بہت مارا ہے رحمت نے اس شیطان کو' لاٹھیاں مار مار کر دونوں بازو توڑ ڈالے ہیں اس کے' اللہ کی پناہ رحمت تو جیسے غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اگر میں نہ بچاتی تو وہ ضرور اسے جان سے مار ڈالتا۔ اب بھی کچھ پتہ نہیں کہ بچتا ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے شروع سے بتا ہوا کیا تھا؟"

جواب میں زینب نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔ "اس رات زینب کو باپ کے چنگل سے نکال کر رحمت نالے کے پار چھوڑ آیا تھا۔ اس نے کہا تھا میں ابھی تھوڑی دیر میں بی بی اور اس کے بچے کو بھی مکان سے نکال دوں گا۔ اس کے بعد پروگرام کے مطابق ہم تینوں کو ریسٹ ہاؤس میں پہنچنا تھا جہاں بقول رحمت اس کا چھوٹا بھائی جانی

ہماری میزبانی کے لئے موجود تھا....... زینب سخت سردی میں قریباً تین گھنٹے کماد کے کھیت میں چھپی میرا اور فرحان کا انتظار کرتی رہی۔ آخر مایوس ہو کر آہستہ آہستہ ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دی۔ وہ سحری کے وقت وہاں تک پہنچ سکی۔ ریسٹ ہاؤس میں جس شخص نے اس کا استقبال کیا وہ نوجوان گارڈ جان محمد تھا۔ جان محمد کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئی۔ جان محمد نے اسے پکڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اسے ایک سٹور میں بند کر دیا...... وہ اب تک اسی سٹور میں قید تھی۔ جان محمد سخت خوفزدہ تھا۔ وہ بدکردار تو تھا مگر بھائی سے بہت ڈرتا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے خوف تھا کہ زینب اس کے بھائی کے سامنے اس کا کچا چٹھا کھول دے گی۔ دوستوں کے ساتھ مل کر جو شیطانی کھیل اس نے زینب کے ساتھ کھیلا تھا' اس کے ضمیر کو کچوکے لگا رہا تھا۔ ایک رات وہ نشے میں دھت ہو کر زینب کے کمرے میں آگیا۔ اس نے زینب کو خوفناک دھمکیاں دیں اور کہا کہ اگر اس نے اس کے بھائی کو کوئی بات بتائی تو وہ اس کو بچوں سمیت قتل کر دے گا۔ زینب خوفزدہ ہو گئی۔ جان محمد کے مجبور کرنے پر اس نے اپنے بچوں کی قسم کھالی کہ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ جان محمد نے کہا "اور لالے رحمت کو یہ بھی نہیں بتائے گی کہ تو یہاں پہنچی تھی" زینب نے اس بات کا بھی وعدہ کر لیا۔ جان محمد نے عندیہ ظاہر کیا کہ وہ ایک دو دن تک اسے چھوڑ دے گا مگر بعد میں اس نے پھر ارادہ بدل دیا۔ اس کا شک دور نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ راز راز نہیں رہ سکے گا۔ زینب سخت الجھن میں تھی۔ جان محمد کے دم بدم رنگ بدلتے مزاج نے اسے خوفزدہ کر رکھا تھا۔ کبھی تو اسے لگتا کہ جان محمد وحشی درندے کی طرح اس پر جھپٹ پڑے گا اور وہ سب کچھ کر گزرے گا جس کی اس سے توقع کی جا سکتی ہے....... لیکن کسی وقت وہ اس کی جان بخشی پر آمادہ نظر آنے لگتا....... آج وہ پھر بہت مشتعل نظر آ رہا تھا۔ زینب سہمی ہوئی اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اتنے میں کچھ فاصلے سے تیز تیز باتوں کی آواز آئیں۔ اس کے بعد مار پیٹ ہونے لگی۔ زینب نے چارپائی پر کرسی رکھ کر روشن دان سے جھانکا....... رحمت اپنی لاٹھی سے جان محمد کو روئی کی طرح دھنک رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ لاٹھی ٹوٹ گئی تو اس نے ایک کرسی اٹھالی اور وہ جان محمد کے سر پر مار مار کر

وزدی۔ زینب کو خدشہ لاحق ہوا کہ وہ اسے جان سے ہی مار ڈالے گا۔ وہ سٹور میں بند زور زور سے چیخنے لگی۔ اس کی چیخیں رحمت کو ہوش میں لے آئیں۔ رحمت نے ٹوٹی ہوئی کرسی ایک طرف پھینکی اور دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر رونے لگا۔ بعدازاں اس نے زینب کو سٹور سے نکالا اور اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا کر یہاں لے آیا۔"

یہ تھی زینب کی کل کہانی' یہ سب کچھ مجھے سنانے کے بعد وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ بچوں کی جدائی نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ ان سے جدا ہوئے اسے اب تین ہفتے ہونے کو آئے تھے۔ زینب کے رونے کی آواز سنی تو رحمت ہمارے پاس چلا آیا۔ اس کے غصے کا چڑھا ہوا دریا اب کچھ اتر چکا تھا۔ اس نے زینب سے کہا۔

"زینب! حوصلہ رکھ' سب ٹھیک ہو جائے گا" میں نے ابھی ایک بندا بھیجا تھا بک۱۴اس نے بتایا ہے کہ بچے ٹھیک ٹھاک ہیں انہیں راشن بھی مل گیا ہے۔ تیری بڑی لڑکی روٹی شوٹی پکالیتی ہے۔"

زینب نے کہا "میں ان کی شکلوں کو ترس گئی ہوں۔"

رحمت بولا "زینب! تجھے صبر سے کام لینا پڑے گا نہ تو اس وقت اپنے گھر جا سکتی ہے نہ بچے یہاں آسکتے ہیں۔ تو تو جانتی ہی ہے چنگیزی ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ اپنی اور بچوں کی جان کی دشمن نہ بن۔ مجھے کچھ سوچنے دے۔ کوئی حل نکالنے دے مجھے۔"

یہ اگلی رات کا واقعہ ہے میں اور زینب اس کمرے میں لیٹی ہوئی تھیں۔ زینب کہہ رہی تھی "بی بی جی! میں آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ اللہ کرے میں مر جاؤں۔ وہ مرن جوگا میرا بھائی نہ آپ کی مخبری کرتا اور نہ یہ قیامتیں گزرتیں آپ پر' آپ کے بچے کی جگہ اس کے اگلے پچھلے کیوں نہ مر گئے۔"

میں نے کہا "بس کرو زینب' کسی کا کچھ قصور نہیں' جو لکھا تھا وہی ہوا ہے۔ اب چھوڑ بھی دے اس بات کو" وہ دیر تک رضائی میں سر دے کر سسکتی رہی اور پھر نڈھال ہو کر سو گئی۔ وہ سو گئی لیکن میری نیند تو شاید آنکھوں کا رستہ ہمیشہ کے لئے بھول چکی تھی۔ میں جاگتی رہی۔ چند منظر تھے جو بار بار آنکھوں کے سامنے آتے تھے۔ میرا اور سلیم کا حویلی سے جان بچا کر نکلنا' پھر زینب کے گھر سلیم کا خنجر سے زخمی ہو کر گرنا' زینب کا فرحان کو لے کر بھاگنا اور آخر میں فرحان کا زرد چہرہ' جان سے خالی' مسکراہٹ سے عاری' ننھا سا

تھکاہارا نڈھال فرشتہ جس کی آنکھیں میرا رستہ دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی تھیں۔ آہ کیسے مرا ہو گا وہ‘ اکیلا....... تنہا رو رو کر ہچکیاں لے لے کر‘ اس نے مجھے بڑا تلاش کیا ہو گا‘ بڑا ڈھونڈا ہو گا مجھے....... جی چاہا رو دوں‘ اتنا روؤں کہ میرا کلیجہ پانی ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ جائے اور میں مر کر فرحان کے پاس پہنچ جاؤں۔ مگر آنسو اور نیند تو ایا کر چکے تھے۔ انہیں میری آنکھوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ یکایک کسی نے میرے پاؤں کو ہلایا اور میں اٹھ گئی۔ میری پائنتی رحمت کھڑا تھا۔ اس نے ایک تہہ شدہ کاغذ میری طرف بڑھایا اور اشارے سے کہا کہ میں اسے زینب کی نظر سے بچا کر پڑھ لوں۔ میں نے ایک نظر سوئی ہوئی زینب کی طرف دیکھا اور کاغذ رکھ لیا۔ رحمت جیسے آیا تھا ویسے ہی دروازہ بھیڑ کر دبے پاؤں واپس چلا گیا۔ یہ ایک کاپی سائز ورق تھا۔ میں نے سرہانے رکھی لالٹین کی لو اونچی کی اور پڑھنے لگی۔ رحمت ان پڑھ تھا اس نے یقیناً کسی ہمراز سے لکھوایا تھا۔ خط کا مضمون کچھ یوں تھا۔

”بی بی جی! السلام علیکم! جو بات منہ سے نہیں کہہ سکتا اس کے لئے خط کا سہارا لے رہا ہوں۔ بی بی جی! آپ عقل والی ہیں۔ اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ میں نے زینب کے بارے میں بڑی سوچ بچار کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسے اور اس کے بچوں کو سہارے کی بڑی ضرورت ہے۔ میں سچے دل سے زینب کا خیر خواہ ہوں اور اسے سکھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے جو کچھ کرنا پڑا کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کوئی مناسب شخص دیکھ کر اس سے شادی کر لے اور اس کے ساتھ اس علاقے سے کہیں دور نکل جائے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے اس کے محفوظ رہنے کا‘ اب مجھے اس کے دل کا کچھ پتہ نہیں وہ کیا چاہتی ہے اور کیا سوچتی ہے۔ آپ ذرا اس کو ٹٹولیں جہاں تک میرا سوال ہے بی بی جی! میرے لئے وہ اب بھی اسی طرح قابل عزت ہے دنیا والے جو چاہیں سمجھیں میرے لئے وہ وہی دس سال پہلے والی زینب ہے۔ میں ہر حال میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اس مختصر سے خط نے مجھے وہ سب کچھ سمجھا دیا جو رحمت سمجھانا چاہتا تھا۔ اس خط کے بغیر بھی میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ رحمت کی آنکھوں میں آج بھی زینب کی تصویر ہے اور اس کے بازو کی طرح پکی روشنائی سے ایک نام اس کے دل پر بھی

کندہ ہے۔ جو بات انسان خود نہیں کہتا وہ اس کی آنکھیں کہتی ہیں اور جسم کا ہر عضو کہتا ہے....... اگر رحمت زینب سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا تو یہ بہت اچھی بات تھی۔ اسے حق تھا اپنے بارے میں سوچنے کا اور وہ کوئی انجان شخص نہیں تھا۔ اگلے روز میں نے موقع دیکھ کر زینب سے اس بارے میں بات کی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی شفاف آنکھوں میں خوشیوں کے رنگ لرزے۔ وہ ایک ساعت میں نو دس برس کا فاصلہ طے کر کے ایک کنواری الہڑ دوشیزہ بن گئی جس کے لئے ہر کھیت کھلیان اور پن گھٹ ایک سیرگاہ تھا اور جس کی نگاہیں گاؤں کے گلی کوچوں میں اپنے محبوب سے آنکھ مچولی کھیلتی تھیں....... مگر دوسرے ہی لمحے یہ سارے رنگ اڑ گئے۔ الہڑ دوشیزہ کہیں دور چلی گئی اور حیت کی ماری چار بچوں کی ماں مایوسی سے میرا چہرہ دیکھنے لگی۔

”نہیں چودھرانی۔“ اس کے ہونٹوں سے ایک مستحکم آواز نکلی ”میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی۔ مجھے کوئی حق نہیں کسی کی حیاتی اجاڑنے کا۔ اب تو جو چار دن رہ گئے ہیں کسی طرح کٹ جائیں تو خلاصی ہو۔“

میں نے کہا ”زینب....... تیری سوچ غلط ہے۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے‘ شکل صورت بھی اچھی ہے‘ تو جسے چار دن کی زندگی کہہ رہی ہے وہ پہاڑ جیسی زندگی بھی ہو سکتی ہے۔ کیسے کاٹے گی یہ سفر؟....... رحمت بہت اچھا ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ تم دونوں خوش رہو گے‘ وہ تجھے اور تیرے بچوں کو کوئی دکھ نہیں دے گا۔ ہمت کر....... یہ قدم اٹھا لے.......“ میں نے زینب کو بہت سمجھایا لیکن مگر وہ کسی طور رضامند نہیں ہوئی۔ صرف ایک دلیل تھی جو اسے کچھ سوچنے پر مجبور کرتی تھی اور وہ دلیل اس کے بچوں کے متعلق تھی۔ ان کی سلامتی کے لئے وہ ہر حد تک جانے کو تیار تھی....... آخر کئی روز کی سوچ بچار کے بعد اس کا انکار خاموشی اور پھر نیم رضامندی میں بدل گیا۔ میں نے رحمت کو اس کامیابی سے آگاہ کیا۔ اندرونی مسرت اس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چمکنے لگی۔ اس نے کہا۔

”بی بی جی‘ میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نہ ہوتیں تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں آج ہی کراچی اپنے دوست کو اطلاع دے دیتا ہوں‘ وہ ایک دو دن میں ہماری رہائش کا بندوبست کر دے گا۔“ بات کرتے کرتے اچانک اس کی آواز رندھ گئی اس نے

آنکھوں پر مفلر رکھ کر بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا۔ گلوگیر آواز میں بولا "بس بی بی
جی' میں ہی پاگل تھا۔ جھوٹے خواب دیکھتا رہا۔ ساری زندگی بھائی کو بنانے کی کوشش کر
رہا اور اسے بنایا بھی تو کیا؟ لوفر' بدمعاش اور بدکردار۔ بس جی میں ہار گیا ہوں' اب م
اپنے لئے تھوڑا سا جینا چاہتا ہوں۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آؤں
گا اور نہ ہی اس بدبخت کو اپنی صورت دکھاؤں گا۔ وہ میرے لئے مر گیا ہے اور میں اس
کے لئے۔"

ایک دو روز میں سب معاملات طے ہوگئے۔ رحمت نے پال پور جا کر چودھر
شہاب سے اجازت لے لی۔ وہ رات کو رازداری سے زینب کے گھر بھی پہنچا اور اس
بچوں کو ضروری سامان سمیت لے آیا۔ زینب بچوں کو دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہوگئی' ایک
ایک کا منہ چومتی اور سینے سے لگاتی۔ چودھری شہاب کے خاص کارندوں اور خود چودھ
شہاب کو بھی یہی پتہ تھا کہ رحمت صوبہ سرحد کے کسی قصبے کا رخ کر رہا ہے۔ کراچی
بارے میں میرے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ روانگی سے ایک رات پہلے زینب میرا ہاتھ تھا
کر بہت روئی۔ کہنے لگی۔

"چودھرانی جی......... آپ کی حالت دیکھ کر میرا دل خون ہوتا ہے۔ آپ
ہمارے ساتھ چلی چلیں۔ آپ کی اور میری کہانی ایک ہی تو ہے۔"

میں نے کہا "میری اور تیری کہانی ایک ہی تھی لیکن اب نہیں۔ میں خالی ہاتھ ہو
اور تیرے پاس کھونے کے لئے اب بھی بہت کچھ ہے۔ اس بہت کچھ کو لے کر یہاں
دور چلی جا۔"

زینب نے کہا "اور آپ؟"

"میں بھی کسی طرح جی ہی لوں گی۔"

"چودھرانی' کبھی کبھی مجھے بڑا ڈر لگتا ہے' آپ کہیں کچھ کر نہ بیٹھیں۔"

"نہیں زینب' میں خودکشی نہیں کروں گی۔"

"ان مرن جوگے جاگیرداروں سے متھا لگانا بھی تو خودکشی ہے چودھرانی جی'
چھوڑ کیوں نہیں دیتیں اس علاقے کو؟ میری مانیں تو چپ کرکے پولیس کے سامنے پیش
جائیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ ظلم آپ نے نہیں کیا آپ پ

"ٹھیک ہے زینب...... ایسا ہی کروں گی۔"

وہ دیر تک خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

"آپ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کریں کہ کوئی......... کوئی خطرے والا کام نہیں
کریں گی۔"

"زینب میرا سر چکرا رہا ہے" میں نے اکتا کر کہا "تم سو جاؤ پلیز' میں کچھ نہیں
کیا کرسکتی ہوں میں؟"

اگلے روز زینب اور رحمت چلے گئے۔ شام کی تاریکی پھیلتے ہی حویلی کے دروازے
ایک کھٹارہ ویگن آ کر رکی۔ رحمت نے زینب اور بچوں کو اس میں سوار کرایا اور
رخصت ہوگئے۔ میں کمرے میں بیٹھی دیر تک دور جاتی ویگن کی آواز سنتی رہی۔ ایک
تھا کہ میں' فرحان اور سلیم اسی طرح کراچی جانے کا سوچ رہے تھے۔ ہم نے ایک نئی
شروع کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اب سلیم تھا اور نہ فرحان سب کچھ ختم ہوگیا
... اور اب ہماری طرح دو اور ستم رسیدہ انسان جاگیردار کے قہر و جبر سے جان بچانے
کے لئے پناہ کی تلاش میں نکلے تھے۔ میرے لب ان کے لئے مسلسل دعائے خیر کر رہے
جیپ کی آواز مدہم ہوئی اور پھر معدوم ہوگئی۔ جیسے یہ آواز میرے دائرہ سماعت سے
گئی ایسے ہی یہ دو المیہ کردار بھی اس جاگیر کی رنج سے ہمیشہ کے لئے اوجھل
تھے۔ میں اپنی جگہ بیٹھی سوچوں میں گم رہی۔ قریباً بیس پچیس منٹ بعد ویگن کی
آنے لگی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ لوگ واپس کیوں آ رہے تھے کیا
تھی انہیں واپس آنے کی۔ بے قرار ہو کر میں باہر آئی اور بالائی منزل پر جانے
زینے پر چڑھ کر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ گاڑی تو نظر نہیں آئی لیکن انجن
نے بتا دیا کہ یہ وہ ویگن نہیں ہے۔ کوئی جیپ قسم کی چیز تھی۔ یہ انجن کا شور
دروازے کے پاس تھا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری شہاب تیز تیز قدم اٹھاتا اندر آگیا۔
بازوؤں میں خون سے لت پت ایک نوجوان تھا۔ عمر یہی کوئی پچیس چھبیس سال
ہوگی۔ بادامی رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں ننگے تھے۔ جب چودھری
گود میں اٹھائے میرے قریب سے گزرا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

نوجوان کی گردن کے قریب کلہاڑی یا کسی دوسرے تیز دھار آلے کا گہرا گھاؤ تھا۔ اس ...
سے اس کی کٹی ہوئی نسیں اور چربی وغیرہ صاف نظر آ رہی تھی۔ دائیں پہلو میں بھی ...
زخم تھا جس سے بہنے والے خون نے پھیل کر اس کی ساری قمیض کو رنگ دیا تھا۔ ...
ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مر چکا ہے یا گہری بے ہوشی ...
ہے......... اس کے زرد چہرے پر کچھ پرانے زخم بھی تھے۔

چودھری شہاب نے مضروب کو میرے کمرے کے سامنے ایک بچھی چارپائی پر ...
دیا۔ اس کے کارندے جو عام طور پر حویلی کے اس حصے میں کم ہی آتے تھے چارپائی ...
گرد جمع ہوگئے۔ چودھری نے ایک شخص کو کہا۔

"مولے، جیپ لے جاؤ اور ڈاکٹر رفیق کو بلا لا۔ جہاں بھی ملے ڈھونڈ کر لا اور ...
اور کو ساتھ مت لانا۔ چل جلدی کر شاباش۔"

مولا جیپ کی چابی لے کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔ چودھری شہاب کی ہدایت پر ...
کے کارندے مضروب کا بہتا ہوا خون روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ چودھری شہاب ...
پونچھتا ہوا میری طرف چلا آیا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"رحمت کا بھائی جان محمد......... میں اپنے آدمیوں کے ساتھ شہر سے پیشی بھگ...
واپس آ رہا تھا کہ یہ راستے میں پڑا ہوا ملا۔ میرا خیال ہے کہ اسے چنگیزیوں نے ...
ہے........." میرا دل دھک سے رہ گیا۔ چودھری بولا۔

"رحمت اور وہ عورت کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے چلے گئے۔"

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔ رحمت کو اطلاع تو ملنی چاہئے کہ اس کے بھائی کے سا...
ہوا ہے......... کتنی دیر ہوئی ہے انہیں؟"

"""یہی کوئی آدھ گھنٹہ۔"

"اوہ......... وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ میں بندے بھیجتا ہوں ...
پیچھے۔"

"نہ چودھری صاحب" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "وہ اس آگ سے نکل ...

...نہیں نکل جانے دو۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا انہیں واپس بلا کر۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا"
...ری بضد تھا لیکن میں نے کہہ سن کر اس کا ارادہ بدل دیا......... تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر
...پہنچ گیا۔ وہ چودھری شہاب کا بھیدی لگتا تھا۔ اس نے جھک کر اسے سلام کیا اور
...زوان کے بارے میں کوئی حیرت ظاہر کیے بغیر مریض کے معائنے میں لگ گیا۔

.... جان محمد کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ سفر کے
...ل نہیں ہے اور اگر اسے اس حالت میں ہسپتال پہنچانے کی کوشش کی گئی تو جانبر نہیں
...ے گا۔ ڈاکٹر نے وہیں پر انتقال خون اور گلوکوز وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ رات پچھلے
...ر اسے تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا۔ میں اور چودھری شہاب اس کے قریب ہی موجود
...۔ جان محمد نے کمزور نحیف آواز میں بتایا کہ اسے مارنے والے چنگیزی نہیں، سانسی
...کے دو نوجوان ہیں۔ (سانسیوں کی ایک خیمہ بستی وہاں قریب ہی موجود تھی، یہ لوگ
...تو چھٹ اور جنگجو مشہور تھے) چودھری شہاب کے پوچھنے پر جان محمد نے بتایا کہ یہ
...سانسی اس کے دوست تھے مگر لالچ میں آکر انہوں نے لالے کے خلاف مخبری کرنے
...شش کی، جس پر جھگڑا ہو گیا۔"

"کون لالہ؟" شہاب نے پوچھا۔

"لالہ رحمت" جان محمد نے جواب دیا "کہاں .... ہے لالہ......... وہ یہیں پر

"ہاں ہے" شہاب نے گول مول سا جواب دیا۔ "مگر یہ سب ہوا کیسے تم تو جھنگ
...رہے تھے۔"

"میں وہاں سے بھاگ کر آیا ہوں" جان محمد نے کہا۔ اس کے بعد اس نے اکھڑے
...سانسوں میں اس واقعے کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ ہے۔

"لالے کی مار سے میرے دونوں بازو ٹوٹ گئے تھے۔ میں ہسپتال میں تھا۔ کل
...ایک دوست فارسٹ گارڈ حسینی نے اطلاع دی کہ چنگیزیوں نے اردگرد کے دیہات
...اور دو عورتوں کے لئے منادی کرائی ہے کہ جو ان کے بارے اطلاع دے گا
...ایک گھوڑا اور دو ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ اس نے بتایا کہ اس انعام کے لالچ
...میرے دو دوست جورا اور رمبی میرے لالے کے خلاف مخبری پر تیار ہو گئے ہیں۔

یہ دونوں وہی سانسی تھے جن کے ساتھ میری لڑائی ہوئی ہے۔ دراصل جب لالہ آیا تو یہ دونوں میرے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں ہی تھے۔ پھر لالہ مجھے مارنے پیٹنے لگا اور یہ دونوں درختوں میں چھپ گئے۔ جب لالہ دین محمد کی بیوی کو لے کر واپس روانہ ہوا تو ان سے ایک نے لالے کا پیچھا شروع کر دیا اور اسے اس ٹھکانے کا پتہ چل گیا۔ اس نے بھی آ کر بتایا کہ لالہ دین محمد کی بیوی کو لے کر کہاں پہنچا ہے۔ میں نے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ بعد میں جب منادی ہوئی تو وہ خبیث لالچ میں آ گیا۔ مجھے اس کی نیت کا پتہ چلا تو میں کل رات بارہ بجے ہسپتال سے نکل آیا۔ آج دوپہر جورے اور رمبی سے ملاقات ہوئی۔ میں انہیں ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ وہ الٹا مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی طور باز نہیں آئیں گے تو میں نے اپنا پستول نکال لیا۔ انہوں نے پستول چھیننے کی کوشش کی تو میں نے جورے کو گولی مار دی۔ رمبی نے کلہاڑی سے مجھ پر وار کیے۔ میں زخمی ہو گیا۔ گرتے گرتے میں نے رمبی کو بھی ٹھنڈا کر دیا' دونوں میری آنکھوں کے سامنے مر گئے۔ میرا اپنا خون بھی فواروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ سانسیوں کی بستی وہاں سے پاس تھی۔ میں نے سوچا اگر کسی سانسی نے مجھے دیکھ لیا تو مجھ پر کتے چھوڑ دیں گے میں گرتا پڑتا سڑک کی طرف بڑھنے لگا کہ شاید کوئی میری مدد کرے۔ کچھ فاصلہ طے کیا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں۔"

اپنی روداد سنانے کے بعد جان محمد نے ایک آہ کھینچی۔ میں نے دیکھا اس کی دھندلی آنکھوں میں اشکوں کی نمی ہے پھر وہ کراہ کر دھیمی آواز میں بولا۔

"میں مر جاؤں تو میری طرف سے لالے کو کہنا' مجھے معاف کر دے۔ میں نے اس کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔ بڑا ستایا ہے اسے۔ برے یاروں کی یاری مجھے لے ڈوبی ورنہ........ اتنا برا نہیں تھا میں۔"

صبح اذانوں کے وقت جان محمد کو اوپر تلے دو خون کی الٹیاں آئیں اور وہ بے ہوشی میں چلا گیا........ بے ہوشی کا یہ سلسلہ دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کو ٹوٹا۔ ڈاکٹر بھی اس وقت پاس ہی تھا۔ جان محمد نے چودھری شباب کو اشارے سے بلایا اور رک رک کر بولا۔

"چودھری صاحب........ میں آپ کو ایک........ بہت خاص بات بتانا چاہتا ہوں........ جاگیرداروں کے بارے میں" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ چودھری شباب اس پر جھک گیا۔

چودھری شباب پوری طرح جان محمد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جان محمد نے اٹک اٹک کر کچھ کہا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہے........ میں فوراً باہر نکل آئی۔ چودھری شباب اور جاں بلب جان محمد میں کوئی آدھ گھنٹہ گفتگو ہوئی۔ آخر چودھری شباب باہر نکلا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ کسی بہت گہری سوچ میں ہے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں تھا کہ جان محمد نے چودھری شباب کو اس کے دشمنوں یعنی میرے سسرال والوں کے متعلق جو کچھ بھی بتایا ہے وہ نہایت اہم ہے........

اس روز شام تک جان محمد کی طبیعت بگڑتی اور سنبھلتی رہی۔ پھر وہ گہری بے ہوشی میں چلا گیا اور اسی حالت میں دم توڑ گیا۔

☆-------------☆-------------☆

وہ جنوری کی دو یا تین تاریخ تھی سردی اپنے عروج پر تھی۔ کمرے میں انگیٹھی دہک رہی تھی اور میں اس کے پاس بیٹھی اپنی سوچوں میں گم تھی........ جان محمد کو مرے ہوئے بارہ روز ہو چکے تھے اور اس دوران چودھری شباب اس کیس میں الجھا رہا تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے جان محمد کی لاش اٹھوا کر پال پور لے گیا اور کھیتوں میں ڈال دی تھی۔ جان محمد کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے اس کے دونوں دوستوں کی لاشیں بھی پاس ہی سے مل گئی تھیں۔ سانسی بہت مشتعل تھے لیکن ان کے اشتعال کا کوئی فائدہ نہیں تھا ان کے بندوں کو قتل کرنے والا خود بھی قتل ہو گیا تھا اور حساب برابر تھا' میں انگیٹھی میں آگ کے شعلوں کو گھورتی ہوئی خیال کے تھپیڑے کھا رہی تھی کہ چودھری شباب کی بہن حمیدہ آ گئی۔ میں اسے مفرور مجرموں کی اس پناہ گاہ میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ میرے گلے لگ کر وہ کچھ دیر روتی رہی' میں نے کہا "حمیدہ! تم یہاں!؟"

وہ بولی "تم یہاں ہو سکتی ہو تو میں کیوں نہیں ہو سکتی۔ لالے شباب نے کہا تھا تم یہاں بڑی اداس رہتی ہو۔ میں نے کہا تو پھر مجھے لے چلو۔ میں اس کا دل بہلاؤں گی۔"

"حمیدہ! ایسا کیوں کیا تم نے! یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں یہ تو میرے جیسے

مجرموں کی پناہ گاہ ہے۔" میں سسکتے ہوئے بولی۔

حمیدہ نے دکھی ہو کر کہا "ایسا مت کہو بہن' تیری بے گناہی تو تیرے چہرے پر لکھی
ہوئی ہے۔"

میں جانتی تھی کہ چودھری شہاب جان بوجھ کر حمیدہ کو یہاں لایا ہے۔ میں نے
روز پہلے اس سے کہا تھا کہ ان قاتلوں اور ڈاکوؤں کے درمیان رات بسر کرتے ہوئے
مجھے خوف آتا ہے' وہ یہ ثابت کرنے کے لئے حمیدہ کو یہاں چھوڑ گیا تھا کہ یہ سب آوا
اس کے بھروسے کے ہیں اور وہ اپنی سگی بہن کے سلسلے میں بھی ان پر اعتماد کر سکتا ہے۔
اس کا یہ انداز مجھے اچھا لگا۔

حمیدہ دو راتیں وہاں میرے پاس رہی۔ وہ مسلسل میری دلجوئی میں لگی رہی اور
فرحان کی موت کا غم میرے دل سے بھلانے کے لئے اپنی سی کوشش کرتی رہی لیکن اسے
کیا معلوم تھا کہ اس غم کی تحریر کس انمٹ سیاہی سے لکھی گئی ہے۔ اس نے مجھے
چودھری شہاب کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ چودھری شہاب ابھی
تک غیر شادی شدہ ہے۔ جوانی میں اس کی منگنی ہوئی تھی مگر بعد میں رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس
رشتے کے ٹوٹنے کی وجہ بھی عجیب و غریب تھی اور درحقیقت یہی واقعہ تھا جو بعد میں
چنگیزی اور شہاب خاندانوں کی دشمنی کا باعث بنا۔ یہ کوئی پندرہ سال پہلے کی بات
چودھری شہاب کے رشتے کی بات ضلع لائلپور کے ایک بڑے زمیندار کی طرف چلی۔ لڑ
خوبصورت تھی اور چودھری شہاب کے گھر والوں کو پسند بھی آئی تھی۔ باقاعدہ منگنی
وقت شہاب کے گھر والوں کے علاوہ چند معززین بھی لڑکی کے گھر پہنچے۔ ان دنوں شہاب
کے گھرانے کے ساتھ چنگیزیوں کی راہ و رسم تھی۔ منگنی کے لئے جانے والوں میں
چودھری واصف چنگیزی کا مرحوم والد نیاز علی چنگیزی بھی تھا۔ چودھری نیاز علی ر
طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے ساری زندگی اللے تللوں میں گزاری۔ خوبصورت عورتیں
اس کی کمزوری تھیں۔ منگنی کی تقریب میں اس نے شہاب کی ہونے والی دلہن کو دیکھا
اس پر ریجھ گیا۔ دماغ پر عشق کا بھوت سوار ہوا تو وہ ہر انتہا تک جانے کو تیار ہو گیا۔
اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا اس کے لئے کیا ناممکن تھا یہ انہونی بھی اس نے
دکھائی۔ چند مہینے بعد "بعض وجوہ" کی بنا پر چودھری شہاب کی منگنی ٹوٹ گئی۔ منگنی ٹو

کی بدنامی ہوئی۔ اس بدنامی کو نیاز علی چنگیزی نے درپردہ بڑی عیاری سے ہوا دی اور
ڈھنڈورا پٹوا دیا۔ لڑکی والدین کے لئے بوجھ بن گئی۔ کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار
نہیں ہوا۔ حالات سازگار دیکھ کر پچپن سالہ نیاز علی نے وہاں اپنی بات چلا دی۔ قریب تھا
وہ اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتا کہ لڑکی بیمار ہو گئی اور چند ماہ بیمار رہنے کے بعد دنیا
جھمیلوں سے چھوٹ گئی۔ اس کی موت کے کچھ عرصہ بعد چودھری شہاب پر انکشاف
سہاگ رات کے خواب دیکھنے والی اس معصوم لڑکی کو قبر کی تاریکی میں اتارنے
شخص کا نام نیاز علی ہے۔ یہی وہ بدباطن ہے جس نے اپنی ہوس کی خاطر ایک ہنستی
مسکراتی زندگی کو بربادی کے گرداب میں دھکیل دیا۔ ایک رات چودھری شہاب جو اس
بائیس سالہ نوجوان تھا ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر بڑی حویلی میں گھس گیا۔
علی چنگیزی کو جان سے مار دینا چاہتا تھا۔ اس نے چنگیزی پر سوتے میں ٹوکے سے وار
چنگیزی شدید زخمی ہوا لیکن بچ گیا۔ شہاب گرفتار ہوا اور قاتلانہ حملے کے جرم میں
چلا گیا۔ وہاں سے چار سال بعد رہا ہو کر واپس آیا تو نیاز علی چنگیزی مر چکا تھا تاہم اپنی
کے پیچھے نہ ختم ہونے والی دشمنی کا سلسلہ چھوڑ گیا تھا۔ چنگیزی شہاب کے خون کے
تھے۔ شہاب نے بھی اس دشمنی کو سر آنکھوں پر لیا۔ اس نے اپنی چودھراہٹ
علاقے میں اثر و رسوخ پیدا کیا اور چنگیزیوں کا مضبوط حریف بن کر ابھرا۔ پچھلے
برسوں کے دوران اس دشمنی میں کئی نشیب و فراز آئے تھے لیکن یہ ختم نہیں
ہوئی۔

حمیدہ نے بتایا "منگنی ٹوٹنے کے بعد ہم نے بہت کوشش کی کہ لالہ شادی کر لے مگر
کسی کی نہیں مانی۔ میری ماں نے رو رو کر اپنی نظر کمزور کر لی ہے مگر وہ لالے کو منا
سکیں اور اب وہ کہتا ہے کہ شادی کی عمر گزر گئی ہے۔ اب یہ جنجال پال کر کیا کرنا

حمیدہ بہت دیر مجھ سے اپنے لالے کی باتیں کرتی رہی۔ کہنے لگی "ثناء بہن! مجھے لگتا
تمہاری بات بہت مانتا ہے۔ کسی وقت تو ہی اسے سمجھا۔ باپ تو مر گیا ہے۔ ماں بھی دل
لئے مرجائے گی۔ اکیلا بیٹا ہے اس کا۔ پتہ نہیں بیچاری کب سے بہو کی آس
ہے۔ کیا یہ آس کبھی پوری نہیں ہو گی؟"

حمیدہ کی زبانی چودھری شہاب کی روئیداد سن کر میرے دل میں اس کے لئے

ہمدردی کا ایک گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ بڑی حویلی میں' میں نے چودھری شہاب کے بارے
کچھ سنا تھا وہ اس سے بالکل مختلف شخص نکلا تھا۔ سیدھا سادھا دیہاتی زمیندار' مگر
اور دشمن کے مقابلے میں ہوشیار۔ ابھی تک اس نے ثابت کیا تھا کہ ان پڑھ اور
ہونے کے باوجود اس میں پڑھے لکھے چنگیزیوں سے کہیں زیادہ انسانیت ہے۔

اگر بروقت چودھری شہاب وہاں نہ پہنچتا تو اب تک میری لاش گل سڑ چکی ہو

حمیدہ کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ چودھری شہاب کے متعلق مجھ سے کچھ
بھی کہنا چاہتی ہے لیکن جھجک رہی ہے۔ حمیدہ دو راتیں میرے پاس گزار چکی تو
اصرار کر کے اسے واپس بھیج دیا۔

میرا کمرہ ڈیرے کے ایک پرسکون حصے میں تھا اس کے باوجود چودھری شہاب
کارندے اور ساتھی آپس میں جو بات چیت کرتے تھے وہ میرے کانوں تک پہنچتی
تھی۔ یہ بات چیت زیادہ تر شکار کے متعلق ہوتی تھی اور اس سے مجھے اندازہ ہوا
چودھری اور اس کے بندے آج کل ایک خاص قسم کے باز کی کھوج میں ہیں۔ اس
پکڑنے کے لئے وہ منصوبے بناتے تھے اور کئی جگہ انہوں نے جال وغیرہ بھی لگائے
تھے۔ وہ اس باز کے لئے عموماً "سنہرے" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد
جب چودھری شہاب نے مجھے وہاب کے غنڈوں سے بچایا تھا تو وہ اس وقت بھی شکار
تھا۔ بعد میں اس نے شکار کئے ہوئے پرندوں کا ایک تھیلا "بابے" کو دیا تھا اور بابے
اسے دعا دی تھی کہ اللہ تیری مراد پوری کرے۔ وہ دعا دراصل اسی سلسلے میں
چودھری شہاب اور اس کے کارندے اپنی اس مہم کی کامیابی کے سلسلے میں "با
دعاؤں پر بہت بھروسہ کر رہے تھے۔

ایک دن چودھری شہاب اس خفیہ ڈیرے پر آیا تو کچھ گھبرایا ہوا تھا اس نے
چنگیزیوں نے ایک بڑا خرانٹ وکیل کیا ہے بہت مہنگا اور خطرناک۔ اس کے ارادے
کہ واصف چنگیزی کے قتل میں اسے بھی (شہاب کو) الجھا لیا جائے۔
میرے پوچھنے پر اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"ثناء بی بی! بات یہ ہے کہ میرا چھوٹا چاچا چودھری حکم دین دو دفعہ چنگیز
خلاف الیکشن لڑ چکا ہے۔ دونوں دفعہ وہ ہارا ہے لیکن اس بار وہ پھر کھڑا ہو رہا تھا

اب کی بار وہ جیتے گا بھی۔ یوں بھی اس نے کافی کام کیا ہے۔ چنگیزیوں کے وکیل
منصوبہ بنایا ہے کہ واصف کے قتل کو سیاسی رنگ دیا جائے اور کہا جائے کہ حکم دین
آنے والے الیکشن میں جیتنے کے لئے واصف کو قتل کرایا ہے۔ ان لوگوں نے اسپتال
سلیم کو گرفتار کر لیا ہے اور مار مار کر اس سے بیان لیا ہے کہ میرے ساتھ اس کا میل
تھا اور میرے کہنے ہی پر وہ واصف کو مارنے کے لئے بڑی حویلی میں داخل ہوا تھا۔"

میں سناٹے میں رہ گئی۔ ایک ساتھ مجھے دو متضاد خبریں ملی تھیں۔ ایک نہایت خوشی
اور دوسری غم کی۔ خوشی کی خبر یہ تھی کہ سلیم زندہ تھا' غمناک خبر یہ کہ چودھری
ب کو ایک ایسے معاملے میں الجھایا جا رہا تھا جس سے اس کا دور کا تعلق بھی نہیں۔ مجھے
پر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ واصف الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی بیوی
ہوئے بھی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور اسی پر کیا موقوف مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں
میں بیوی تھی ہی نہیں۔ میں تو ایک قیدی تھی اس چار دیواری میں' جس کے
کی ہتھیلیوں پر' ہونٹوں پر' کانوں پر اور آنکھوں پر مہریں تھیں۔ میں نے چودھری
سے سلیم کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بڑی حویلی کے تھانے میں ہے (بڑی
اس کا مطلب وہ قصبہ تھا جہاں بڑی حویلی تھی اس کے قصبے کا نام بھی بڑی حویلی
ہا تھا)

"اس کی پیٹھ کا زخم کیسا ہے؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔
چودھری شہاب نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے سلیم کے متعلق میری
نے اسے ٹھیس پہنچائی ہو۔ "ٹھیک ہے" وہ آہستگی سے بولا "ٹھیک نہ ہوتا تو
سے چھٹی کیسے ملتی۔"

"اب کیا ہوگا چودھری؟ سلیم کے بیان کے بعد تو...... تمہیں بھی گرفتار کیا جا
" میں نے بات بدلی۔

وہ ہنس کر بولا "میری فکر چھوڑیں بی بی جی! جب دریا میں چھلانگ مار دی تو پانی سے
" کچھ دیر بیٹھ کر وہ چلا گیا۔ اسی رات میں نے پھر وہ خواب دیکھا جو نیند میں مجھ پر
مارتا تھا اور میری روح کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا تھا۔ میں نے دیکھا فرحان ایک
کمرے میں ایک جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا ہے۔ اس کا چہرہ زرد ہے اور ہونٹوں پر

پتریاں جمی ہوئی ہیں۔ آنسو اس کے رخساروں پر خشک ہو چکے ہیں اور ان کا نمک سفید لکیروں کی صورت میں نظر آ رہا ہے اور وہ اپنی توتلی زبان میں "امی دان.......... دان.........." پکار رہا ہے۔ ہر دفعہ جب وہ "امی دان" کہتا ہے تو اس کے سینے سے دلدوز سسکی نکلتی ہے۔ اس سسکی سے اس کا پورا جسم ہل جاتا ہے اور گلے میں سامنے طرف ہنسلی کی ہڈیوں کے درمیان ایک چھوٹا سا گڑھا پڑ جاتا ہے۔ اتنے میں ایک ج ہے وہ درندہ وہاب.......... ہاں میں اسے درندہ ہی کہوں گی' ہاتھ میں تیز دھار چاقو اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کے چہرے پر وہی لعنتی مسکراہٹ ہے جو اس کے چہرے اور کرخت کر دیتی ہے۔ اسے دیکھ کر فرحان اتنے زور سے روتا ہے کہ اس کا رنگ جاتا ہے۔ میں اسے سینے سے لگانے کے لئے لپکتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی میری کھل گئی۔ میں زور زور سے چیخنے لگی "فرحان! میں آ رہی ہوں.......... میرے بچے! رہی ہوں' نہ رو میں آ رہی ہوں" ننگے پاؤں میں دروازے سے نکلی اور برآمدے کھڑی ہو کر چیخنے لگی "کہاں ہو فرحان؟ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ فرحان.........."

میری چیخ و پکار سن کر چودھری شباب ڈیرے کے دوسرے حصے سے بھاگا ہو میں نے اس کی مضبوط گرفت اپنے کندھوں پر محسوس کی۔ اس کی آواز کہیں دور میری سماعت سے ٹکرائی۔ "ہوش کریں بی بی جی.......... کیا کر رہی ہیں۔ آنکھیں کھولیں۔ دیکھیں میری طرف یہ میں ہوں۔"

میں اس کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔ اس نے مجھے دونوں کندھوں پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑا۔ آخر میں خواب اور بیداری کی درمیانی حالت سے آئی۔ میں ننگے سر اور ننگے پاؤں صحن کے بیچوں بیچ کھڑی تھی.......... میرا سارا دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ چودھری شباب نے اپنی گرم چادر میرے جسم پر ڈالی ملازم کو زور سے آواز دے کر بولا "خیرو! جا اندر سے بی بی جی کی جوتی لا۔"

خیرو بھاگا ہوا میری جوتی لے آیا۔ چودھری مجھے سہارا دے کر چلاتا ہوا کمر لے آیا۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چودھری نے میرے اوپر ڈال دی اور بولا۔ "بی بی جی! اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ آپ اتنی ہیں' پھر کیوں اس طرح کرتی ہیں۔ مرنے والے کی روح کو تکلیف ہوتی ہے اس

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "چودھری! بس.......... میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اور نہیں چھپوں گی۔ میں خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گی اور عدالت سے مانگوں گی۔ عدالتیں اندھی بہری نہیں ہوتیں۔ میں سب کچھ صاف صاف بتاؤں گی اپنے بچے کے قاتلوں کو بے نقاب کروں گی۔"

چودھری شباب نے پریشانی سے کہا "بی بی جی! میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔ عقلمندی کی بات نہیں کر رہیں۔ ان پندرہ سالوں میں جتنا میں نے چنگیزیوں کو جانا ہے اور نے نہیں جانا ہوگا۔ آپ یہ بات بھول جائیں کہ ان کے خلاف قانونی لڑائی لڑ کر حاصل کر سکیں گی۔ بالکل بھول جائیں یہ بات۔ ایسا کر کے آپ صرف اپنے آپ کو پہنچائیں گی۔ یہ سیدھے لوگ نہیں ہیں' اس لئے سیدھی زبان بھی نہیں سمجھتے۔ کسی اور لہجے میں بات کرنی پڑتی ہے.......... اور میں کروں گا یہ بات۔ بس تھوڑا صبر کریں آپ' اس معاملے کو ذرا ٹھنڈا ہونے دیں۔"

میں نے جھلا کر کہا "چودھری! تمہیں کیوں میری اتنی فکر پڑی ہوئی ہے۔ مجھے نہیں اپنا آپ۔ پھانسی ہی ہو جائے گی نا.......... مجھے قبول ہے۔ ایک دفعہ میں دنیا کو سچ تو دوں گی نا۔"

شباب بولا "شاہ بی بی! میں سیدھا سادھا جٹ بندا ہوں آپ پڑھے لکھے" لوگ آپ جتنا علم تو میرے پاس نہیں لیکن اتنی بات ضرور جانتا ہوں کہ جان بوجھ کر جان حرام ہے اور قانون کے سامنے پیش ہو کر آپ مفت میں جان گنوائیں گی۔ جان نہ تو زندگی ضرور برباد ہو جائے گی۔ ساری عمر کے لئے پاگل خانہ یا جیل' بڑا پکا کیس بنا انہوں نے آپ کے خلاف آپ کیوں نہیں سمجھتیں؟ آپ کو نہ سہی لیکن کچھ ہیں جنہیں آپ کی زندگی کی ضرورت ہے" چودھری نے روانی میں یہ بات کہہ تو لیکن میں نے گھور کر دیکھا تو وہ جلدی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں' ایک ساعت کے لئے اپنائیت کی جھلک محسوس کی۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اچھا جاتا ہوں۔ آپ اندر سے کنڈی لگا لیں۔ لالٹین جلتی ہی رہنے دیں یا پھر انگیٹھی جلا آج سردی بھی زیادہ ہے۔"

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ چودھری سے کہوں کہ وہ ادھر ہی

میرے پاس بیٹھا رہے۔ مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جائے۔ ورنہ پھر پاگل کر دینے والی سوچیں آگھیریں گی لیکن میں کہہ نہ سکی' صرف اتنا ہی کہہ سکی کہ وہ اپنی چادر لے جائے۔ ہاتھ سے چادر لے کر وہ باہر نکل گیا۔ میں دروازے کو کنڈی چڑھائے بغیر بستر پر ہو گئی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ جو خواب میں نے دیکھا تھا اسے دیکھ کر بدنصیب ماں بھلا سو سکتی ہے؟ ابھی رات کے صرف دس بجے تھے پہاڑ جیسی رات تھی اور فرحان کی یادیں چاروں طرف سے گھیر رہی تھیں۔ ننھی ننھی یادیں شوخ ہنستی مسکراتی اٹھکھیلیاں کرتی یادیں' پاؤں پاؤں چلتی' چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی اور زبان میں باتیں کرتی یادیں۔ میرا سینہ پھٹنے لگا' مجھے لگا میں رو رہی ہوں.......... لیکن آنسو میری قسمت میں کہاں تھے' جیسے فرحان میری گود سے روٹھا تھا ویسے دو آنکھوں سے روٹھ چکے تھے۔ آنسوؤں کی جگہ صرف ایک جلن تھی۔ جو کبھی گھٹ اور کبھی بڑھ جاتی تھی۔ اس وقت پھر یہ جلن انتہا کو چھو رہی تھی۔

ایکا ایکی نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں ایک فیصلہ کر کے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی۔ ٹرنک کھول کر ایک سویٹر پہنا۔ ٹرنک میں کے نیچے رکھی ہوئی کچھ رقم نکال کر چھوٹے سے دستی پرس میں رکھی۔ گرم چادر اور باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گئی.......... کچھ دیر بعد میں دیواروں کے ساتھ ساتھ سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سخت سردی کی وجہ سے لوگ کمروں میں سو رہے تھے۔ بیرونی دروازے کے پاس چھپر کے نیچے ایک شخص آگ جلائے' رضائی لپیٹے نیم دراز تھا۔ اس کی آٹومیٹک رائفل سرہانے رکھی ہوئی آگ کی مدھم روشنی میں رائفل کا لوہا چمک رہا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھی۔ کو ٹٹول کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اسے کھولتے ہوئے آواز ضرور پیدا ہو گی۔ کہیں بیدار ہو جاتا تو گھبراہٹ میں فوری طور پر مجھ پر فائر کر سکتا تھا۔ سوچا کہ رائفل دور ہٹا دوں۔ دبے پاؤں اس کے سرہانے پہنچی اور وزنی رائفل کو نالی کی طرف سے بہ آہستگی اٹھا لیا۔ پہریدار غالباً غنودگی میں تھا۔ فوراً جاگ گیا۔ اس نے گردن گھما کر طرف دیکھا۔ ایک ساعت کے لئے آگ کی مدھم روشنی اس کی بڑی بڑی مونچھوں رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر منعکس ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھ کی

پورے زور سے گھومی اور اس کی کنپٹی پر پڑی' کھٹاک کی نہایت ہولناک آواز کے ساتھ وہ پہلو کے بل بستر پر لڑھک گیا۔ میں نے ایک اور ضرب اس کے سر پر لگائی اور رائفل چارپائی پر پھینک کر دیوانہ وار دروازے کی طرف بڑھی۔ معمولی کوشش کے بعد میں نے دروازہ کھول لیا اور باہر نکل آئی۔ یہ ایک سنسان جگہ تھی۔ کہیں قریب سے چھوٹی نہر گزرتی تھی۔ چاروں طرف درخت تھے درختوں کے درمیان سے ایک کچا راستہ گزرتا تھا۔ اس ڈیرے کا مالک اگر اس جگہ کو شوٹنگ کے لئے استعمال کرتا تھا تو کچھ ایسا غلط نہیں کرتا تھا۔ ہماری پنجابی فلموں میں عموماً ایسی ہی جگہوں پر مار دھاڑ کے مناظر فلمائے جاتے ہیں۔ شاید یہ ماحول کا اثر تھا کہ اس وقت میں خود کو کسی فلم کا کردار ہی محسوس کر رہی تھی۔ میرے ہاتھوں سے کیسی کیسی انہونیاں سرزد ہو رہی تھیں۔ پہریدار کے سر سے بندوق ٹکرانے کی جو آواز پیدا ہوئی تھی وہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ کہیں وہ مر تو نہیں گیا؟ ذہن میں یہ پراندیش سوال گونجا۔ "مر بھی گیا ہے تو کیا ہے' مجھے دو دفعہ پھانسی نہیں ہو جائے گی" میں نے خود ہی جواب دیا۔ اس پر وار کرنا مجبوری تھی۔ اگر ایسا نہ کرتی تو وہ کبھی مجھے نکلنے نہ دیتا۔ "آخر وہ بھی تو کسی کا باپ یا بیٹا ہو گا" میں نے بڑے درد کے ساتھ سوچا اور دل میں دعا کرنے لگی کہ وہ صرف زخمی ہوا ہو۔

میں کچھ دیر درختوں کے درمیان چلتی رہی۔ پھر کھیت نظر آئے اور اونچے اونچے کھیتوں میں احتیاط سے سفر کرتی میں اچانک ہی ایک جانے پہچانے راستے پر آ گئی۔ یہ وہی راستہ تھا جس پر چند ہفتے پہلے سلیم کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ہماری جیپ خراب ہوئی تھی اور ہمیں زینب کے گھر پناہ لینی پڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا زینب کا گاؤں "نیبے والی چک چودھاں" بھی کہیں قریب ہی تھا۔ مگر اب مجھے اس گاؤں سے کیا لینا تھا۔ زینب وہاں موجود نہیں تھی۔ وہ تو رحمت کے ساتھ ایک نیا سفر شروع کر چکی تھی۔ نیبے والی کا خیال آتے ہی دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اسی گاؤں میں' میں نے آخری بار اپنے فرحان کو زندہ حالت میں دیکھا تھا۔ یہیں پر اس نے آخری بار اپنی توتلی زبان سے مجھے امی دان کہا تھا میرے ہاتھوں سے آخری بار دلیہ کھا کر اور مجھ پر آخری نظر ڈال کر سو گیا تھا۔

میں اس تاریک راستے پر فصلوں کے درمیان بہت دیر تک چلتی رہی یہاں تک کہ مجھے تیز رفتار ٹریکٹر ٹرالیوں اور موٹر سائیکلوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ یہ ایک

پختہ ذیلی سڑک تھی جو کہیں آگے جا کر جھنگ جانے والی بڑی سڑک سے ملتی تھی۔ اب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اس تنگ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں آ رہی تھیں۔ کبھی چارے لدی ہوئی کوئی ٹریکٹر ٹرالی گزر جاتی۔ کبھی کوئی سائیکل سوار گرم چادر کی بکل مارے تیز پیڈل چلاتا نکل جاتا۔ نزدیکی قصبات میں موٹر سائیکلوں پر دودھ پہنچانے والے گوالے آ جا رہے تھے۔ اجالا ہونے تک میں سڑک سے کچھ ہٹ کر درختوں میں کھڑی رہی۔ سڑک پر آ گئی۔ میں نے گرم چادر سے دیہاتی انداز میں منہ لپیٹ رکھا تھا۔ جلد ہی ا ٹرالی والے نے "بہن جی" کہہ کر مجھے ٹرالی میں لفٹ دے دی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد جھنگ جانے والی سڑک پر تھی۔ یہاں سے بس پکڑ کر میں جھنگ پہنچ گئی۔ بھوک سے حال تھا مگر میں کہیں کھانا کھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ پوچھتی پاچھتی میں جھ لاری اڈے پر پہنچی۔ وہاں سے مجھے سیدھے لاہور آنے والی بس مل گئی۔

جس وقت میں لاہور بادامی باغ اڈے پر پہنچی شام کے چھ بج چکے تھے اور بو باندی ہو رہی تھی۔ میں نے رکشا لیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ موہنی روڈ اپنے گھر پہنچی۔ دور ہی سے دیکھا تو کوٹھی کی بیرونی دیوار پر لائٹنگ ہو رہی تھی۔ باؤنڈری پر باغیچے کے پودوں میں جابجا رنگ برنگی روشنیاں ٹنگی تھیں۔ سڑک پر کاروں کی ایک قـ نظر آ رہی تھی۔ اپنے کچھ عزیزوں کی کاریں میں دور ہی سے پہچان سکتی تھی۔ غالباً درمیانے درجے کا فنکشن تھا۔ اچانک مجھے یاد آ گیا آج جنوری کی دس تاریخ تھی۔ آ شعیب کی سالگرہ تھی۔ شعیب جو میرا بڑا بھتیجا تھا اور مجھ سے بے حد پیار کرتا تھا۔ پروگرام بنایا کرتے تھے کہ شعیب کی پانچویں سالگرہ دھوم دھام سے کریں گے آج.......... آج اس کی پانچویں سالگرہ تھی۔ میرے دل میں شعیب کو دیکھنے اور اس منہ چومنے کی خواہش مچل گئی۔ جی چاہا سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ کر بھاگتی ہوئی ا گھر میں گھس جاؤں۔ بھائی تنویر کے گلے سے لگ کر خوب روؤں۔ بھابیوں کو اپنا د سناؤں اور بھتیجیوں کو خوب خوب پیار کروں لیکن پھر میں نے خود کو سنبھالا۔ میرے حا مجھے اس بچپنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا بہت احتیاط سے کرنا میں دیہاتی انداز میں چادر کا گھونگھٹ نکالے دھیرے دھیرے کوٹھی کے دروازے طرف بڑھنے لگی۔ میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ میں ایک عام سی عورت نظر آ رہی تھی۔

سے گزر کر میں لان میں پہنچ گئی۔ یہاں ایک چھوٹا سا شامیانہ لگا تھا اور مہمان کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ رنگ برنگی برتھ ڈے کیپس کے ساتھ بچے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اچانک میری نظر بڑی بھابی پر پڑی وہ ایک میز سجانے میں ملازموں کی مدد کر رہی تھیں۔ شامیانے کی قنات میں تھوڑی سی درز تھی۔ میں نے اس جھری کے ساتھ منہ لگا دیا اور باہر ہی سے بھابی کو آواز دینے کی کوشش کی مگر حیرانی ہوئی کہ دو تین بار کوشش کے باوجود میرے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ کوئی گولا حلق میں اٹک گیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں ایک کرخت آواز سنائی دی "کون ہے؟"

میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا بڑے بھائی جان میرے سامنے کھڑے تھے۔ چادر کی اوٹ سے انہوں نے میرے چہرے کی جھلک دیکھی اور ان کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت اُمڈتی چلی گئی۔ پھر اس حیرت کی جگہ شدید نفرت اور غصے نے لے لی۔ وہ عینک کے پیچھے سے مجھے گھورتے ہوئے بولے "تم یہاں؟"

میں سراپا جرم ان کے سامنے کھڑی تھی۔ انہوں نے ہراساں نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر سخت لہجے میں بولے "میرے پیچھے پیچھے آؤ" میں چادر میں لپٹی ان کے پیچھے چل دی۔ وہ مجھے بغلی راہداری سے گزار کر ایک عقبی کمرے میں لے آئے۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور خطرناک نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ان کا سارا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ وہ لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بے پناہ طیش سے بولے۔ "جی تو چاہتا ہے تمہیں شوٹ کر دوں۔ مگر میں تمہارے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا.......... کیوں آئی ہو یہاں؟"

میں نے بلک کر کہا "بھائی جان میں بے قصور ہوں۔"

ایک زناٹے کا تھپڑ میرے منہ پر پڑا اور میں الٹ کر چارپائی پر جا گری۔ دانت پیس کر بھائی جان نے مجھے بے نقط سنائیں اور غرا کر بولے "اگر تجھ میں تھوڑی بہت بھی غیرت ہوتی تو اپنا یہ منحوس چہرہ کبھی ہمیں نہ دکھاتی۔ جا ڈوب مر چلو بھر پانی میں یا گولی مار لے اپنے آپ کو۔ تیرے جیسی فاحشہ کو جینے کا حق ہی نہیں ہے۔ کیوں جی رہی ہے تو کیوں نہ رہی ہے؟" انہوں نے مشتعل ہو کر دونوں ہاتھوں میں میرا گلا دبوچ لیا اور آگے پیچھے لگے۔ میرا دم آنکھوں میں آ گیا تو انہوں نے گلے سے ہاتھ ہٹا کر مجھے پیٹنا شروع کر

دیا۔

"بھائی جان!" میں نے دبی دبی آواز میں فریاد کی۔

"خبردار" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولے "خبردار! جو اس گھر کے کسی فرد سے رشتہ جوڑا۔ تو ہماری کوئی نہیں اور نہ ہم تجھے جانتے ہیں۔ اگر ہماری کوئی بہن تھی تو مرچکی ہے۔ دفعہ ہو جا یہاں سے اور اگر ہم پر رحم کرسکتی ہے تو یہ شہر اور یہ علاقہ چھوڑ جا۔"

میں نے اپنی خشک' بے اشک آنکھوں کو ہاتھوں سے ڈھانپتے ہوئے کہا "بھائی جان! آپ کہیں گے تو دنیا ہی چھوڑ جاؤں گی لیکن میری بات تو............"

"خبردار!" وہ غرائے "مجھے کچھ نہیں سننا............ انہی قدموں پر یہاں سے لوٹ جا۔"

میں آنکھیں بند کرکے اپنے لرزتے کانپتے وجود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر اٹھی اور در و دیوار پر ایک حسرت کی نظر ڈال کر خاموشی سے باہر آگئی۔ بھائی جان اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت کھڑے تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ اگر میں نے نکلنے میں چند لمحوں کی بھی دیر کی تو وہ دھکے دے کر مجھے نکال دیں گے۔

چادر میں لپٹی لپٹائی میں بیرونی گیٹ سے باہر آگئی۔ رات تاریک اور بے حد خنک تھی' سر پر کھلا آسمان اور پیٹ میں ہوکتی ہوئی بھوک۔ چند گز چل کر میں نے اس گھر کو دیکھا جسے ایک مدت تک میں نے اپنا گھر سمجھا تھا۔ جس کے آنگن میں ابو جی نے مجھے جھولا جھلایا تھا اور جس کی دہلیز پر کھڑے ہو کر امی جی نے ہر سہ پہر میرا راستہ دیکھا تھا۔ آج وہی دہلیز تھی جہاں سے مجھے دھکیل کر بے اماں رات کے جنگل میں پھینک دیا گیا تھا۔ میں نے نظروں ہی نظروں میں "اپنے گھر" کے روشن در و دیوار کو چوما۔ "خدا حافظ" میرے ہونٹوں سے ایک خاموش سسکی نکلی اور میں سر جھکا کر آگے بڑھنے لگی۔ میں بڑے مان سے یہاں آئی تھی۔ میں ظالم نہیں مظلوم تھی۔ میرے پاس سچ کا سونا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر کسوٹی پر پورا اترتا ہے اور جس کو کوئی آنچ نہیں ہوتی۔ میں وفا کا تحفہ لے کر آئی تھی اپنی اور اپنے خاندان کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے اور اپنے فرحان کے خون کا حساب مانگنے کے لئے۔ مگر میری بات کسی نے نہیں سنی تھی۔

میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ساری گلیاں جانی پہچانی تھیں مگر ساری اجنبی تھیں۔

"یا خدا! میں کہاں جاؤں؟"

میں نے پریشانی سے سوچا۔ بوندا باندی پھر شروع ہو گئی تھی۔ میں دکانوں کے چھجوں کے نیچے نیچے چلتی آگے بڑھنے لگی۔ آتے جاتے مردوں کی تیز نگاہیں میرے چاروں طرف جال سا بن رہی تھیں۔

میرا سر پہلے ہی چکرا رہا تھا' اب قدم بھی ڈگمگانے لگے۔ قریب تھا کہ میں تیورا کر کسی دکان کے تھڑے پر گر جاتی کہ تھوڑی دور نیلے اور سرخ رنگ کا ایک بورڈ نظر آیا "پولیس چوکی" ساتھ ہی ایک طرف تیر کا نشان بھی دکھایا گیا تھا۔ جی میں آیا کہ کیوں نہ سیدھی سیدھی چوکی چلی جاؤں۔ سب کچھ صاف صاف بتا کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کردوں۔ جونہی یہ خیال ذہن میں واضح ہوا میں ڈگمگاتے قدموں سے چوکی کی طرف بڑھنے لگی۔ اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں نے اتنا بڑا فیصلہ کتنی آسانی سے کرلیا تھا۔ حالات کی گردش انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ میں نے سڑک پار کی اور لرزاں قدموں سے پولیس چوکی کی طرف بڑھنے لگی۔ اچانک ایک سوزوکی کار میرے پاس آکر رکی۔ میں سہم کر ایک طرف ہو گئی۔ کار میں سے فرخندہ برآمد ہوئی اور راہ گیروں کی پرواہ کئے بغیر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ پھر اس نے جلدی سے مجھے کھینچ کر کار کی پچھلی نشست پر بٹھایا اور ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کی ہدایت کی۔

فرخندہ میری سہیلی' میری دوست ہی نہیں میری بہن جیسی بھی تھی۔ ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کی یادوں کے خزانے تھے۔ ہم ایک دوسرے کے بہت کچھ تھے۔ اس اندھیری اور درد بھری رات میں فرخندہ کا وجود میرے لئے طمانیت و تسکین ثابت ہوا تھا۔ میں کار کی پچھلی سیٹ پر گم صم اس کے کندھے سے لگی رہی اور وہ اپنے بازو میرے گرد لپیٹے مجھے پچکارتی رہی' تھپتھپاتی رہی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کیسے مجھے تسلی دے۔ میں جو ایک مجرم تھی اور پولیس کو اپنے پیچھے لگائے پھرتی تھی۔ وہ مجھے ایک سینما ہاؤس میں لے گئی۔ ڈرائیور کے ذریعے اس نے باکس کے دو ٹکٹ منگوائے اور ہم ایک تنہا باکس میں آ بیٹھیں۔ نو سے بارہ کا شو تھا۔ فضول سی فلم چل رہی تھی اور کچھ بے ذوق سے لوگ اسے دیکھنے میں مصروف تھے۔ ہمیں اس فلم اور ان لوگوں سے کوئی دلچسپی

نہیں تھی۔ ہمیں تو تنہائی درکار تھی۔ اس پرسکون گوشے میں ہم ایک دوسرے کا دکھ
رہی تھیں اور سنا رہی تھیں۔ فرخندہ نے بتایا "جب تم بڑے بھائی جان اعجاز کے پیچھے
کوٹھی کے عقبی کمرے میں گئی تھیں' اس وقت میں نے تمہیں دیکھا تھا اور میں شک
پڑ گئی تھی۔ بعد میں کار لے کر تمہارے پیچھے روانہ ہوگئی۔" ہم نے بہت دیر وہاں باتیں
کیں' لیکن کب تک۔ ساری رات تو یہاں بیٹھا نہیں جا سکتا تھا۔ میرے انکار کرنے ا
بہت روکنے کے باوجود ہاف ٹائم کے وقت فرخندہ مجھے لے کر اپنے گھر روانہ ہوگئی۔ م
جانتی تھی اس گھر میں میڈم نادرہ بھی موجود ہے۔ وہ میڈم نادرہ جس نے میری بربادیو
کے سلسلے کا آغاز کیا تھا۔ جس نے سلیم سے دشمنی چکانے کے لئے مجھے چنگیزی جاگیردارو
کے چنگل میں دھکیل دیا تھا۔ میں اس عورت کے ساتھ ایک چھت تلے رات ہرگز بسر
نہیں چاہتی تھی مگر فرخندہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ وہ بڑی ہوشیاری اور رازدار
کے ساتھ کوٹھی کے عقبی چھوٹے دروازے سے مجھے اپنے بیڈروم میں لے گئی۔ کھ
کھلانے کے بعد وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ وہ میری بربادی میں اپنی پھوپھ
میڈم نادرہ کے کردار پر بہت شرمندہ تھی۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے
بتایا۔ وہ ایک انگریزی روزنامے میں سب ایڈیٹر کی ملازمت کر رہی تھی اور غالباً یہی وجہ
کہ وہ پہلے سے خاصی میچور نظر آ رہی تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں خود کو پولیس کے
حوالے کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں تو وہ مایوسی سے نفی میں سرہلانے لگی۔ وہ میری پور
کہانی سے آگاہ تھی۔ اس نے الماری میں سے پچھلی تاریخوں کے چند اخبار نکالے۔ ا
اخباروں میں واصف چنگیزی کے مقدمے کی خبریں لگتی رہی تھیں۔ دو روز پہلے کا ایک
اخبار اس نے میرے سامنے پھیلا دیا۔ اندرونی صفحے پر ایک تین کالمی خبر معہ ایک تصویر کے
موجود تھی۔ یہ تصویر سلیم کی تھی۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی' چہرے ہی سے انداز
ہوتا تھا کہ وہ بے پناہ تشدد کا نشانہ بنا ہے۔ خبر کی سرخی تھی "میں چودھری حکم دین کے
کہنے پر بڑی حویلی پہنچا تھا' ملزم سلیم"......... تفصیل میں لکھا تھا کہ واصف چنگیزی ق
کیس کے ملزم سلیم نے آج عدالت کے روبرو اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ چودھ
حکم دین سے اس کا ملنا جلنا تھا۔ یہ چودھری حکم دین ہی تھا جس نے اسے واصف چنگی
کے قتل پر اکسایا۔ سلیم نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ پال پور کے چودھریوں نے مجھے ا

بیلے میں ہر طرح کی پشت پناہی کا یقین دلایا تھا اور نقد انعام کا وعدہ بھی کیا تھا۔ انہوں نے
کہا تھا کہ ہم تجھے ملک سے باہر بھجوا دیں گے اور اتنی رقم دیں گے کہ تم اپنی ہونے والی
بیوی کے ساتھ ساری زندگی عیش سے گزارو گے' سلیم نے اپنی محبوبہ اور اس قتل کی ایک
وجہ ثناء کے بارے میں بھی اہم انکشافات کئے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد بھی
وہ اکثر اس سے ملتی تھی۔ ان کی ملاقاتیں عام طور پر لارنس گارڈن یا شمالی شہر کے ایک
ہوٹل میں ہوتی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح اپنے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔
یہی وجہ ہے کہ ثناء پر دیوانگی کے اکثر دورے پڑتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ دیوانگی کے
کسی ایسے ہی دورے میں اس نے اپنے بچے کو قتل کر دیا ہو۔ سلیم نے اپنے بیان میں مزید
کہا ہے کہ ثناء اس وقت پال پور کے چودھریوں کے پاس ہے اور انہوں نے اسے حویلی
سے باہر کسی نامعلوم جگہ پر چھپا رکھا ہے۔

خبر کی آخری سطور پڑھتے پڑھتے میری ہتھیلیاں پسینے سے تر ہوگئیں۔ کتنا بڑا جھوٹ
تھا اور کتنی بے باکی سے لکھا گیا تھا۔ یہ سارا بیان پولیس تشدد کا نتیجہ تھا جو پولیس نے
چنگیزیوں کی مرضی و منشاء کے مطابق سلیم سے حاصل کیا تھا۔ لیکن سوچنے کی بات تھی کہ
کیا سلیم اتنا کم ہمت ہے کہ تشدد کے سامنے گھٹنے ٹیک گیا اور عدالت میں ایسا بیان دے
دیا!؟

فرخندہ نے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولی "اب بتاؤ خود کو پولیس کے حوالے
کرکے تمہیں کیا ملے گا؟ فی الحال تمہیں پولیس سے دور رہنا چاہئے۔ میرا مطلب ہے دو
تین ہفتوں تک......... دیکھو ڈیئر! تمہاری ٹکر ایک ایسے دراز دست خاندان سے ہے جس
کے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ انہیں جھوٹا ثابت کرنے کے لئے ٹھوس ثبوت اور باہمت
گواہ درکار ہیں۔ جو جال انہوں نے تمہارے گرد بنا ہے اس میں تمہارے بیانات اور
الزامات کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ تمہیں زیادہ مان اس خط کا ہے جو وہاب علی نے تمہیں
بلیک میلنگ کے لئے لکھا تھا اور جو تم نے چودھری شباب کے گھر میں کہیں چھپا رکھا ہے۔
میں اس خط کو دیکھے بغیر پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ وہاب علی کی اپنی تحریر میں
نہیں ہوگا۔ چنگیزیوں کا وکیل اسے باآسانی فرضی ثابت کر دے گا۔ یہ لوگ اتنے کچے کام
نہیں کرتے۔"

"پھر میں کیا کروں' کیا اسی طرح بھاگتی پھروں؟"

"بھاگتی کیوں پھرو' میں تمہارے رہنے کا انتظام کروں گی اور تمہارے لئے سب کچھ کروں گی۔ میرے ہوتے ہوئے تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں تو پہلے بھی بیکار نہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے ایڈیٹر کی اجازت سے چنگیزی گھرانے کے بارے میں پوری تحقیقات کر رہی ہوں۔ ہمارے دو رپورٹرز بھی دن رات اس سلسلے میں مصروف ہیں۔ تم دیکھنا جلد کوئی نہ کوئی اہم ثبوت ضرور سامنے آئے گا۔"

ہر اندیشے و خطرے سے بے نیاز میں فرخندہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی لیکن کوٹھی کے ایک حصے میں کچھ اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ فرخندہ کی پھوپھی میڈم نادرہ اسی گھر میں رہتی تھی۔ وہ ایک ہوشیار اور باخبر عورت تھی۔ فرخندہ کو اس سے چڑ اسی وجہ سے تھی کہ وہ ہر وقت اس کی ٹوہ میں رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی کہ کوئی اجنبی لڑکی فرخندہ کے ساتھ اس کے بیڈ روم میں موجود ہے۔ درحقیقت وہ ڈرائیور جس نے ہمیں سنیما پر اتارا تھا میڈم نادرہ کا "معلوماتی ذریعہ" بھی تھا۔ فرخندہ کے منع کرنے کے باوجود وہ میڈم نادرہ کے کان میں یہ بات ڈال چکا تھا۔

"اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی.......... "کون؟" فرخندہ نے سہم کر پوچھا۔

"دروازہ کھولو فرخندہ" میڈم نادرہ کی کرخت آواز آئی۔ ہم دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"کیا بات ہے پھوپھو.......... میں لحاف میں ہوں۔"

"میں کہتی ہوں دروازہ کھولتی ہو یا بلاؤں تمہاری ماں کو' کون ہے تمہارے ساتھ اس وقت؟"

"ک.......... کوئی نہیں پھوپھو' میں اکیلی ہوں۔"

"بکواس مت کر' دروازہ کھول" میڈم نادرہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی۔ فرخندہ نے پریشان نظروں سے مجھے دیکھا۔ کمرے سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ نہ ہی کہیں چھپنے کی جگہ تھی۔ دروازہ دھڑا دھڑ بج رہا تھا۔ فرخندہ کو کچھ اور نہیں سوجھا تو آخری کوشش کے طور پر اس نے باتھ روم کا بلب اتار کر مجھے وہاں چھپا دیا.......... دروازہ ابھی

بس ٹوٹنے ہی والا تھا۔ ساتھ ساتھ میڈم نادرہ کی چیختی ہوئی آواز بھی آ رہی تھی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر غصیلی عورت ہے' فرخندہ نے جونہی دروازہ کھولا وہ بگولے کی طرح کمرے میں چکرانے لگی۔ قدموں کی چاپ اور دیگر آہٹوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پورے کمرے کی تلاشی لے رہی ہے۔ ملی جلی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پھر کسی نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور اندر جھانکنے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ میڈم نادرہ اندھیرے میں در و دیوار کو گھور رہی تھی۔ اچانک اس نے مجھے دیکھ لیا۔ جونہی اس کے چہرے کے تاثرات بدلے میں اپنی جگہ سے متحرک ہوئی اور لپکتی ہوئی میڈم نادرہ کے پہلو سے نکل گئی۔ میڈم نادرہ اپنے بھاری تن و توش کے ساتھ چیختی ہوئی میرے پیچھے ہوئی۔ دروازے کے پاس فرخندہ "پھوپھو جان" کہہ کر اس سے لپٹ گئی.......... اس کے ساتھ ہی اس نے کار کی چابی والا "کی رنگ" میری طرف اچھالا اور چلا کر بولی۔

"بھاگ جاؤ ثنا! یہ بڑی گاڑی کی چابی ہے جو ادھر پورچ میں کھڑی ہے۔"

میں نے ایک ساعت کے لئے میڈم نادرہ کو فرخندہ سے الجھتے ہوئے دیکھا اور میکانکی انداز میں پورچ کی طرف بڑھی۔ میڈم نادرہ اب پکار پکار کر نوکروں کو آوازیں دے رہی تھیں۔ "نذیر.......... طفیل.......... چھوٹے" میں ایک روشن دروازے سے کنی کتراتی ہوئی برآمدے میں پہنچی۔ سامنے ہی مجھے سفید سی نظر آئی۔ کالج کے زمانے میں اس گاڑی پر فرخندہ اور میں نے کئی لمبی ڈرائیو کی تھیں۔ کئی بار میں نے اسے خود بھی ڈرائیو کیا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ ایک عجب سی خود وارفتگی میرے اندر پیدا ہو چکی تھی۔ کلچ دبا کر میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور چند بار ریس دے کر پہلا گیئر لگا دیا۔ میڈم نادرہ ایک نوکر کے ساتھ چلاتی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ پہلے اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جو لاک تھا' پھر وہ لپک کر گاڑی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ نوکر بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے ہارن پر ہاتھ رکھ دیا اور رینگنے کی رفتار سے گاڑی ان دونوں کی طرف بڑھائی۔ نوکر تو میرے تاثرات دیکھ کر فوراً پیچھے ہٹ گیا لیکن میڈم نادرہ اپنے پورے تن و توش کے ساتھ ڈٹی رہی۔ میری صورت دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی گاڑی کو پہلے ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کرتی رہی.......... پھر بونٹ پر اوندھی لیٹ گئی۔ وہ کسی طور پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں تھی۔ میرے اندر مچلنے والا

لاوا بھی اچھل چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تند سیلاب مہینوں سے کسی پتھریلے بند نے روک رکھا تھا جو اب ساری رکاوٹیں توڑ کر بہہ نکلا ہے۔ کوئی آندھی' بے پناہ شور سے میری سماعت کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ خوف' گھبراہٹ' کپکپاہٹ سب کچھ اس آندھی میں اڑ گیا تھا۔

"ہٹ جا......... بدبخت ہٹ جا" میں نے چیخ کر کہا۔ پھر پورا کلچ چھوڑ کر ریس دی۔ پہیے چرچرائے اور گاڑی لہراتی ہوئی چند گملوں سے ٹکرانے کے بعد بیرونی گیٹ کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ میں نے نادرہ کو اچھل کر اپنے سامنے گرتے دیکھا۔ وہ ایک دیوار سے ٹکرا کر دوبارہ گاڑی کے سامنے گری اور دائیں جانب کے دونوں پہیے اس کے اوپر سے گزر گئے۔ گاڑی کے بمپر نے ادھ کھلے گیٹ کو زوردار ٹکر سے کھولا اور گاڑی سڑک پر آگئی۔ میں نے مضبوطی سے اسٹیرنگ سنبھالا اور ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتی چلی گئی۔ میں رو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ جانے کب سے رکے ہوئے تھے یہ آنسو!

اگلے روز رات آٹھ بجے تک میں پال پور پہنچ چکی تھی۔ فرخندہ کی گاڑی تو میں نے لاہور ہی میں شیرانوالہ گیٹ کے پاس چھوڑ دی تھی۔ وہاں سے پیدل لاری اڈے پہنچی تھی اور سفر کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد جھنگ اور وہاں سے پال پور آگئی تھی۔ لاہور کے حالات سے گزرنے کے بعد میرے اندر ایک عجیب سی تبدیلی آچکی تھی۔ ایک بے خوفی اور خود اعتمادی سی دل میں راہ پا رہی تھی۔ ذہن میں یہ خیال راسخ ہو رہا تھا کہ کوئی میری مدد نہیں کرے گا اور نہ کوئی دکھ بانٹے گا۔ مجھے اپنے بیٹے کے لئے انصاف مانگنا نہیں خود حاصل کرنا ہوگا۔ یوں لگ رہا تھا کہ میرے بچے نے مرتے مرتے اپنا سارا درد میرے جسم میں منتقل کر دیا ہے اور جب تک میں اس درد کا حساب نہیں لے لوں گی مجھے موت آئے گی نہ سکون.........!

جب میں حویلی میں چودھری شاب کے سامنے پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر یک دم ہراساں نظر آنے لگا اور بے ساختہ بولا "بی بی جی! کہاں چلی گئی تھیں آپ' مجھے......... مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ میرا بندہ بھی زخمی کر دیا آپ نے' کیوں ایسا کیا آپ نے؟"

میں خاموشی سے اپنے آنسو چادر کے کناروں میں جذب کرتی رہی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کوئی جواب نہیں دوں گی اور جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے بتائے بغیر بھی وہ سمجھ رہا تھا کہ میں لاہور اپنے گھر گئی تھی "اپنا گھر" ایک تیر سا دل میں چبھ رہا تھا یہ سوچ کر بھی۔

چودھری شاب نے ہراس آمیز لہجے میں پوچھا۔ "کسی نے پہچانا تو نہیں آپ کو ادھر آتے ہوئے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ حویلی پولیس کی نگرانی میں ہے اور آج رات کسی وقت مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔

میں ششدر رہ گئی۔ ایک وہی تو سہارا تھا میرے پاس' کیا وہ بھی چھوٹنے والا تھا۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

چودھری نے ستے ہوئے لہجے میں کہا "وہی سلیم کا بیان' میں نے ضمانت قبل از گرفتاری کرا لی تھی ورنہ صبح ہی پکڑ لیا جاتا۔ اب رات بارہ بجے کا انتظار ہے۔ جونہی ضمانت کا وقت ختم ہوا پولیس دروازے پر آجائے گی۔"

"اب کیا ہوگا؟"

وہ زبردستی ہنس کر بولا "اگر آپ کو کسی نے نہیں دیکھا تو پھر کچھ بھی نہیں ہوگا۔ مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔ آپ تسلی سے کمرے میں سوئیں۔ سویرے آپ کا جو پروگرام ہو وہ حمیدہ کو بتا دیں۔ وہ ہر طرح آپ کی مدد کرے گی؟"

چودھری کے لہجے میں ہلکا سا طنز بھی تھا۔ میں نے اس طنز کو نظرانداز کر کے پوچھا "چودھری تم مجھے تو بھاگنے کا مشورہ دیتے رہے ہو خود کیوں نہیں بھاگ جاتے' کسی طرح نکل جاؤ یہاں سے۔"

وہ بولا "بی بی جی! یہ سب کچھ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ مجھے پتہ ہے کب بھاگنا ہے کب بھگتنا ہے۔ یہ تو اب لمبا ہی چکر چل گیا ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ آپ [illegible] کر کیا کرنا ہے۔ آپ اچھی بھلی عقل مند ہیں بلکہ ہم جیسے جنوں کو عقل دے [illegible]۔ ایک بات آپ کو بتا دوں اگر آپ پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئیں تو وہ آپ کو ٹھکانے پہنچا کر چھوڑیں گے۔"

میں نے کہا "چودھری! ایک بات پوچھوں بتاؤ گے؟"
میرے لہجے پر چودھری نے چونک کر میری طرف دیکھا وہ کچھ دیر میری آنکھوں
میں جھانکتا رہا، پھر بولا "میں آپ سے انکار نہیں کرسکتا" ان چند لفظوں میں وہ کچھ اور بھی
کہہ رہا تھا لیکن میں وہ سننا چاہتی تھی اور نہ سن سکتی تھی۔"

میں نے صاف سیدھے لہجے میں کہا "سوچ لو!"

وہ بولا "سوچ کر ہی کہا ہے۔"

میں نے کہا "جان محمد نے اس رات تمہیں کوئی اہم بات بتائی تھی۔ میرا خیال ہے
وہ بات "بڑی حویلی" کے بارے میں تھی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

"چودھری شہاب نے گہری سنجیدگی کے ساتھ اثبات میں سرہلا دیا۔ پھر ایک گہری
سانس لے کر بولا "وہ بات بڑی حویلی کے بارے میں ہی تھی اور میرا خیال ہے آپ کو
بتانے میں کوئی ہرج بھی نہیں۔ درحقیقت وہ بات اہم ہونے کے باوجود اس وقت غیر
ہے۔ اسے اہم بنانے کے لئے وقت درکار ہے، جو کل تک تو میرے پاس تھا لیکن اب
نہیں ہے۔"

مختصر تمہید کے بعد چودھری شہاب نے اس رات جان بلب جان محمد کے
ہونے والی گفتگو کے بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"کوئی سات آٹھ ماہ پرانی بات ہے۔ ایک رات فارسٹ گارڈ جان محمد ڈیوٹی پر
کر اسے کچے راستے سے کچھ ہٹ کر گھنے درختوں میں کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دیں
جنگل میں ان دنوں لکڑی بہت چوری ہو رہی تھی۔ جان محمد چونک گیا اور صورت
جاننے کے لئے وہ دبے پاؤں درختوں کے اس جھنڈ کی طرف بڑھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران
گیا کہ وہاں جاگیردار واصف چنگیزی ایک اجنبی شخص سے مصروف گفتگو ہے۔
چکلا شخص کافی بوڑھا تھا اور رک رک کر باتیں کرتا تھا۔ واصف اس سے کہہ
"رحیمی! تم جانتے ہو یہ کتنا نازک معاملہ ہے، میری عزت، دولت اور شہرت سب
پر ہے۔ ذرا سوچو اگر کسی کو بھنک بھی پڑ جائے تو ہم سب کا کیا حال ہو۔ تمہیں پتہ
الیکشن بھی لڑنے والا ہوں۔ سیاست دان کی مجبوریاں تم نہیں سمجھتے ہو، شیشے میں بال
والی بات ہوتی ہے۔"

جواب میں رحیمی نامی اس بوڑھے شخص نے کہا "واصف صاحب، بے فکر رہیں جو
آپ کے اور میرے درمیان میں ہے وہ کسی تیسرے تک نہیں پہنچے گی۔ بچے ذرا
باتی ہوتے ہیں میں اسے سمجھا دوں گا، آئندہ اس کی طرف سے آپ کو کوئی شکایت
نہیں ہوگی۔"

واصف نے تنبیہی لہجے میں کہا "اور دیکھو ملازم جب زیادہ پرانے ہو جائیں تو
بن جاتے ہیں۔ اپنے ملازم بدل دو، بالکل نئے ملازم رکھو، جو تمہیں پہلے سے نہ
جانتے ہوں۔" رحیمی نے اقرار میں سرہلایا۔ واصف نے پھر کہا "زیادہ میل جول تمہارے
لئے ٹھیک نہیں۔ ہر نئے ملنے والے پر گہری نظر رکھو۔ اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔"
اس پراسرار گفتگو کے بعد واصف اپنے گھوڑے پر آ بیٹھا اور رحیمی نامی وہ شخص
جو شکاری بوٹ اور برساتی پہنے ہوئے تھا اپنی چھڑی ٹیکتا مخالف سمت میں بڑھ گیا۔
جان محمد نے تجسس سے مجبور ہو کر اس کا پیچھا کیا۔ کوئی ایک فرلانگ دور درختوں کے
درمیان ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس میں دو آدمی پہلے سے سوار تھے۔ بوڑھے کے بیٹھتے ہی
جیپ اسٹارٹ ہوئی اور ایک طرف نکل گئی۔ اس کی عقبی بتی کی روشنی میں جان محمد اس کا
نمبر پڑھنے میں کامیاب رہا۔ وہ پرائیویٹ جیپ تھی......... چند روز بعد جان محمد نے ایک
کار کے ذریعے رجسٹریشن آفس سے جیپ کے مالک کا پتہ کرایا۔ اس کا نام عظمت
رحیمی معلوم ہوا۔ وہ جھنگ ہی کی ایک تحصیل پر رہنے والا تھا۔ پال پور سے وہاں کا
بذریعہ پکی سڑک پینتیس چالیس میل تھا۔ جان محمد نے خان رحیمی کا نام پہلے بھی سن
رکھا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ شخص علاقے کا مشہور شکاری ہے اور اخباروں میں اس کے
لکھا جاتا رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک کتاب بھی لکھی تھی جس میں سندر
جنگلات کا حال بے حد تفصیل سے درج تھا اور شکار کے کچھ واقعات بھی تھے۔
تمام واقعات پچیس تیس سال پرانے تھے اور اب ایک عرصے سے خان رحیمی کے
کچھ سننے یا پڑھنے میں نہیں آیا تھا۔ جان محمد، خان رحیمی کو صرف نام سے جانتا تھا
تھی کہ اس روز اسے واصف کے ساتھ دیکھ کر اسے خیال تک نہیں آیا تھا کہ یہ
ہی کا مشہور معروف شکاری ہے۔
خان رحیمی اور جاگیردار واصف کی گفتگو سننے کے بعد جان محمد کے ذہن میں ایک

کانٹا سا چبھ چکا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ کیا کھیل ہے جو جاگیردار واصف اور [illegible] رحیمی کے درمیان کھیلا جا رہا ہے۔ اپنے اس تجسس سے مجبور ہو کر وہ ایک روز [illegible] کے مضافات میں خان رحیمی کے علاقے میں پہنچ گیا۔ سندری گاؤں کے نواح میں [illegible] وسیع قطعہ اراضی خان رحیمی کی ملکیت تھا۔ یہ تمام جگہ درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی [illegible] خان رحیمی یہاں اپنے پرکھوں کے زمانے کی ایک کہنہ سال کوٹھی میں رہتا تھا۔ یہاں [illegible] کر جان محمد کو معلوم ہوا کہ خان رحیمی کے شکار کا شوق اب صرف مچھلی اور باز کے [illegible] تک محدود رہ گیا ہے۔ سردیوں کے آغاز میں جب مہاجر پرندے درختوں پر نظر آنے [illegible] ہیں، خان رحیمی اور اس کے ساتھی بے حد مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کا اصل ہدف [illegible] ہی ہوتا ہے۔ باز کے شکار کے لئے خان رحیمی ہر سال تین چار لائسنس حاصل کر[illegible] اور اس کاروبار میں اسے کبھی گھاٹا نہیں ہوا۔ اپنے پکڑے ہوئے بعض اچھے پرندوں [illegible] ٹریننگ بھی کرتا ہے۔ بعد ازاں یہ پرندے عرب شیوخ کے ہاتھ گراں قیمت پر فروخت [illegible] جاتے ہیں۔ ان بنیادی معلومات کے سوا جان محمد کوئی بھی کام کی بات معلوم نہ کر سکا۔ [illegible] خان رحیمی کے طرز زندگی نے اس کے شکوک کو کچھ اور ہوا دی اور وہ وہاں سے [illegible] تجسس کو بڑھا کر واپس آ گیا۔

کوئی تین چار ہفتے بعد ایک روز اچانک اس کی نگاہ اخبار کے ایک اشتہار پر [illegible] یہ ضرورت ملازمہ کا اشتہار تھا "ایک پڑھی لکھی، خوش اطوار نوجوان ملازمہ کی ضرو[illegible] ہے جو ایک عمر رسیدہ شخص کی دیکھ بھال کر سکے۔ اگر نرسنگ کی سوجھ بوجھ بھی رکھتی [illegible] بہتر ہے۔ اپنے مکمل کوائف کے ساتھ خود ملیں۔ تنخواہ معقول دی جائے گی۔" یہ ا[illegible] کسی عبدالباقر نامی شخص کی طرف سے تھا لیکن ایڈریس اور فون نمبر خان رحیمی کا [illegible] جان محمد کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ عبدالباقر خان رحیمی کا کوئی عزیز ہے جس نے [illegible] رحیمی کی طرف سے اشتہار دیا ہے۔ جان محمد کے ذہن میں ایک بات آئی۔ وہ پال پور [illegible] ہائی سکول کی ایک استانی کو جانتا تھا، اسے باہمی چپقلش کی بنا پر ہیڈ مسٹریس نے ملازمت [illegible] علیحدہ کرا دیا تھا اور وہ بیچاری ان دنوں بیروزگار تھی۔ جان محمد نے سوچا کیوں نہ زر[illegible] اس لڑکی کو اس ملازمت کے بارے بتایا جائے۔ اگر وہ ملازم ہو کر خان رحیمی کے [illegible] گھس جاتی تو اندرون خانہ رازوں تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ یوں اس کی [illegible]

[illegible] مسئلہ بھی حل ہوتا اور جان محمد کی مطلب براری بھی ہو جاتی۔ اس نے زرینہ سے بات [illegible] وہ تیار ہو گئی۔ اشتہار میں دیئے ہوئے پتے پر جا کر اس نے انٹرویو دیا لیکن ناکام [illegible] وہاں اس سے زیادہ پڑھی لکھی اور خوبصورت ایک لڑکی موجود تھی اور اسے ہی [illegible] گیا۔ تاہم زرینہ کو کل وقتی گھریلو کام کاج کے لئے ملازمت کی پیش کش کی گئی جسے [illegible] ٹھکرا کر واپس آ گئی۔ اس کے بعد جان محمد اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکا یہاں تک کہ اسے [illegible] نے آ لیا۔"

[illegible] میں خاموشی سے چودھری شہاب کی باتیں سن رہی تھی۔ دل میں ایک عجیب ترنگ [illegible] پیدا ہو رہی تھی۔ کہتے ہیں پانی اپنا راستہ خود ڈھونڈ لیتا ہے۔ فرحان کی موت کا انتقام [illegible] سیلاب کے ایسے تند و تیز پانی کی مانند تھا جو اپنی راہ تلاش کر رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں [illegible] نہیں تھی کہ جاگیردار وہاب کے درجنوں محافظوں کی طاقت کو ناکام بنا کر اس کی [illegible] تک پہنچ سکتے۔ نہ ہی ان ناتواں ہاتھوں کو دستک کے لئے قانون کے دروازے تک [illegible] دیا جا رہا تھا۔ اب پھر کون سا راستہ رہ جاتا تھا۔ میں گھپ اندھیرے میں چاروں طرف [illegible] رہی تھی اور چودھری شہاب کی باتیں اس اندھیرے میں ایک روشن کرن کی طرح [illegible] میرے سینے میں ایک لہر سی پیدا ہو رہی تھی۔ میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں [illegible] شہاب سے کہا۔

"چودھری! کیا وہ ایڈریس تم مجھے دے سکتے ہو؟"

چودھری کچھ دیر خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کے چہرے پر دبا دبا [illegible] نظر آنے لگا۔ وہ لرزاں آواز میں بولا "کیا آپ.......... کیا آپ.......... میرا مطلب [illegible] .... اوہ میرے دماغ میں پہلے یہ بات کیوں نہیں آئی۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں [illegible] رہا ہوں آپ کی بات آپ وہاں جانا چاہتی ہیں نا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا.......... وہ بولا "آپ کا فیصلہ تو بالکل ٹھیک ہے لیکن آپ [illegible] ذرا دھیان سے رہنا ہو گا۔ سنا ہے خان رحیمی کچھ خبطی سا شخص ہے.......... میرا [illegible] ہے عورتوں کے بارے میں، ایسے بندے خطرناک بھی ہوتے ہیں.........."

[illegible] شہاب کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ دھیمے لہجے میں بولا "دیکھیں جی، آپ پڑھی [illegible] عقل والی ہیں۔ آپ کی عقل اور طرح کی ہے، ہماری اور طرح کی، جو کام بھی کریں

اپنی ذمے داری پر کریں اور اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔ میں نے تو جیل میں ہوتا ہے
ایسی ویسی بات ہو گئی آپ کے ساتھ تو بڑی مشکل ہو گی۔"

میں نے کہا "چودھری! میں جو کہہ رہی ہوں سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہوں......
لیکن ایک بات بتا...... تو بھی تو کسی باز وغیرہ کے چکر میں ہے...... یہ سارا ایک
معاملہ تو نہیں؟"

چودھری کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میرے اس سوال نے اسے
پریشان کر دیا تھا۔ بمشکل سنبھل کر بولا

"تم...... آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"تمہارے بندوں کی باتوں سے۔"

اپنی کھردری داڑھی پر ہاتھ کی پشت کھجا کر بولا "نہیں بی بی جی! یہ ایک بالکل الگ
معاملہ ہے، جاگیردار وہاب کے معاملے سے یا خان رحیمی سے کوئی میل نہیں اس کا......
اچھا میں آپ کو خان رحیمی کا ڈریس دیتا ہوں" اس نے معقول نظر آنے کی کوشش
"ایڈریس" کا حلیہ بگاڑتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر ایک الماری تک گیا اور کئی ماہ پرانے اخ
کا ایک چھوٹا سا تراشا میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ باز والا معاملہ
کر رہا ہے۔ میں بغور اشتہار دیکھنے لگی۔ تقریباً چار ماہ پرانی بات تھی۔ ناممکن سی بات
کہ ابھی تک کیئر ٹیکر یا گھریلو ملازمہ کی آسامی خالی ہو، بہرحال میں کوشش کرنا چاہتی تھی

رات گزر چکی تھی اور رات کے ساتھ ہی رات کے واقعات بھی بیت چکے
نصف شب کے فوراً بعد پولیس نے چودھری شباب کو گرفتار کر لیا تھا۔ میں اس
حویلی کی چھت پر کاٹھ کباڑ کی ایک کوٹھڑی میں موجود تھی۔ پولیس کے جانے کے
حمیدہ نے مجھے کوٹھڑی سے نکالا تھا اور رازداری کے ساتھ چودھری شباب کے کمرے
لے آئی تھی۔ بہن بھائی کے سوا کسی کو میری موجودگی کا علم نہیں تھا۔ چودھری
حمیدہ کو سب کچھ سمجھا کر گیا تھا۔ اس نے راتوں رات میری روانگی کا بندوبست کر دیا
ایک قمیض اس نے سلائی مار کر میرے لئے چھوٹی کر دی اور ایک قدرے پرانی شلوار
ساتھ میچنگ بھی کر دی۔ مجھے نئی طرز کا برقعہ درکار تھا۔ جس کا انتظام نہیں ہو سکا
حمیدہ ہی کی ایک ریشمی چادر سے کام چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پوری طرح تیار ہو کر

صبح چودھری کے ایک ادھیڑ عمر ملازم کے ساتھ حویلی سے نکل آئی۔ اکبر نامی اس ملازم
نے بطور "ایک پڑوسی" خان رحیمی کے ڈیرے تک میرے ساتھ جانا تھا۔ ہمارا دشوار گزار
سفر شروع ہوا۔ پہلے تانگیں، پھر تانگہ پھر بس اور آخر میں ایک بار پھر تانگہ۔ تب پاؤں پاؤں
چلتے ہم سندری گاؤں کے نواح میں خان رحیمی کی زمین پر جا پہنچے۔ ہمارا یہ سفر جب اختتام
پذیر ہوا تو شام کی تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ جسم تھکن سے چور تھا اور دل انجانے خدشوں
سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا۔ ڈر صرف ایک ہی تھا کہیں خان رحیمی کے
ملازمین میں کوئی ایسا ملازم نہ ہو جو اس سے پہلے بڑی حویلی رہ چکا ہو اور مجھے پہچان لے۔
دور ہی سے خان کی رہائش گاہ نظر آ گئی۔ ایک پیشہ ور شکاری ہونے کے علاوہ خاصا کھاتا پیتا
شخص دکھائی دیتا تھا۔ کوٹھی بہت پرانی تھی مگر اس کی دیکھ بھال اچھی طرح کی جاتی تھی۔
[illegible]ن ترشے ہوئے تھے۔ ایک طرف ٹیرس تھا جو بعد میں بتایا گیا تھا مگر کوٹھی ہی کا حصہ
دکھائی دیتا تھا۔ کوٹھی کے مین گیٹ تک سرخ بجری کی سڑک تھی ہم گیٹ پر پہنچے تو ایک
سخت گیر چوکیدار نے راستہ روکا۔ میں نے اخبار کا تراشا دکھا کر مدعا بیان کیا۔ اس دوران
لمبے قد کا ایک صحت مند نوجوان ڈگ بھرتا ہوا گیٹ پر آ گیا۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی
تھی۔ لباس پتلون جیکٹ پر مشتمل تھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک گھورا۔

اکبر نے کہا "جی ہم آپ کا یہ اشتہار پڑھ کر آئے ہیں یہ میری......"

"وٹ اے نان سینس" وہ بات کاٹ کر بولا "چار ماہ بعد آپ کو اب خیال آیا
ہے...... ہم دے چکے ہیں ملازمت۔"

وہ واپس جانے کے لئے مڑا تو میں نے کہا۔

"پلیز! ذرا سنئے میں دراصل......" وہ رک کر گھورنے لگا، میں نے سنبھل کر کہا
"دراصل میں رحیمی صاحب کو بہت پہلے سے جانتی ہوں، ان کی فین ہوں میں، اتنی دور
سے آئی ہوں۔ اگر ایک بار ان سے میرا مطلب ہے ملازمت نہ سہی، ملاقات ہی ہو جاتی
[illegible]ے۔"

میری بات جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ وہ غرا کر بولا "آپ چاہتی کیا ہیں؟ یہاں کوئی
[illegible]ں پر لوٹ نہیں لگتے، غلط بتایا ہے آپ کو جس نے بتایا ہے۔ جائیے آپ یہاں سے،

میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔"

اتنے میں ایک گاڑی کیری کی سڑک پر مڑی اور تیزی سے ہمارے قریب آگئی۔ گاڑی کو دیکھتے ہی چوکیدار نے لپک کر گیٹ کھول دیا۔ میں نے دیکھا پرانی شیورلیٹ کی پچھلی سیٹ پر ایک ستر اسی سالہ بوڑھا ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سفید بال' سفید مونچھیں اور بھنویں' اس کے چہرے کی ہڈیاں چوڑی اور مضبوط تھیں۔ دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس شخص نے پوری زندگی جفاکشی میں گزاری ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ وہ بھی کوئی شکاری قسم کی چیز نظر آتے تھے۔ بوڑھے نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور نوجوان سے پوچھا "باقر! کیا بات ہے؟" نوجوان کے بولنے سے پہلے ہی وہ بولا۔

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا" اس نے مڑ کر ایک تیز نظر میرے چہرے پر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں ایک نمایاں چمک عود کر آئی "ملازمت کے لئے آئی ہو؟"

"جج........ جی سر" میں نے جواب دیا۔

"او کے........ او کے مل جائے گی۔"

نوجوان باقر نے احتجاجی انداز میں منہ کھولا لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی الفاظ واپس لے لئے اور تیز قدموں سے چلتا ٹیرس کی طرف چلا گیا۔ بوڑھا جو یقیناً خان رحیمی تھا میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور ملائم لہجے میں بولا۔

"کم آن گرل ود یور........؟" فقرہ ادھورا چھوڑ کر وہ اکبر کا تعارف چاہ رہا تھا۔

"انکل........ ہمارے پڑوسی ہیں یہ' میرے ساتھ آئے ہیں لاہور سے" میں نے خان رحیمی کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"اوہ گڈ........ ویری گڈ' لے آؤ ان کو بھی۔"

تھوڑی دیر بعد ہم خان رحیمی کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ حسب توقع یہ ڈرائنگ روم جانوروں اور پرندوں کی ٹرافیوں سے سجا ہوا تھا۔ ہر طرف حنوط شدہ سر اور سرٹیفیکٹس فریموں کے اندر سجے ہوئے تھے۔ خان رحیمی کا ... ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور وہ گہری نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

"دیکھو مس!" اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "جس آسامی کے لئے تم آئی تھیں وہ تو پر ہو چکی ہے........ ہاں اگر تم اپنے کچھ ایکسٹرا ٹیلنٹ ثابت کر دو تو میں تمہیں

رکھ سکتا ہوں لیکن میرے گھر کی ملازمت کی دوسری لازم شرط خوش باشی ہے اور خوش باشی مجھے تمہارے چہرے پر دور دور نظر نہیں آ رہی۔"

میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا "لیکن سر! آپ نے پہلی شرط تو بتائی ہی نہیں۔"

"پہلی شرط تم پوری کر چکی ہو! اس لئے بضرورت نہیں سمجھی۔ میرا مطلب ہے' یو آر بیوٹی فل!"

میں نے عام سے لہجے میں کہا "سر یہ آپ کی نگاہ کی خوبصورتی ہے۔"

وہ بے تکلفی سے بولا "نو فارمیلیٹیز" رسمی باتوں سے مجھے چڑ ہے۔ میں مار بیٹھتا ہوں پر تکلف شخص کو........ لطیفے آتے ہیں تمہیں' آئی مین جوکس!"

"یس سر........ کچھ کچھ۔"

"کچھ کچھ نہیں چلے گا یہاں جو چلے گا "بہت کچھ" چلے گا۔ اچھا کوئی لطیفہ سناؤ۔"

میں خاموش رہی "بتاؤ........ بتاؤ" وہ تیزی سے بولا "شو می یور کوالیفیکیشن' اٹ از نو تھنگ بٹ یور کوالیفیکیشن" میں ابھی سوچ رہی تھی کہ وہ پھر بولا۔

"ویری سیڈ" لطائف کے بارے میں تمہاری معلومات بہت محدود ہیں........ کوئی گھسا پٹا لطیفہ بھی تمہارے ذہن میں نہیں آیا۔ خیر لطیفہ یوں ہے کہ ایک شخص کے اوپری جسم پر کوٹ اور ٹائی تھی۔ نیچے پائجامہ باندھ رکھا تھا۔ پوچھنے والے نے پوچھا........ بھائی یہ کیا؟ اوپر کوٹ کیوں پہن رکھا ہے؟ وہ بولا میاں گھر میں کوئی مہمان ہی آ جاتا ہے۔ اس نے پوچھا تو نیچے پائجامہ کیوں ہے' وہ بولا "کسی وقت مہمان نہیں بھی آتا........ حد ہو گئی۔ کوئی لطیفہ بھی تمہیں یاد نہیں۔ اچھا اب بتاؤ اس لطیفے سے کون سا اچھا لطیفہ جڑتا ہے؟"

مجھے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا یہ کیسے شخص سے پالا پڑا ہے۔ دماغ تو درد کا پھوڑا بنا ہوا تھا۔ لطائف کہاں سے یاد آتے۔ بہرحال خبطی کا سامنا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دے کر اور چہرے پر مسکراہٹ لا کر کہا "سر! ایک لطیفہ ذہن میں آتا ہے کہ بسیار خور مہمان سب کچھ چٹ کر گیا۔ میزبان کا بچہ رونے لگا۔ ماں نے آہستہ سے پوچھا "کیوں روتا ہے؟" وہ بولا "بھوک لگی ہے" ماں بولی "ذرا صبر کر" یہ پیٹو چلا جائے تو سب مل کر روئیں گے۔"

خان رحیمی نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا اور انگلی نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ "لطیفہ اچھا ہے لیکن برمحل نہیں" اس جگہ پائجامے کے حوالے سے وہ ہاتھی اور چوہے والا لطیفہ زیادہ سوٹ کرتا ہے۔"

"کون سا چوہے والا؟"

"ویری سیڈ......... ویری سیڈ" خان رحیمی نے بے پناہ افسوس سے سر ہلایا "تمہیں تو کچھ پتہ نہیں........."

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اچانک راہداری کی طرف سے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ خان رحیمی چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ شلوار قمیض پر آدھے بازو کا نیلا سویٹر پہنے ہوئے ایک شخص دہلیز پر نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں طاقتور شاٹ گن تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" خان رحیمی نے گرج کر پوچھا۔

وہ سلام کرکے اندر آیا اور مؤدبانہ انداز میں خان رحیمی کے کان کے پاس جھک گیا۔ اس نے جو کچھ بتایا کافی سنسنی خیز تھا کیونکہ بوڑھے رحیمی کی مونچھیں دھیرے دھیرے پھڑکنے لگیں تھیں۔

"پیچھا......... سائیکل......... غائب" اس طرح کے اکا دکا لفظ ہی میری سمجھ میں آسکے۔" دفعتاً خان رحیمی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے نوجوانوں کی طرح لپک کر دیوار سے ایک طاقتور رائفل اتاری اور نیلے سویٹر والے کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے آدمی دروازے کی طرف جارہے تھے۔ ان سب کے قدموں میں ہنگامہ خیز تیزی تھی۔

میں اپنی جگہ حیران پریشان بیٹھی رہی۔ اتنے میں کٹے ہوئے بالوں والی ایک خوبصورت لڑکی جدید فیشن کے کپڑوں میں ملبوس کمرے میں آگئی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی "میرا نام شوقیہ ایاز ہے، تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رحیمی صاحب تمہیں ملازم رکھ چکے ہیں۔ اب تمہیں لطیفے آتے ہوں یا نہیں، اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا' ہاں رحیمی صاحب حسِ مزاح کو بے حد پسند کرتے ہیں اگر یہاں پاؤں پھیلانا چاہتی ہو تو ہر صورت میں خوش مزاجی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔"

لڑکی کے لہجے میں ہلکی سی کاٹ بھی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ یہی وہ صاحبہ ہیں جنہیں رحیمی صاحب کی ذاتی خادمہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ غالباً وہ کمرے کے باہر سے ہماری گفتگو بھی سن رہی تھی۔ اس کے کہنے پر میں نے بھی جواباً اپنا تعارف کرایا۔ یہ جان کر کہ میں لاہور سے آئی ہوں' وہ نخوت سے بولی۔

"ہاں ہم مڈل کلاس والے روٹی کی تلاش میں دور دور تک مار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو روندتے کچلتے روٹی کی طرف بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں......... ویسے کیا کیا کرسکتی ہو؟"

میں نے کہا "ہر وہ کام جس سے عزت و وقار پر حرف نہ آئے کرسکتی ہوں۔"

وہ بولی "عزت و وقار ناپنے کا کوئی مخصوص پیمانہ نہیں ہوتا۔ حالات کے ساتھ سب کچھ بدلتا رہتا ہے۔ میں نے انگلینڈ میں بعض ہم وطنوں کو بڑے وقار سے جھاڑو دیتے بھی دیکھا ہے۔"

"میں اب بھی پروقار انداز میں جھاڑو دے سکتی ہوں" میں نے مسکرا کر کہا۔

شوقیہ ایاز سے کافی دیر بات چیت ہوتی رہی۔ وہ خود کو عقل کل سمجھنے والی ایک ہوشیار لڑکی تھی۔ مجھے ایک ساتھی ملازمہ کی بجائے وہ رقیب کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی' نہ جانے کیوں؟ میں نے کوشش کی کہ اس سے معلوم کرسکوں کہ خان رحیمی اور اس کے کارندے اتنی سردی میں کہاں نکل گئے ہیں۔ لیکن کچھ نہ جان سکی......... ایک پرتکلف کھانا کھلانے کے بعد شوقیہ ایاز نے مجھے میرا کمرہ دکھایا۔ دس ضرب بارہ کا یہ کمرہ کوٹھی کے عقبی حصے میں تھا۔ پرانا کمرہ تھا لیکن خوب صاف ستھرا۔ سرونٹ کوارٹر سے قدرے بہتر اور عام رہائشی کمروں سے کم تر تھا۔ ساتھ والا کمرہ ایک بوڑھے خانساماں کا تھا۔ اس سے آگے شوقیہ کا کمرہ تھا۔ یہ کمرہ خان رحیمی کی خوابگاہ سے متصل تھا۔ میں نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا' ایک کھڑکی جو پائیں باغ کی طرف کھلتی تھی بند کی۔ دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور لحاف اوڑھ کر بیٹھ گئی۔

حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے۔ کل اس وقت میں پال پور کے چوہدری شباب کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور پرسوں اس وقت لاہور میں فرخندہ کے ساتھ گاڑی میں سینما ہاؤس کی طرف جارہی تھی۔ فرخندہ کا خیال آتے ہی میڈم نادرہ کا چہرہ

چاند سا چہرہ نگاہوں میں گھوم گیا اور میں سر تا پا لرز گئی...... گاڑی کے زور سے اچھل کر
دیوار سے ٹکرائی تھی' پھر میں نے وہ پر ہول جھٹکا محسوس کیا تھا جس نے مجھے سمجھایا تھا
کہ میڈم نادرہ کے گوشت کو کچلتا ہوا گزر گیا ہے اور پھر دوسرا جھٹکا...... اوہ میرے
خدا' میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ تو کیا میں سچ مچ قاتلہ بن چکی ہوں۔ کیا میں نے میڈم نادرہ
خون کر دیا ہے۔ میں سوچتی رہی اور خوف سے کانپتی رہی۔ میں نے تصور میں دیکھا
پولیس میری تلاش میں چاروں طرف بھاگ رہی ہے۔ میرے میکے' میرے سسرال
ریلوے سٹیشن' لاری اڈے' دارالامان' ہر جگہ میری تلاش ہو رہی ہے۔ کسی نامعلوم
احساس کے تحت میں لحاف میں کچھ اور دبک گئی' قریب ہی انگیٹھی رکھی تھی' کچھ ادھ
لکڑیاں بھی تھیں لیکن مجھ میں اٹھ کر آگ جلانے کی ہمت نہیں تھی۔ یکایک ایک آہٹ
نے مجھے چونکا دیا۔ یہ آہٹ بالکل پاس سے سنائی دی تھی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس
بند کمرے میں میرے سوا کوئی اور بھی موجود ہے۔ کوئی جیتا جاگتا جسم۔ میں تڑپ کر اٹھ
بیٹھی۔ احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ لکڑی کی ایک قد آدم الماری کے عقب میں تھوڑی
سی جگہ خالی تھی۔ میرا اندیشہ مجھے کھینچتا ہوا اس خلا کی طرف لے گیا۔ دھڑکتے دل اور
چڑھی سانس کے ساتھ میں نے احتیاط سے الماری کے عقب میں دیکھا اور جسم سنسنا کر
گیا۔ وہاں کوئی موجود تھا۔ میں نے نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑیں۔ وہ ایک پندرہ
سالہ لڑکا تھا۔ اس نے ملیشیا کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ گھٹنے پیٹ سے لگائے وہ
بنا بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے شیشے میں خوف جم کر رہ گیا تھا۔ میں بھی کم خوفزدہ
تھی۔ میں نے انگلی اس کے چہرے کی طرف اٹھائی اور سرسراتی آواز میں پوچھا "کون
تو؟" وہ ٹکر ٹکر دیکھتا چلا گیا۔ شاید بھاگنے کی کوئی راہ ہوتی تو بھاگ ہی جاتا۔ میں نے
سے جائزہ لیا کہ کہیں اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ تو نہیں' وہ نہتا تھا۔ اس کی بائیں
پر ایک تازہ زخم تھا۔ زخم سے بہنے والا خون بائیں رخسار پر خشک ہو چکا تھا۔ اس
خاموش آنکھوں میں جھانکنے کے بعد نہ جانے کیوں میرا خوف ایک دم کم ہو گیا۔ وہ مجھے
چور اچکے سے زیادہ ایک بھگوڑا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ برابر کیا
آگے بڑھ کر پوچھا "کون ہے تو؟" وہ پھر بھی خاموش رہا میں نے کہا "چل نکل باہر
باہر نکل ورنہ میں آواز دیتی ہوں چوکیدار کو" میری دھمکی کے بعد اس کے جسم

تھوڑی سی جنبش پیدا ہوئی اور وہ کھسکتا ہوا باہر آ گیا۔ خاصا دراز قد تھا۔ مجھ سے ایک دو
برس زیادہ ہی ہو گا۔
میں نے پوچھا "کیا بات ہے کیوں چھپے ہوئے ہو یہاں؟"
اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آواز نکلی "میں چور نہیں ہوں جی' میں ڈر کر یہاں آ گیا
ہوں۔ میرے پیچھے کچھ بندے ہیں۔ میں اندر نہ آتا تو وہ مار دیتے مجھے۔"
"تمہیں پتہ ہے یہ کس کی کوٹھی ہے؟"
"نہیں جی!" میں پہلی بار اس طرف آیا ہوں کہیں یہ...... یہ خان رحیمی کا ڈیرہ
تو نہیں!"
"ہاں ڈیرہ تو خان رحیمی کا ہی ہے" اس کے چہرے پر خوف کے سائے کچھ اور
گہرے ہوئے۔
وہ بولا "مجھے معاف کر دیں جی میں بغیر پوچھے آپ کے گھر میں گھس گیا ہوں' میری
نیت بری نہیں تھی جی۔"
"تیرے پیچھے کون لوگ ہیں؟"
"وہ جی میرے ماموں کے دشمن ہیں' پرانی دشمنی ہے میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔"
اس کے بعد اس نے ڈرے ڈرے انداز میں جو کچھ بتلایا اس سے مجھے پتہ چلا کہ
وہ ایک نالے کے اوپر کی طرف سات آٹھ میل دور رنگی پورہ گاؤں کا رہنے والا ہے۔ وہ
نمبر تیرہ والے گاؤں میں اپنے ماموں کے پاس جا رہا تھا کہ کچھ لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ
گھوڑوں پر سوار تھے اور وہ سائیکل پر تھا اس نے بہت سائیکل بھگائی آخر ایک جگہ گر گیا
قریب تھا کہ پیچھے سے آنے والے اسے پکڑ لیتے کہ اس نے ایک جوہڑ میں چھلانگ لگا دی
اور نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا کافی دور نکل گیا۔ پھر بھی گھڑسواروں نے اس کا پیچھا نہیں
چھوڑا۔ آخر وہ اس کوٹھی میں پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ بیرونی دیوار پھلانگ کر اندر آیا اور
کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے اندر آ کر چھپ گیا۔
لڑکے کی باتوں میں جھوٹ کی آمیزش محسوس ہو رہی تھی۔ خاص طور پر میں
سائیکل کے ذکر پر چونک گئی۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے خان رحیمی کے کارندے نے جو اس
سان میں کھسر پھسر کی تھی اس میں بھی سائیکل کا ذکر آیا تھا۔ میں سوچنے پر مجبور ہو

87168

رہی تھی کہ کہیں یہ بھی وہی چکر نہ ہو۔ اپنی پوری روئیداد سنانے کے بعد لڑکا مجھ سے درخواست کرنے لگا کہ میں اس کی یہاں سے نکلنے میں مدد کروں۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ چور نہیں ہے اور اس نے اس سے پہلے اس طرح کی حرکت نہیں کی۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ وہ مظلوم نظر آ رہا تھا پتہ نہیں حقیقت میں کیا معاملہ تھا۔ اگر میرا سائیکل والا قیاس درست تھا تو بھی لڑکے کا خان رحیمی کے قبضے میں آنا درست نہیں تھا۔ معلوم نہیں بیچارے کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا۔ اب جب کہ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ بے قصور اور قصوروار نہیں ہے تو مجھے اسے روکنا نہیں چاہئے تھا۔ میں نے کہا کہ وہ مجھے سچ سچ بتا دے تو میں اسے خاموشی سے باہر نکال سکتی ہوں۔ دوسری صورت میں مجھے خان رحیمی کو بتانا پڑے گا۔ لڑکے کا رنگ زرد ہو گیا لیکن وہ تھا کایاں۔ سچی بات اس کی زبان پر نہیں آئی۔ وہ پہلے والی کہانی معمولی ردوبدل کے ساتھ دہرانے لگا۔ میں نے کافی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئی۔

بہرحال اس کا اتہ پتہ معلوم کرنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اسے جانے دوں۔ میں اسے پکڑنے والی تھی اور نہ چھوڑنے والی وہ خود ہی یہاں آیا تھا اور خود ہی جا رہا تھا لیکن جب میں نے باہر نکل کر اردگرد کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ لڑکے کا اتنی آسانی سے یہاں سے نکلنا آسان نہیں۔ بیرونی دیوار کافی اونچی تھی اور دیوار کے عین نیچے ٹین کے چھجے تلے دو مسلح افراد آگ جلائے بیٹھے تھے غالباً دونوں پہریدار تھے۔ ایسے ویران علاقوں میں بوقت شب گھر والوں کا چوکس رہنا بہت ضروری ہو جاتا ہے معلوم نہیں جب حنیف نامی لڑکا اندر کودا تو یہ دونوں آدمی کہاں تھے۔ بہرحال اب وہ انہیں چکمہ دے کر نہیں نکل سکتا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ رہی تھی کہ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ یہ ایک سے زائد گاڑیاں تھیں اور ان میں جیپ بھی تھی جس میں خان رحیمی دو گھنٹے پہلے یہاں سے نکلا تھا۔ جلد ہی کوٹھی کے طول و عرض میں قدموں کی ٹھک ٹھک اور گفتگو کی گونج سنائی دینے لگی یہ کافی افراد تھے اور غالباً خان رحیمی کے ڈرائنگ روم میں جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا ٹین کی چھت تلے ایک اور رائفل بردار آ گیا تھا اس کے علاوہ بیرونی گیٹ پر بھی چوکیدار مستعد نظر آنے لگا تھا.......... صورت حال ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ لڑکا نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکل سکتا۔ میں نے کمرے میں واپس جا کر

اسی دوران دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی وہ گھبرا کر الماری کے پیچھے چھپ گیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے شوقیہ کھڑی تھی۔ وہ قدم بڑھا کر کمرے کے وسط میں آ گئی۔ تحکمانہ انداز میں بولی۔

"خان جی کے مہمان آئے ہیں۔ پندرہ بیس آدمی ہیں۔ رات یہیں رہیں گے' تم مہمان خانے میں ان کے بستر وغیرہ بچھا دو اور پھر کچن میں کریم بخش اور سلطانہ کا ہاتھ بٹاؤ۔"

میں نے خوشدلی سے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ناک سکوڑ کر بولی "بو سی آ رہی ہے کہیں تمہارے کپڑوں سے تو..........؟"

"نہیں.......... ہاں" میں نے جواب دیا "میں ابھی بدل لیتی ہوں۔"

وہ ہونٹوں کو معاندانہ جنبش دیتی باہر نکل گئی۔ یہ بو حنیف کے کپڑوں سے اٹھ رہی تھی۔ جوہڑ میں کودنے سے اس کو کافی گار کیچڑ لگا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور حنیف سے کہا وہ باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے ورنہ مارا جائے گا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے اپنا بوسیدہ گدیلا دیا اور سمجھایا کہ وہ وہیں الماری کے پیچھے دبک کر بیٹھا رہے۔ بتی بجھا کر اور دروازے کو باہر سے کنڈی لگا کر میں مہمان خانے کی طرف چل دی۔ کچن کے سامنے سے گزرنے لگی تو خانساماں کریم بخش کی آواز آئی۔ وہ مجھے بلا رہا تھا۔

"جی!" میں نے اندر جا کر کہا۔

"بی بی! ذرا ہاتھ بٹاؤ' کھانا جلدی تیار کرنا ہے۔"

"لیکن میاں جی! وہ شوقیہ صاحبہ تو کہہ گئی ہیں پہلے بستر بچھا آؤ۔"

"اس لومڑی کو گولی مارو" باورچن سلطانہ نے کہا۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک جوان خوبصورت عورت تھی "بچھا لیں گے بستر بھی' پہلے تم یہ مچھلی صاف کرو۔"

اس نے فریزر میں لگی ہوئی پانچ چھ کلو چھوٹی مچھلی میری طرف بڑھا دی۔ کچن میں بے رونق تھی۔ ایک طرف بکرے کی پانچ چھ رانیں روسٹ کی جا رہی تھیں۔ دوسری طرف کڑاہی گوشت بنایا جا رہا تھا۔ تکوں کا سامان علیحدہ پڑا تھا۔ یہ تکے کسی پرندے کے تھے شاید مرغابی وغیرہ ہو گی۔ بعد میں پتہ چلا کہ رانیں بھی بکرے کی نہیں ہرن کی تھیں۔

زندگی میں پہلی دفعہ ہرن کا گوشت پکتے دیکھا۔ کوئی پون گھنٹہ کچن میں مصروف رہنے ...
بعد میں مہمان خانے بستر بچھانے چلی گئی۔ ایک ہال کمرے میں دس اور دو چھوٹے کمروں
میں چار چار بستر بچھانا تھے۔ چھوٹے کمرے میں بستر بچھاتے ہوئے مجھے ڈرائنگ روم ...
ہونے والی گفتگو کسی حد تک سنائی دینے لگی۔ گفتگو کے دوران گاہے گاہے خان رحیمی ...
زندگی سے بھرپور قہقہے بھی سنائی دے جاتے تھے۔ گو اس کی آواز میں لرزش تھی اور ...
رک رک کر بولتا تھا لیکن قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی ساری کمزوریاں دور ہو جاتی تھیں ...
یہ ایک بے تکلف محفل تھی۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ گفتگو باز کے شکار کے گرد
گھوم رہی ہے۔ کسی خاص قسم کے باز کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ اصغر نامی ایک شخص کا ذکر
بار بار آ رہا تھا۔ ایک بھاری آواز والے شخص نے سیالکوٹی لہجے میں کہا۔

"خان جی! وہ لڑکا ہے کہیں آس پاس ہی' میرا دل کہتا ہے کہ وہ دور نہیں گیا۔"

ایک دوسری آواز آئی "میرا تو خیال ہے یہ سنہری موقعہ گنوانا نہیں چاہیے کیوں ...
آج نیند قربان کر دی جائے' کھانا کھا کر پھر نکل چلتے ہیں۔"

خان رحیمی نے کہا "ایسا کرو کہ چار گروپ بنا کر چار علاقے بانٹ لو۔ ٹارچیں ...
لالٹینیں وغیرہ میرے پاس بہت ہیں۔ دس گیارہ بجے تک اسے تلاش کرو۔ مل گیا تو ٹھیک
ہے ورنہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ اس علاقے سے نکل گیا ہے۔ پھر نیند خراب کرنے کا کوئی
فائدہ نہیں ہوگا۔ واپس آ کر آرام کرو۔ صبح ناشتے کے بعد دوبارہ نکل چلیں گے۔ اس تجویز
کے حق میں دو تین آوازیں بلند ہوئیں......... میں یہ سب سن رہی تھی اور میرے ذہن ...
میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ گفتگو اسی حنیف نامی لڑکے ...
بارے میں ہو رہی ہے۔ سوچنے کی بات تھی کہ خان رحیمی اور اس کے اتنے سارے
دوست احباب اس معمولی سے لڑکے کے درپے کیوں ہو رہے ہیں اور اس خاص قسم ...
باز سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ڈرائنگ روم سے آنے والی آوازیں مجھے ایک اور شبہے ...
جتلا کر رہی تھیں۔ ان میں چند آوازیں میں نے پہلے بھی سنی ہوئی تھیں۔ اپنے شبہات ...
تصدیق کے لئے میں مہمان خانے کے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آئی اور چند ...
صحن میں چل کر ایک ادھ کھلے دروازے کے سامنے پہنچ گئی۔ صحن میں چونکہ مکمل تاریکی ...
تھی۔ میں ڈرائنگ روم کے کچھ حصے کا جائزہ لے سکتی تھی۔ میں نے دیکھا' دو تین ...

... ہوں پر چائے اور قہوے کے برتن رکھے ہیں اور امیرانہ حلیئے والے کئی بارعب افراد
... وہاں صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک دو مقامی دیہاتی بھی تھے۔ ایک
... خص کا چہرہ دیکھ کر میں بری طرح چونک گئی۔ میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ چھوٹی
... ڑھی والا یہ شخص شباب کے خاص آدمیوں میں شامل تھا۔ یہ ان چند مفروروں میں سے
... تھا جو چودھری شباب کے خفیہ ڈیرے پر رہ رہے تھے۔ اس شخص کو دیکھتے ہی میں پیچھے
... ٹ گئی۔ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہاں جس باز کا تذکرہ ہو رہا ہے یہ وہی ہے جس
... کے پیچھے چودھری شباب اور اس کے بندوں کی نیندیں بھی حرام ہو رہی ہیں۔ یقیناً کوئی
... بات تھی اس باز میں' جو اتنے سارے لوگ اس کی کھوج میں تھے۔ مہمان خانے
... ادھر ادھر گھومتے ہوئے میں پھر ان کی باتیں سننے لگی۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ دو
... گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک گروہ چودھری شباب کے آدمیوں کا بھی
... جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ دراصل تین چار شکاری پارٹیاں تھیں جو اب تک اپنے
... طور پر اس پرندے کو تلاش کر رہی تھیں اور اب انہوں نے مل کر کام کرنے کا فیصلہ
... تھا۔ جو سنسنی خیز انکشاف مجھ پر ہوا وہ یہ تھا کہ میرے کمرے میں چھپے ہوئے حنیف
... لڑکے کا اس باز سے گہرا تعلق ہے' شاید وہ لڑکا اس باز کے شکار میں مدد دے سکتا تھا' یا
... باز اس کی تحویل میں تھا؟

... کچھ دیر بعد مہمانوں نے پر تکلف کھانا کھایا۔ اس دوران ان کے گھوڑوں کو بھی
... دیا جا چکا تھا۔ دو تین مہمان سونے کے لئے مہمان خانے میں آ گئے۔ باقی سب
... اور شاٹ گنوں سے مسلح صحن میں جمع ہو گئے' ان کے ساتھ خان رحیمی کے
... ٹارچیں لالٹینیں وغیرہ تھامے ہوئے تھے۔ کئی ایک کے ہاتھ میں لاٹھیاں بھی نظر آ
... تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد چار گاڑیوں اور دس پندرہ گھوڑوں پر مشتمل یہ جلوس
... والے راستے پر سفر کرتا ہوا گھنے درختوں کی طرف جا رہا تھا۔

... کام کاج سے فارغ ہوتے ہی میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ دروازہ اندر سے بند
... میں نے الماری کے پیچھے جھانکا......... لڑکا وہیں موجود تھا۔ یہ تمام عرصہ اس نے
... گزارا تھا' میں نے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ فرمانبرداری سے باہر نکل کر
... کے بازو پر بیٹھ گیا۔ گدیلا بدستور اس کے کندھوں پر تھا۔

میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا "دیکھو! مجھے سچ سچ بتا دو تم نے کیا کیا ہے؟ خان رحیمی اور اس کے بندے ہر طرف تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ سخت غصے میں ہیں۔ اگر پکڑے جاؤ گے تو زندہ نہیں چھوڑیں گے......"

لڑکے کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ بولا "باجی! میں نے آپ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے' سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں چھپائی ہے؟" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ نفی میں سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا "وہ باز کہاں ہے جس کے لئے بندے تمہارے پیچھے پڑے ہوئے تھے؟" میرے اچانک سوال پر لڑکے کے ہونٹ پھڑک کر رہ گئے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ تحیر نظر آیا۔

"کون سا باز؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"وہی جو تمہارا نہیں ہے اور جسے راستے میں کہیں چھپا آئے ہو" میں نے ادھوری معلومات کے سہارے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ یہ تیر کچھ کچھ نشانے پر لگا۔ لڑکے کا اعتماد ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ میں نے کہا "خان رحیمی کی زبانی مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اب بتاؤ تمہاری سزا کیا ہونی چاہئے؟"

وہ پہلی بار قدرے خودسری سے بولا "وہ باز میرا ہے میں نے اسے پکڑا تھا۔ وہ سخت زخمی تھا۔ آنکھیں بالکل بند تھیں' اور گردن پر بھی ڈونگا پھٹ تھا' میں حکیم صادق سے اسے دوا لے کر نہ کھلاتا اور مرہم پٹی نہ کرتا تو وہ ایک دو گھنٹے میں ہی مر گیا ہوتا۔"

میں نے پوچھا "اچھا تم نے اسے پکڑا کیسے تھا؟"

وہ بولا "جمعے کا دن تھا جی' جمعے کے روز کام سے آدھے دن کی چھٹی ہوتی ہے۔ میں اپنے یار کے ساتھ غلیل لے کر شکار کے لئے نکل گیا۔ ہم بڑی چڑی اور گگی نشانے لے رہے تھے کہ پچھلی طرف سے شاں شاں کی آواز آئی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا باز اور ایک موٹا تلور بڑی تیزی سے ہمارے سروں پر سے گزر گئے۔ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا' باز ایک کیکر کی اونچی ٹہنی سے ٹکرایا اور بازی کھا کر نیچے ایک جھاڑی میں گرا۔ میں بھاگ کر وہاں پہنچا۔ باز کانٹوں میں پھنسا پھڑپھڑا رہا تھا۔ میں نے جھٹ اپنا کرتا اتار کر اس پر پھینکا اور پکڑ لیا۔ میرا سارا کرتا

اس نے اور بچے ہاتھ کا انگوٹھا بھی زخمی کر دیا...... یہ دیکھیں" اس نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا دکھایا اس پر دو تین ماہ پرانا ایک گہرا زخم تھا۔ غالباً پرندے کی چونچ کا تھا۔ "...... لیکن میں نے بھی نہیں چھوڑا جی اسے' اس کے سر پر اپنی ایک جراب چڑھا دی اور حکیم صادق کے پاس لے گیا......"

لڑکے نے تفصیل سے بتایا کہ اس نے کس طرح زخمی باز کا علاج کیا اور اسے کھلا پلا کر تندرست کر دیا...... وہ ایک ہوشیار لڑکا تھا۔ کم عمر ہونے کے باجود میرے سامنے بڑی صفائی سے اپنا کیس پیش کر رہا تھا۔ اب وہ مجھ پر کچھ اعتماد بھی کرنے لگا تھا۔ لہٰذا میرے پوچھے بغیر ہی باقی واقعات بھی بتاتا چلا گیا۔ اس نے کہا "ہمارے گاؤں کا ایک آدمی بندے شاہ مجھے اس باز کا پانچ سو روپیہ دیتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں اسے شکاریوں کے ہاتھ بیچ دوں گا۔ ہمارے ہمسائے اصغر لوہار کو پتہ چلا تو اس نے کہا "میں تمہیں پندرہ سو روپیہ دوں گا باز مجھے دے دو" بندے شاہ کو پتہ چلا تو وہ بھی پندرہ سو روپیہ دینے لگا۔ ان دونوں میں ضد چل گئی۔ دونوں باز خریدنا چاہتے تھے۔ دونوں ہی نقد پیسے دے رہے تھے۔ میری ماں نے کہا بیٹا ہمسائے کا حق زیادہ ہوتا ہے تم اصغر کی بات مان لو' ویسے بھی وہ مجھے بہن کہتا ہے۔ میں نے یہ بات مان لی۔ میرے ارادے کا پتہ بندے شاہ کو چلا تو اس نے ایک شام مجھے اپنے کھیتوں میں بلایا۔ وہ ڈیرے پر اکیلا بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا "پترا! میں تیرے باپ کے ساتھ کھیلا ہوں۔ تیرے لئے میرے دل میں درد ہے۔ میں تجھے ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ پکھیرو جو تو نے پکڑا ہے اصغر کو مت دینا" میں نے پوچھا "کیوں نہ دوں" وہ بولا "پترا اس پکھیرو کی قیمت وہ نہیں جو تیری ماں سمجھ رہی ہے یا تو سمجھ رہا ہے...... یہ بڑا مہنگا پکھیرو ہے کم از کم ستر اسی ہزار روپے کا" بندے شاہ کی باتیں سن کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے کہا میں یہ پکھیرو شہر لے جاؤں اور کسی اچھے شکاری کو دکھاؤں اور سوچ سمجھ کر بیچوں۔"

بندے شاہ کی باتیں میرے دل کو لگیں۔ میں نے چاچے اصغر کو پکھیرو دینے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ ہم سے لڑنے لگا کہ ہم زبان دے کر مکر رہے ہیں۔ چاچے اصغر نے میری ماں کے سامنے تین ہزار روپیہ نقد رکھ دیا اور کہا کہ بیٹے سے کہو کہ پکھیرو مجھے دے دے۔ پر میں نے نہ بیچنے کا پکا پکا فیصلہ کر لیا تھا۔ چاچا اصغر دھمکیوں پر اتر آیا۔ کہنے لگا میں

پکھیرو چھین لوں گا اور پیسہ بھی ایک نہیں دوں گا۔ میں شکار لے کر چودھری کے پاس چلا گیا۔ ہمارے چودھری صاحب بڑے بھلے مانس آدمی ہیں۔ مسجد میں امامت بھی خود ہی کراتے ہیں۔ دو تین حج کر رکھے ہیں۔ اللہ ان کا بھلا کرے انہوں نے چاچے اصغر کو بلا کر ڈانٹا ڈپٹا اور کہا کہ خبردار جو لڑکے سے زبردستی پکھیرو لینے کی کوشش کی۔ اس وقت یہ اس کا مال ہے۔ وہ جو جی چاہے اس کا کرے۔ بیچے یا رکھے۔ چاچا اصغر چپ چاپ گھر آ گیا۔ اس نے ہم سے تو کوئی بات نہیں کی لیکن دل میں کھوٹ تھا۔ وہ اس کوشش میں لگا رہا کہ باز میرے ہاتھ سے نکل جائے.......... پرسوں کی بات ہے' رات گئے کسی نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے باہر آ کر دیکھا تو وہ بندے شاہ تھا۔ وہ مجھے ایک طرف اندھیرے میں لے گیا اور بولا اصغر نے بڑا غلط کام کیا ہے۔ اس نے کچھ غلط قسم کے لوگوں کو میرے باز کے بارے میں بتا دیا ہے۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا "سندری کے بیلے میں کچھ شہری لڑکوں نے باز پکڑنے کے لئے ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ اصغر نے ان سے رشوت لے کر تمہارے پیچھے لگا دیا ہے۔ وہ بڑے زور والے لوگ ہیں اب تمہاری خیر نہیں یا تو وہ پکھیرو کہیں چھپا دو یا یہاں سے نکل جاؤ۔"

میں نے کہا "میں چودھری صاحب کو جا کر بتاؤں گا۔"

بندے شاہ بولا "وہ بڑے بڑے افسروں کے بیٹے ہیں۔ تمہارے چودھری صاحب کا زور ان کے سامنے نہیں چلے گا۔ ایسا کرو پکھیرو مجھے دے دو۔ میں اسے لے کر کہیں نکل جاؤں گا۔ بعد میں جب معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو واپس کر دوں گا۔ میرا وعدہ ہے کہ تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔"

مجھے بندے شاہ کی باتوں پر پورا یقین نہیں آیا۔ میں نے کہا اچھا سوچ کر بتاؤں گا۔ گھر آ کر ماں سے مشورہ کیا۔ اسے بھی بندے شاہ پر بھروسہ نہیں تھا۔ پھر اگلے ہی دن مجھے پتہ چل گیا کہ بندے شاہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کچھ شہری آدمی چودھری صاحب سے ملنے آئے۔ میں کھیت میں کام کر کے شام کو گھر آیا تو ماں نے بتایا کہ دوپہر سے کچھ شہری بابو چودھری کی حویلی میں آئے ہوئے ہیں اور چودھری صاحب نے مجھے بلایا ہے۔ میں ڈرتا ڈرتا حویلی میں پہنچا۔ وہاں چودھری صاحب کے ساتھ دو بابو لوگ موجود تھے۔ ان میں ایک کی آنکھیں بڑی بڑی اور لال سرخ تھیں۔ اس کے گلے میں سونے کا لاکٹ تھا۔

ہاتھوں میں بھی مندریاں تھیں۔ مجھے وہ اچھا آدمی نہیں لگا۔ چودھری صاحب نے مجھے کہا کہ یہ صاحب لوگ تمہارا باز دیکھنا چاہتے ہیں۔ ذرا گھر سے لے آؤ۔ میں انکار کیسے کر سکتا تھا.......... انہوں نے اپنا ایک بندہ بھی میرے ساتھ بھیج دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہی بابو لوگ ہیں جن کے بارے میں بندے شاہ نے بتایا تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ باز لے کر کسی صورت حویلی نہیں جاؤں گا۔ میں گھر گیا۔ وہاں سے باز کو کپڑے میں لپیٹا اور پچھلی دیوار پھلانگ کر گاؤں سے نکل گیا۔ ساری رات ساتھ والے گاؤں میں ماسٹر خدا بخش کے گھر گزاری۔ ماسٹر جی کا لڑکا میرا پکا بیلی ہے۔ کل دوپہر کے وقت میں نے اس کی سائیکل لی اور اپنے ماموں کی طرف چل دیا۔ ماموں کا گاؤں ڈیک نالے کی دوسری طرف ہے۔ فاصلہ لمبا تھا۔ میں تیز تیز پیڈل چلاتا جا رہا تھا کہ درختوں سے نکل کر کچھ گھڑسوار میرے پیچھے لگ گئے۔ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں نے سائیکل اور تیز کر دی۔ ایک جگہ میں گر گیا۔ میں نے سائیکل وہیں چھوڑی اور کماد کے اونچے کھیتوں میں سے ہوتا ہوا آبادی کی طرف نکل گیا۔"

یہاں تک بتا کر لڑکا ایک دم ٹھٹھک گیا۔ مجھے صاف طور پر محسوس ہوا کہ وہ اب جھوٹ بولے گا یا بات گول کر جائے گا۔ ایک بار تھوک نگل کر اس نے کہا "مجھے پتہ تھا کہ لوگ مجھے پکڑ لیں گے اور باز چھین لیں گے..... میں نے باز ایک جگہ.......... چھپا دیا اور خالی ہاتھ ہی آگے بھاگنے لگا۔ اس کے بعد مجھے ایک چھپڑ میں چھال مارنی پڑی۔ آخر میں کسی نہ کسی طرح اس کوٹھی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔"

اپنی طویل روئیداد ختم کرنے کے بعد لڑکا خاموش ہو گیا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی تھیں اور میرا اندازہ کہہ رہا تھا کہ اس کی نوے فیصد باتیں سچی ہیں۔ تاہم اس روئیداد کی اہم ترین بات وہ بڑی صفائی سے چھپا گیا تھا یعنی وہ باز اس وقت کہاں ہے' اس بارے میں اس کی زبان بند تھی۔

میں گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ یہ سارا معاملہ عجیب و غریب تھا۔ کئی گروہ اس باز کے پیچھے تھے۔ غالباً یہ ایک مہنگا اور نایاب باز تھا۔ میری معلومات بازوں اور ان کے ذریعے شکار کے بارے میں زیادہ نہیں تھیں تاہم اتنا میں نے پڑھا ہوا تھا کہ فالکن یعنی شاہین اور اسی جنس باز کی بعض اقسام نہایت قیمتی ہوتی ہیں اور انہیں شکار کے لئے سدھایا جاتا

ہے۔ ایک دفعہ بڑی حویلی میں واصف کا ایک دوست باز کی نسل کا ایک بڑا پرندہ لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اسے گوزہاکس کہا جاتا ہے اور یہ گوزہاکس ایک دن میں سولہ خرگوش شکار کرنے کا ریکارڈ قائم کر چکا ہے.......... مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ بازوں اور شاہینوں کو پکڑنے والے مطلوبہ پرندے کی تلاش میں سینکڑوں میل کا سفر طے کرتے ہیں اور جب ان کو کسی مقام پر پرندے کی موجودگی کا یقین ہو جاتا ہے تو وہاں پکے ڈیرے ڈال لیتے ہیں.......... میرا خیال تھا کہ یہ باز بھی اسی طرح شکاریوں کی نظر میں آیا ہوا ہے اور وہ اس کی تلاش میں دیوانے ہو رہے ہیں۔

اب رات کے قریباً ساڑھے دس بج چکے تھے۔ خان رحیمی اور اس کے ساتھیوں کا ابھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ میرے کمرے سے باہر تھوڑی ہی دور ایک نلکا تھا۔ میں وہاں سے پانی لے کر آئی اور لڑکے کے زخم کو دھو کر رخسار پر سے خون صاف کیا۔ اس کے کپڑے سخت غلیظ تھے اور ان کی بو کی وجہ سے، کمرے میں آنے والا کوئی بھی شخص شوقیہ کی طرح شک میں پڑ سکتا تھا۔ میں نے لڑکے کو اپنی ایک شلوار اور بستر کی چادر دی اور اس سے کہا کہ وہ کپڑے اتار دے۔ خود میں کچن کی طرف چلی گئی۔ وہاں ڈائننگ ٹیبل سے اٹھائے ہوئے برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے ایک ڈونگے سے تلی ہوئی مچھلی کے چند بڑے بڑے ٹکڑے لے کر دو روٹیوں پر رکھے اور کمرے میں لے آئی۔ لڑکا اس وقت تک میری ہدایت کے مطابق لباس بدل چکا تھا اور شرمایا شرمایا سا گدیلا اوڑھے بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کھانا دیا اور اس کے کپڑے لے کر باہر آگئی۔ کوٹھی کے اس عقبی حصے میں تاریکی تھی۔ دور ٹین کے چھجے تلے بیٹھے ہوئے آدمی اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ میں نلکے پر کیا کر رہی ہوں۔ یہ اس کوٹھی میں میرا پہلا دن تھا۔ یہاں کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ پھر بھی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس وقت اتنی سردی میں نلکے کی طرف کوئی نہیں آئے گا۔ میں نے نلکا کھول کر کپڑے نیچے رکھ دیئے اور صابن کے بغیر ہی جلدی جلدی انہیں کھنگال ڈالا۔ کچھ اور نہیں تو گند وغیرہ تو اتر ہی گیا تھا۔ کپڑے نچوڑ کر میں اندر لے گئی اور انگیٹھی میں آگ جلا کر انہیں سوکھنے کے لئے ایک کرسی پر پھیلا دیا۔

میرے برتاؤ سے لڑکا کافی متاثر نظر آتا تھا اور اس کی آنکھوں میں اجنبیت کی جگہ اپنائیت نظر آنے لگی تھی۔ ہم دونوں دھیمے لہجے میں بات چیت کرنے لگے۔ مجھے یہ جان کر

حیرت ہوئی کہ لڑکے کا اصل نام حنیف نہیں یوسف ہے۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس نے غلط بتایا تھا۔ اب اس نے مجھے اپنے باپ کا نام اور گاؤں کا اصل نام بھی بتایا۔ وہ بولا "باجی! آپ بڑی اچھی ہیں کیا کسی طرح مجھے یہاں سے نکال نہیں سکتیں؟"

میں نے ڈانٹ کر کہا "بے وقوف مت بنو' چاروں طرف تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ ایک فرلانگ بھی نہیں چلو گے کہ پکڑے جاؤ گے۔ اس وقت یہ جگہ تمہارے لئے محفوظ ترین ہے" وہ خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "یوسف! اگر کوئی تم سے وہ باز خریدنا چاہے تو کتنے کا بیچو گے؟"

میرے لہجے کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا "باجی! مجھے پکا پتہ ہے وہ اسی ہزار روپے سے کم کا نہیں ہے۔ میں کوئی بچہ نہیں ہوں مجھے سب پتہ ہے۔ یہ شکاری لوگ ایسے بازوں کے لئے بڑی بڑی رقمیں دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم یہ باتیں چھوڑو مجھے یہ بتاؤ کہ اگر کوئی تمہیں گھر بیٹھے بٹھائے نقد پیسے دے تو تم کتنے میں بیچو گے؟"

اس کے چہرے پر بڑوں بوڑھوں والی سنجیدگی پیدا ہو گئی۔ شاید باپ کی موت نے اسے کم عمری میں ہی دانا کر دیا تھا۔ وہ ماں کا اکیلا بیٹا تھا اور سارا دن پرائے کھیت میں پسینہ بہاتا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"باجی! میں اسے کم از کم پچاس ہزار روپے میں بیچوں گا اور.......... اور پینتالیس سے کم تو ایک پیسہ نہیں لوں گا' بندے شاہ کا خیال ہے کہ یہ اس کی کم سے کم قیمت ہے۔"

میں نے کہا "کیا کرے گا تو اتنی بڑی رقم کا؟"

اس کی شفاف آنکھوں میں ایک معصوم سی چمک ابھر آئی۔ اس گھڑی وہ مجھے بڑا [illegible] لگا۔ کہنے لگا "باجی! آج سے دس بارہ سال پہلے میرے ابے کے پاس کافی بڑی کھیتی تھی۔ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ پھر میرے ابے کا ساتھ کی کھیتی والے سے جھگڑا ہوگیا۔ وٹ کا جھگڑا تھا۔ معمولی بات تھی ایک دو گز زمین کی.......... لیکن بڑھتے بڑھتے بات بڑھ گئی۔ لڑائی ہوئی اور میرے ابے کے ہاتھوں ایک بندہ مر گیا۔ ابا جیل چلا گیا اور بیمار ہو کر فوت ہوگیا۔ ہمارا سب کچھ مقدمے بازی پر لگ گیا وہ کھیتی بھی لگ گئی جس

پر فساد ہوا تھا۔ میری ماں نے وہ زمین چودھری کے پاس گروی رکھ کر پیسے لے لئے تھے
میں جب بھی اس کھیتی کے پاس سے گزرا کرتا ہوں میرا دل روتا ہے۔ میرا دل چاہتا
کہ میرے پاس کہیں سے بہت سی رقم آجائے اور میں وہ زمین چھڑا لوں۔ میری ماں
ہر وقت یہی دعائیں مانگا کرتی تھی......... اب رب نے مجھے ایک موقعہ دیا ہے تو میں
کھیتی ضرور چھڑاؤں گا۔ چودھری صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ کچھ دن پہلے میں نے
سے بات کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ دس بارہ سال گزر چکے ہیں پھر بھی وہ صرف اصل ز
لے کر کھیت مجھے دے دیں گے۔"

میں نے پوچھا "کتنے پیسے مانگے ہیں انہوں نے؟"

"پینتیس ہزار روپے" اس نے جواب دیا۔

"ہوں......... پینتیس ہزار......... باقی دس ہزار کا کیا کرو گے؟"

ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر رنگ سے بکھر گئے۔ کسی دل پسند خیال
لہریں اس کے دماغ سے ٹکرائیں اور آنکھوں میں کوئی خواب کوندے کی طرح لپک گیا۔

"کیا شادی وادی کا ارادہ ہے؟"

"نہیں جی" وہ سنبھل کر بولا "دیکھیں گے پھر کیا کرنا ہے۔"

اس کی مسیں بھیگ چکی تھی۔ عمر سولہ اور سترہ کے درمیان تھی۔ یہ دور خوا
دیکھنے کا ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔

"یہ نہیں بتاؤ گے اس وقت باز کہاں ہے؟"

"نہیں جی" اس نے نگاہیں جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ "آپ سے پردہ
لیکن......... میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ کچھ نہیں بتاؤں گا جان بھی چلی جائے تو
بتاؤں گا' آپ ناراض نہ ہونا باجی۔"

وہ میری توقع سے زیادہ ہوشیار اور محتاط ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر میں
رحیمی کے بندوں کو بتا دوں اور وہ تمہیں پکڑ لیں تو پھر؟"

"پھر بھی کچھ نہیں ہو گا جی میری گردن ہی اتار دیں گے نا' پر میں بولوں گا
نہیں۔"

وہ بڑی بہادری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس بیچارے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ جن لوگوں

سے لڑائی لے رہا ہے وہ اس کی زبان کھلوانے کے لئے کہاں تک جا سکتے ہیں۔ جسمانی
اذیت' قوت برداشت اور حد اختیار کے مسائل اس کی سمجھ میں آنے والے نہیں تھے۔
میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ اگر وہ تلاش کرنے والوں کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اسے شیشے کے پتلے
کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے۔ وہ اپنے گرم خون کی وجہ سے اس مسئلے کی سنگینی کو
بھی طرح نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کچھ دیر مزید بات چیت کی اور پھر ایک
آخری فیصلے پر پہنچ گئی۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے۔ شام کے وقت میں نے اپنے کمرے کو باہر سے تالا لگایا
اور کچن میں آ گئی۔ حسب معمول مجھے اس وقت خان رحیمی کو قہوہ بنا کر پیش کرنا تھا۔ خان
رحیمی نے ابھی تک کوئی خاص کام مجھے تفویض نہیں کیا تھا۔ گھر میں جہاں بھی میری
ضرورت پڑتی لگا دیا جاتا تھا۔ اس کوٹھی میں زیادہ تر ملازمین عورتیں تھیں۔ وہ سب کی
سب جوان اور خوبصورت تھیں۔ خان رحیمی ایک میز پر جھکا کانپتے ہاتھوں سے کچھ لکھنے
میں مصروف تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجانی پڑی۔
یہ خان رحیمی کے روبرو آنے کی لازمی شرط تھی۔ ٹرالی کی مدھم آہٹ سن کر اس نے اپنا
سفید سر گھمایا۔

"اوہ ونڈر فل" اس نے عینک کے پیچھے سے قہوے کے برتنوں کو اور مجھے ایک
ساتھ جھانکا۔ "دروازہ بند کر دو اور تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھو" اس نے کہا۔ میں نے
ہدایت پر عمل کیا' قہوہ انڈیل کر اسے دیا۔ اس کی نگاہیں میرے بالوں پر جمی ہوئی تھیں۔
کہنے لگا "میرے پاس آؤ" میں قریب آئی۔ بولا اپنا سر ذرا جھکاؤ' میں نے سر جھکایا۔ اس
نے کانپتے ہاتھوں سے میرے بالوں کا کلپ کھولا اور اسے پاؤں تلے توڑ کر بولا۔

"آئی ہیٹ دیز کلپس' آئندہ تمہارے بالوں میں کلپ نہیں ہونا چاہئے انڈر
سٹینڈ؟" میں نے اس کے خبطی پن پر اقرار میں سر ہلایا۔ چند لمحے بعد اس کا موڈ بحال
ہو گیا۔ اس نے حسب معمول مجھے ریڈرز ڈائجسٹ سے پڑھے ہوئے دو تازہ لطیفے سنائے۔
ان میں سے ایک لطیفے پر وہ خود بھی اتنا ہنسا کہ قہوے کی پچکاری اس کے منہ سے نکل گئی۔
پچکاری نکلنے کے بعد وہ کچھ خجل اور سنجیدہ ہو گیا......... اس کے تمام مہمان آج ایک ایک
کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے وہ ناکام ہی گئے ہوں گے کیونکہ ان کا "مطلوب" تو

ابھی تک میرے کمرے میں تھا......... میں نے ان سنگین حالات میں یوسف کو باہر نکالنے کا
خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ خان رحیمی قہوہ پی چکا تو میں اصل موضوع کی طرف آگئی۔ میں نے
کہا۔

"خان جی! مجھے یہاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے اور میں سمجھتی ہوں کہ
مجھے یہاں کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں مگر جو بات میں آپ سے کرنا چاہتی
ہوں اس میں سراسر آپ ہی کا فائدہ ہے۔"

"کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟" خان رحیمی نے پوچھا۔

میں نے کہا "خان جی! دراصل بات کرنے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال
پوچھنا چاہتی ہوں۔ کل جب میں مہمانوں کے سامنے کھانا چن رہی تھی' آپ کی گفتگو کا
تھوڑا سا حصہ میرے کانوں میں پڑا تھا' جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ کسی باز وغیرہ کی
تلاش میں ہیں' کیا آپ بتائیں گے کہ اس باز میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

خان رحیمی نے ٹٹولنے والی نظروں سے میری آنکھوں میں جھانکا پھر بولا "کوئی خاص
بات نہیں بس وہ ایک کم یاب باز ہے' کافی قیمت رکھتا ہے۔"

میں نے کہا "خان جی چھوٹے منہ سے بڑی بات کر رہی ہوں معافی چاہتی ہوں کیا
آپ بتائیں گے کہ اس باز کا آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

خان رحیمی نے تمباکو کی پوٹلی نکال کر پائپ بھرنا شروع کیا اور بولا "آخر تم کہنا کیا
چاہتی ہو؟"

میں نے اعتماد سے کہا "خان جی! میں اس باز کی تلاش میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں
اور مجھ پر بھروسہ کر کے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی فی الحال
آپ میرے دو سوالوں کا جواب عنایت کر دیں تو مجھے بات کرنے میں آسانی رہے گی۔"

خان رحیمی کی جہاندیدہ آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ اس نے پائپ کی راکھ
ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا "ہاں پوچھو کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

میں نے اپنا سوال دہرایا "آپ کو اس باز کے بارے میں پتہ کیسے چلا؟"

خان رحیمی نے کہا "یہ کوئی تین مہینے پرانی بات ہے۔ کوٹ سلطان کے ایک
زمیندار نے چند عربی شیوخ کو تھل میں شکار کی دعوت دی۔ ان میں ایک شہزادے ابن

عابد کے پاس یہ باز تھا' دوران شکار اس باز نے بے حد ہنرمندی اور مہارت کا
مظاہرہ کیا مگر ایک روز اچانک گم ہوگیا اور کوشش کے باوجود نہیں ملا۔ باز کو گمشدگی سے
بچانے کے لئے بعض عرب شہزادے اپنے پرندوں کے پاؤں میں خاص قسم کے چھلے پہنا
دیتے ہیں یا ان کے جسموں میں بذریعہ آپریشن مختصر پرزہ رکھ دیتے ہیں۔ ایسے پرزوں سے
نکلنے والے سگنل دوران شکار شکاریوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور انہیں پتہ چلتا رہتا
ہے کہ ان کا شکاری پرندہ کس مقام پر ہے۔ اس باز کے پاؤں میں بھی سگنل نشر کرنے والا
ایک چھلا تھا۔ عربی شہزادے نے اپنی جیپ پر بھٹکے ہوئے باز کا تعاقب کیا اور ہمارے
علاقے میں آپہنچا۔ یہاں آکر اسے سگنل ملنے بند ہوگئے۔ معلوم نہیں وہ چھلا کہیں گر گیا یا
خراب ہوگیا۔ علاقے کے طول و عرض میں کئی روز تک باز کو تلاش کیا گیا مگر ناکامی ہوئی۔
شہزادہ اور اس کے میزبان تھک ہار کر واپس چلے گئے۔ یہ خبر چونکہ شکاری حلقوں میں
پھیل گئی تھی اس لئے شہزادے کی روانگی کے بعد کئی پارٹیاں اس گمشدہ باز کو ڈھونڈنے
میں مصروف ہوگئیں......... اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔"

خان رحیمی نے خاصی تفصیل بتا دی تھی۔ اب بہت سی باتیں میرے ذہن میں
واضح ہوگئیں۔ میں نے پوچھا "خان جی! آپ کے خیال میں اس باز کی قیمت کیا ہوگی؟"
خان رحیمی نے اوپر تلے کئی کش لئے اور بولا "صحیح اندازہ تو نہیں مگر کافی مہنگا باز

میں نے کہا "تقریباً سات آٹھ لاکھ کا تو ہوگا؟"

"ہوں......... تقریباً" خان رحیمی نے مختصر جواب دیا۔

اس کا جواب میری توقع کے مطابق تھا۔ خان رحیمی اور اس کے ساتھیوں کی بھاگ
دوڑ سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ باز کی کم از کم قیمت اتنی ہوگی۔ میں نے احتیاط سے
الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے کہا "خان جی! یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ میں اس باز کے
بارے میں کسی حد تک جانتی ہوں۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ آپ سے کچھ بھی چھپاؤں لیکن
آپ یوں سمجھ لیں کہ آپ ہی کے مفاد کی خاطر میں نے کسی سے وعدہ کر رکھا ہے
مجبور ہوں گی' کیا آپ میری اس وقتی خاموشی کو درگزر کریں گے؟"

خان رحیمی کی معاملہ فہم نگاہیں میرے اندر تک دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ

خوشدلی سے بولا "اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہارا خاموش رہنا ضروری ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے بھی خاموش رہنا ہر شخص کا حق ہے۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ آپ کو مجھ پر 45 ہزار روپے کا بھروسہ بھی کرنا ہوگا۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

میرا مطلب ہے، آپ کو اس باز کے لئے 45 ہزار روپیہ خرچ کرنا ہوگا۔ یہ رقم مجھے دینا ہوگی اور بغیر کسی ثبوت رسید کے۔"

"یہ......... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اتنی بڑی رقم......... میرا مطلب ہے.........

یکایک وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں جھانکتا رہا، پھر

"اوکے......... ٹھیک ہے......... میں تمہیں رقم دے دوں گا، پتہ نہیں کیوں تم پر اعتبار کرنے کو دل چاہ رہا ہے......... لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیسے لاؤ گی وہ باز؟ کہیں یہ بھی کوئی "جوک" وغیرہ تو نہیں؟"

میں نے مسکرا کر کہا "خان جی! بس اب کوئی اور سوال نہ کریں آپ نے مجھ پر اعتماد کرکے جو ذمے داری مجھ پر ڈالی ہے اب وہ مجھے نبھا لینے دیں اس کے بعد میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔"

"کب رقم چاہیے تمہیں؟"

"بے شک ابھی دے دیں۔" میں آپ سے صرف دو روز کی مہلت چاہوں گی۔

خان رحیمی ڈگمگاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور دوسرے کمرے تک گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں پانچ سو روپے کے نوٹوں کی ایک کھلی گڈی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔

رات کے گیارہ بج چکے تھے اب کسی کا کمرے میں آنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھیرو حسب معمول الماری کے عقبی خلا سے نکل کر مسہری پر بیٹھ چکا تھا۔ کھانا ختم کرکے اس نے ایک طویل ڈکار لی اور پھر خود ہی اس ڈکار پر شرمندہ سا ہوگیا۔ میں نے انگیٹھی میں کوئلے ناپتے ہوئے کہا "یوسف! باز کے کتنے پیسے مانگے تھے تم نے؟"

"کیا مطلب باجی؟"

"مطلب یہ کہ کتنے میں بیچنا ہے تم نے باز؟"

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا باجی! کم از کم پینتالیس میں۔"

میں نے گرم چادر کے اندر سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی "یہ لو پورے پینتالیس ہزار ہیں۔"

وہ پھٹی نگاہوں سے نوٹوں کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ شاید اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ اس پرندے کے عوض اتنی بڑی رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ نوٹ الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جیسے ان کے اصلی ہونے کا یقین کر رہا ہو۔ یکایک وہ سہم گیا اور نوٹ جلدی سے چارپائی پر رکھ دیئے۔ "نہیں باجی! میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ خان رحیمی آپ کے ذریعے مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ لوگ مجھ سے پکھیرو چھین چکے ہیں۔ میں نے ان کو کچھ نہیں بیچنا۔ میں آپ کو صاف بتا رہا ہوں۔ میں نے ان کو نہیں بیچنا۔"

میں نے مسکرا کر کہا "لیکن خان کا اس معاملے سے کیا تعلق، باز تو میں خرید رہی ہوں اپنے ذاتی پیسوں سے۔"

وہ بولا "کیوں مذاق کرتی ہو باجی! تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی؟"

"تو کیا تم مجھے اتنا گیا گزرا سمجھ رہے ہو، تین سال سے میری تنخواہ خان جی کے پاس جمع ہو رہی ہے۔ میں اس طرح کا ایک باز اور خرید سکتی ہوں۔"

"باجی! مجھے سمجھ نہیں آ رہی آپ کیا کریں گی اس باز کا......... یہ تو مردوں کے کام ہیں۔"

"میں کسی مرد ہی کو بیچوں گی، میرا ایک تایا بہت بڑا شکاری ہے۔ وہی کسی سے سودا کرے گا۔ میں نے کل اسے لاہور خط بھی لکھا ہے۔"

وہ کچھ دیر ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "باجی! پکھیرو اگر واقعی آپ خرید رہی ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ میں آپ کو پینتیس ہی میں دے دوں گا۔ آپ روپے مجھے دے دیں اور اپنا کوئی بھروسے کا بندہ ساتھ بھیج دیں۔ میں اسے پکھیرو دے دوں گا۔ لیکن نہیں......... آپ خود ہی چلیں تو بہتر ہے بلکہ......... آپ ہی کو جانا پڑے گا۔"

اس کی احتیاط پسندی مجھے مسکرانے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ کوئی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا "لیکن میں اکیلی عورت آٹھ نو میل سے واپس کیسے آؤں گی؟"

"میں آپ کے ساتھ اپنے یار خوشئے کو بھیج دوں گا۔ وہ آپ کو خان کی حو
چھوڑ جائے گا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' میں ہی ساتھ چلی جاؤں گی لیکن رقم تمہیں وہیں مو
پہنچ کر ملے گی' ایک ہاتھ دو........ ایک ہاتھ لو۔"

"ٹھیک ہے باجی" میری سکیم کامیاب رہی تھی۔ خان رحیمی کو بیچ میں نہ لا
نے درست فیصلہ کیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ خان رحیمی کے سامنے آنے سے یوسف
جاتا اور عین ممکن تھا کہ باز کی موجودگی ہی سے انکار کر دیتا۔ دوسری صورت یہ بھی
تھی کہ خان رحیمی ہی اپنے وعدے پر قائم نہ رہتا اور باز حاصل کرنے کے بعد رق
سے انکار کر دیتا یا دی ہوئی رقم واپس لے لیتا۔ اس سودے میں خان رحیمی اور
دونوں کو بے حد فائدہ تھا مگر بے اعتباری کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے معاملہ
کرسکتے تھے۔ اگر یہ معاملہ طے پا جاتا تو میرا بھی ایک اہم مقصد پورا ہو جاتا۔

میں خان رحیمی کا اعتماد حاصل کرنا چاہتی تھی اور اعتماد حاصل کرنے کا اس سے
اور مختصر راستہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں جلد سے جلد اس "تعلق" کے بارے جاننا چا
جو خان رحیمی اور چنگیزی گھرانے کے درمیان تھا اور جس کا "علم" میرے فر
قاتلوں کو میری زد میں لا سکتا تھا۔ خان رحیمی کے اس ڈیرے پر میں مسکراتی تھی'
بھی کرتی تھی' چلتی پھرتی بھی تھی مگر میں زندہ نہیں تھی۔ زندگی تو کسی ننھے جسم کے
ہی قبر کی تاریکی میں اتر چکی تھی۔

خان رحیمی کا اعتماد حاصل کرنے کے علاوہ میرا دوسرا مقصد یہ تھا کہ یوسف
کا حق مل جائے۔ اس باز کے سامنے چالیس پینتالیس ہزار کی رقم کوئی معنی نہیں
تھی۔ یہ تو معمولی انعام تھا۔ وہ پرندہ کسی شناور کے ہاتھ میں بھی آ سکتا تھا اور
گھاگ شخص ہوتا تو لاکھوں کما سکتا تھا۔ یوسف حالانکہ پینتیس ہزار پر راضی ہو
میرا ارادہ تھا کہ اسے پوری رقم یعنی پینتالیس ہزار ہی دوں گی۔ کل اس
فرمانبرداری اور سادگی کے ساتھ مجھے اپنے عشق کی کہانی بھی سنا ڈالی تھی۔ بچپن
اس کی منگنی اپنے ماموں کی لڑکی صغراں سے ہو چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے
پسند کرتے تھے مگر باپ کی موت کے بعد وہ زمین بک گئی جس کا یوسف کو وارث

ں کے حالات دن بدن خراب ہوتے گئے اور اس کے ساتھ ہی ماموں کے گھرانے سے
ن کا تعلق بھی کمزور پڑتا گیا۔ یوسف کی ممانی ایک بڑی زبردست عورت تھی۔ اس نے
شوہر کو پوری طرح دبا رکھا تھا۔ وہ کنگال یوسف کے ساتھ بیٹی بیاہنے کو ہرگز تیار نہیں
تھی۔ وہ صغراں کی بات اپنی بہن کے گھر چلا رہی تھی........ اور وہ دونوں جدائی کے مارے
دکھ جھیل رہے تھے۔ وہی صدیوں پرانی کہانی' جو معمولی کمی بیشی کے ساتھ ہمیشہ
رائی جاتی رہی ہے۔ اپنی ممانی کی موجودگی میں یوسف ماموں کے گھر پر بھی نہیں مار سکتا
یہی وجہ تھی کہ جب وہ باز لے کر ماموں کے گاؤں پہنچا تو اس نے گھر کی بجائے کھیتوں
رخ کیا تا کہ وہاں باز اپنے ماموں یا ماموں زاد بھائی کے سپرد کر سکے مگر اس سے پہلے ہی
دھری شہاب کے آدمی اس کے پیچھے پڑ گئے اور وہ باز کہیں چھپا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔
م باز چھپانے والی بات پر مجھے یقین نہیں تھا۔ میرا یہی خیال تھا کہ اس نے پنجرہ یا تھیلا
بھی ہو گا کسی کے سپرد کر دیا ہو گا........ اب اسی باز کی وجہ سے اس پر خوش قسمتی
دروازہ کھل رہا تھا۔ یوسف کو یقین تھا کہ اگر زمین اسے واپس مل گئی اور شادی کے
لئے اس کے پاس دس بارہ ہزار روپے نقد ہوئے تو ممانی کے تیور بدلتے دیر نہیں لگے گی
ہو سکتا ہے اگلی فصل کی کٹائی تک اس کی شادی بھی ہو جائے۔

رات پل پل گزرتی رہی۔ اپنے دامن میں آنے والے کل کے ہنگاموں کی
پرچھائیاں سمیٹے آگے بڑھتی رہی۔ میں اور یوسف جاگ رہے تھے۔ آخر جب کیکر' شیشم
کے درختوں کے اس پار کہیں دور مرغ نے پہلی اذان دی تو میں اپنی جگہ سے
کھڑی ہوئی۔ بہ آہستگی دروازہ کھول کر میں نے باہر جھانکا۔ ٹین کے چھجے تلے گہری
کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا آگ بجھ چکی ہے اور چھجے تلے
شخص گیٹ کے پاس چوکیدار کی کوٹھڑی میں گہری نیند سو رہا ہے۔ میں تین چار دنوں
کچھ دیکھ رہی تھی۔ رات کے آخری پہر چھجے والا شخص اپنی ڈیوٹی چھوڑتا تھا اور
کیدار کی کوٹھڑی میں جا کر سو رہتا تھا اور یہاں سے نکلنے کے لئے یہی وقت مناسب ترین
نے اندر جا کر اپنی گرم چادر اوڑھی۔ ایک پرانا کمبل یوسف کو دیا اور دونوں باہر
آ گئے۔ یوسف کو برآمدے میں ٹھہرا کر میں آگے آئی اور اچھی طرح گیٹ کا جائزہ لیا۔
توقع راستہ صاف تھا۔ میں نے بہ آہستگی گیٹ کا آہنی ارل کھول دیا۔ اس کے بعد

واپس جا کر یوسف کو ساتھ لیا اور باہر نکل آئی۔ وہ خوفزدہ تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر درختوں میں چلنے کے بعد ہم کھیتوں میں نکل آئے۔ ہوا بہت سرد تھی۔ ہڈیاں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔ یوسف نے ابھی تک مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ بس میں اس کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی دھوکہ نہیں دے گا۔ کچھ آگے جا کر مجھ سے پوچھنے لگا "باجی! خان رحیمی کا کوئی بندا ہمارے پیچھے تو نہیں لگ جائے گا؟"

میں جھلا گئی "تو کتنا شکی ہے یوسف' اتنے منہ اندھیرے کون ہمارے پیچھے آئے گا۔ اگر نہیں تو ادھر کہیں چھپ کے بیٹھ جا اور دیکھ لے کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔"

وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ لیکن ابھی ہم تھوڑا آگے ہی گئے تھے کہ مجھے ایک عجیب احساس ہونے لگا۔ جیسے ہم دونوں کے علاوہ بھی کوئی اس راستے پر ہو۔ ہمارے پیچھے پیچھے رہا ہو۔ شاید یہی چھٹی حس کہلاتی ہے۔ بغیر کسی وجہ اور سبب کے انسان کا چوکنا ہو جانا ایک ناقابل فہم عمل ہے۔ اچانک ہماری دائیں جانب کھیتوں میں مسلسل سرسراہٹ سنائی دینے لگی۔ جیسے کوئی ہمارے ساتھ چل رہا ہو۔

"شاید کتے ہیں" میں نے یوسف کی ڈھارس بندھانے کو کہا۔ ہم ایک پگڈنڈی پر تھے۔ ایک طرف کماد کے کھیت تھے اور دوسری طرف جوی کے۔ سرسراہٹ کماد کی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ اگر واقعی کوئی ہمارے پیچھے تھا تو اس کا ایک مطلب تھا۔ خان رحیمی نے مجھ پر بھروسہ کر کے بھی بھروسہ نہیں کیا۔ اس نے میرے پیچھے نگران چھوڑ رکھے تھے جو اب خاموشی سے ہمارا تعاقب کرنے لگے تھے۔ اچانک مجھے شدید خطرہ کا احساس ہونے لگا۔ ایک سے زائد افراد ہمارے قریب تر پہنچ رہے تھے۔ میں نے دس پندرہ گز پیچھے ایک سائے کو اچھل کر داہنی جانب کے کھیت میں گھستے دیکھا۔ میں نے یوسف کا ہاتھ پکڑا اور تیز بھاگنے لگی۔ اس تنگ پگڈنڈی سے نکل جانا ہمارے لئے ضروری تھا۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یوسف بلا تردد میرے ساتھ کھنچا چلا آ رہا تھا۔ شاید وہ بھی صورت حال کی نزاکت محسوس کر چکا تھا اور پھر اچانک ہمارے سروں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ کماد کے کھیت سے نکل کر تین سائے ہم پر جھپٹے۔ ایک شخص نے بندوق کا کندا گھما کر یوسف کی کمر پر مارا' دھم کی آواز آئی اور وہ چیخ کر داہنی جانب لڑھک گیا۔

تب سے مجھے آہنی بازوؤں میں دبوچ لیا اور گنے کے کھیت کی طرف کھینچنے لگا۔ میں نے دیکھا دو افراد یوسف پر پل پڑے ہیں اور اسے گھونسے مارتے ہوئے کھیت میں لا رہے ہیں۔ میں نے حلق کی پوری قوت سے چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی ایک مضبوط ہاتھ میرے منہ پر آ کر جم گیا۔ میری آواز حلق ہی میں دم توڑ کر رہ گئی۔ ایک ریوالور کی سرد نال میری گردن سے آ لگی اور اس نال سے بھی سرد لہجے میں کسی نے کہا۔

"خبردار' شور مچائے گی تو قتل کر دوں گا۔"

بولنے والے کا لہجہ دیہاتی نہیں تھا' مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی پڑھا لکھا شخص ہے اور پتلون جرسی میں ملبوس ہے۔ یوسف کو جکڑنے والے اسے غلیظ گالیاں دے رہے تھے اور دھمکا رہے تھے کہ اس نے شور مچایا تو جان سے مار دیں گے۔ اگر آپ خود ستائش نہ سمجھیں تو کہوں گی کہ میں نے ایک عقلمندی کی تھی' جونہی خطرے کا احساس شدید ہوا میں نے وہ چھوٹا پرس جوی کے کھیت میں پھینک دیا تھا جس میں پینتالیس ہزار روپے کے نوٹ تھے۔ لہٰذا تلاشی میں میرے پاس سے کچھ بھی نہیں نکلا تھا۔ اسی اثناء میں انہوں نے میرے ہاتھ موڑ کر ایک مفلر کے ساتھ کمر پر باندھ دیئے لیکن پھر یہ فوراً کھول دیئے۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلحے کی موجودگی میں' میں مہم جوئی کی حماقت نہیں کروں گی۔ ہاں یوسف کو انہوں نے خوب اچھی طرح جکڑ دیا۔ وہ مزاحمت بھی خوب کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ کافی ڈرا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر اوپر مفلر باندھ دیا۔ ایک تنومند شخص نے یوسف کو اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ پتلون جرسی والے نے ریوالور میری آنکھوں کے سامنے لہرایا اور خوفناک لہجے میں دھمکی دی کہ اگر میں نے کوئی چالاکی دکھائی تو وہ بری طرح پیش آئے گا۔ ان سب کے چہرے تو نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ڈیل ڈول اور لہجوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ وہی "بابو لوگ" ہیں جن کے بارے میں یوسف نے بتایا تھا۔ چودھری کی حویلی میں وہ یوسف کا باز دیکھنے کے لئے بیٹھے رہے تھے اور وہ باز لے کر ساتھ والے گاؤں بھاگ گیا تھا۔

میرے اور یوسف کے ساتھ انہوں نے چھ سات کھیت کا فاصلہ پیدل طے کیا اور ایک جیپ تک آ پہنچے۔ یہ ایک شاندار ٹویوٹا جیپ تھی۔ ہمیں جیپ میں دھکیل کر وہ خود بیٹھ گئے۔ جیپ ائیرکنڈیشنڈ تھی۔ ہلکی آواز میں ڈیک بج رہا تھا۔ جیپ کی اندرونی

روشنی میں' میں نے پہلے بار ان کے چہرے دیکھے۔ وہ ایک سے بڑھ کر ایک افلاطون ...
آتے تھے۔ بے ہودہ تصویروں والی جیکٹیں' تنگ جینز' بڑھی ہوئی داڑھیاں' الجھے ہوئے
بال۔ وہ کل چار لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک جو دراز قد تھا اور عمر میں بھی زیادہ تھا گلے
میں ایک بڑا سا طلائی لاکٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ آنکھوں سے کافی خطرناک شخص لگتا تھا
ساتھی اسے چیف کہہ کر مخاطب کر رہے تھے اور وہ گاہے گاہے انہیں بے تکلفی سے
گالیاں دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں جیپ میں ڈال کر کہیں لے جائیں گے لیکن
جب جیپ چلنے کے آثار نظر نہیں آئے تو میں نے کھڑکیوں سے بغور اردگرد کا جائزہ لیا
رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ اس جھٹپٹے میں مجھے قریب
چند چھولداریاں نظر آئیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہی ان لوگوں کا پڑاؤ ہے۔ یہ لڑکے آپس میں
جو باتیں کر رہے تھے اس سے پتہ چلا کہ ان میں سے کوئی ایک خان رحیمی کے گھر
نگرانی کر رہا تھا۔ وہ اس کامیابی پر بہت خوش تھے اور ایک دوسرے کو مبارکباد اور شاباش
دے رہے تھے۔ لاکٹ والے لڑکے کی تمام تر توجہ یوسف کی طرف تھی۔ وہ یوسف کو
جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ پیتے پیتے اس نے ایک زوردار ٹھوکر یوسف
پسلیوں میں ماری۔ وہ بیچارہ پائیدان پر پڑا تھا۔ وہیں کسمسا کر رہ گیا۔ لاکٹ والے نے
پر انگلش اور اردو میں گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں نے چلا کر کہا "تم لوگوں کو شرم آنی چاہئے' کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا؟"
چیف نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ جیسے پہلی بار مجھے دیکھ رہا ہو۔ پھر فلمی انداز
میں میرے چہرے پر ریوالور کی نال گھما کر بولا "ابھی تمہاری باری بھی آ جاتی ہے۔
چھری تلے دم لو۔"

اس کا لہجہ خوفناک تھا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ اس کے اشارے پر ایک
نے یوسف کے منہ میں سے کپڑا نکال دیا۔ وہ پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخنے لگا
دہائی دینے لگا کہ اسے باز کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ راستے میں اس کے ہاتھ سے نکل کر اڑ
تھا۔ اس اعلان کے جواب میں لاکٹ والے نے بہت زوردار تھپڑ یوسف کے منہ پر
اس کا اوپری ہونٹ پھٹ گیا اور سرخ خون گاڑی کے کارپٹ کو بھگونے لگا۔ میں نے
بڑھنا چاہا تو منڈھے ہوئے سر والے ایک لڑکے نے' جو غالباً کسی کالج کی یونین کا صدر

... لمبا چاقو میری گردن پر رکھ دیا اور چاقو کے زور سے مجھے دھکیل کر سب سے پچھلی
... سیٹ پر بٹھا دیا۔ یوسف بے حد چیخ و پکار کر رہا تھا مگر اس کی آواز بند گاڑی سے باہر
... جا سکتی تھی۔ لاکٹ والے نے زبردستی اس کے منہ میں کپڑا گھسیڑ دیا اور اس پر جھک
... سپاٹ لہجے میں بولا "دیکھو نحوست کی اولاد' ہماری تجھ سے کوئی دشمنی نہیں' نہ ہی
... اس سے غرض ہے کہ تو کہاں تھا اور کہاں سے آیا ہے۔ ہمیں صرف وہ باز دے
... ہم چپ چاپ تجھے چھوڑ دیں گے بلکہ انعام بھی دیں گے۔ دوسری صورت میں جو
... ہو گا وہ تیرے کھوپڑے میں نہیں آئے گا اور نہ ہی آ سکتا ہے۔ ہم اچھے لوگ نہیں
... اور ان سب میں برا میں ہوں۔ بندے کو ایسی موت مارتا ہوں کہ........ خیر چھوڑو۔
... گھنٹے میں تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا۔" پھر وہ میری طرف مڑا اور ریوالور کو
... انداز میں انگلی پر گھما کر زہریلے لہجے میں بولا "ہاں........ آئرن لیڈی تو اس
... کے ساتھ کہاں بھاگی پھر رہی ہے؟"

... اس کا ایک ساتھی دبے دبے لہجے میں بولا "چیف یہ مجھے بڑی گہری عورت لگتی
... میرا خیال ہے میں نے اخبار میں کہیں اس کی تصویر بھی دیکھی ہے لیکن کچھ یاد نہیں
... میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ منڈھے ہوئے سر والا جس کا نام عاطف بخاری تھا'
... غور سے میری طرف دیکھنے لگا اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ وہ بولا "یار د!
... ایک اور شک پڑ رہا ہے۔ میرا خیال ہے یہ الو کا پٹھا یوسف ابھی تک اس کے پاس
... فلمی انداز ہوتا' اگر ایسا نہیں تو اس وقت یہ دونوں چوروں کی طرح خان رحیمی کی کوٹھی سے
... سوچو........ سوچو۔ ذرا مغز استعمال کرو مہربانو' قدر دانو! ہو سکتا ہے ان کا آپس
... کوئی ٹانکا ہو گیا ہو؟"

... لاکٹ والے نے خطرناک لہجے میں کہا "آئرن لیڈی! سب کچھ صاف صاف بتا دے
... باہر ہے؟ آرام سے بتا دے گی تو تیرے لئے بھی اچھا ہو گا اور اس لڑکے کے لئے
... اور تم دونوں بری طرح پچھتاؤ گے' میں تم دونوں کو آدھ گھنٹے کا ٹائم دے رہا ہوں۔
... گھنٹے میں اپنا اچھا برا خوب سوچ سمجھ لو۔ اس کے بعد ہم اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر
... اور تم دونوں کے پاس پچھتانے کا وقت بھی نہیں رہے گا۔ "انڈر سٹینڈ!" اس نے
... نعرہ اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہا وہ گاڑی سے باہر نکلنے لگے۔ لاکٹ والے

نے گنجے سر والے سے کہا "بخاری تو گاڑی کے پاس ہی رہ اور ان دونوں پر نظر رکھ۔"

بخاری بولا "یار چیف! یا تو اس آئرن لیڈی کے ہاتھ باندھ دے یا مجھے یہاں
چھوڑ۔ اگر اس نے بھاگنے واگنے کی کوشش کی نا تو میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ تجھے تو پتہ ہی
میں غصے میں کتنا کمینہ ہو جاتا ہوں۔"

لاکٹ والے نے ریوالور اسے تھماتے ہوئے کہا "تو ہو جانا کمینہ۔ تو ہے ہی
کے خاندان سے......... تجھے کون روک سکتا ہے مگر ایک ہی گولی چلانا' زیادہ قیمتی
ہے اس "نیلوفر" کی جان۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سن رہی ہے تو بھی' یہ پاگل کتا
نہ بھونکتا ہے نہ کاٹتا ہے' بس پھاڑ کھاتا ہے اور ادھر تجھے بچانے کوئی نہیں آئے گا۔
مانس بن کر اندر بیٹھی رہ اور سمجھا اپنے اس کچھ لگتے کو۔ ہم ناشتہ ماشتہ مار کے ابھی آ
ہیں" ان کی بول چال سے لے کر چال ڈھال تک سب میں فلمی انداز جھلکتا تھا۔

وہ چاروں باہر نکل گئے۔ گنجے سر والا عاطف بخاری کچھ دور ایک درخت سے
لگا کر بیٹھ گیا۔ باقی تینوں چھولداریوں کی طرف چلے گئے۔ یہ جگہ چاروں طرف سے در
میں گھری ہوئی تھی۔ جیپ کے علاوہ یہاں ایک پک اپ بھی موجود تھی۔ کچھ دور در
کی شاخوں سے ایک رسی بندھی تھی اور اس پر رنگ برنگ کپڑے جھول رہے
ایک ملازم پیشہ نوجوان چھولداریوں کے سامنے آگ جلائے کچھ پکانے میں مصروف تھا
کل تین چھولداریاں تھیں۔ کافی قیمتی معلوم ہوتی تھیں۔ ایک چھولداری کے عین
ایک شیشم کی سب سے بلند شاخ پر ٹی وی انٹینا نظر آ رہا تھا اور اس کی لمبی سفید
میں دھیرے دھیرے جھول رہی تھی۔ پک اپ میں ایندھن کے کام آنے والی خشک
کا ڈھیر پڑا تھا اور اس کے علاوہ شکار کا کچھ سامان بھی نظر آ رہا تھا۔ جس میں جال اور
کے بڑے بڑے ڈنڈے شامل تھے۔

میں نے باہر کے ماحول سے توجہ ہٹا کر یوسف کی طرف دیکھنا شروع کیا۔
اوپری ہونٹ پھٹ کر کریہہ منظر پیش کر رہا تھا۔ زخم چر کر کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا اور
کی چونچ تک پہنچ گیا تھا۔ گاڑھے خون کے اندر سے گوشت کی سفیدی جھانک رہی
میں نے بہ آہستگی اس کے منہ سے کپڑے کا گولا نکالا اور اپنے دوپٹے سے اس
صاف کرنے لگی۔ وہ کراہ رہا تھا اور سخت تکلیف میں تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس

ہوں مگر پندرہ گز دور بیٹھے بخاری کی نظریں میری ہر حرکت دیکھ رہی تھیں۔ میں
آہستگی مخالف سمت کے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اندرونی کھٹکا کھینچ کر
کو حرکت دینا چاہی مگر پتہ چلا کہ دروازہ صرف باہر سے کھل سکتا ہے۔ معلوم نہیں
نے دروازوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔ اب یہ گاڑی ہمارے لئے کال کوٹھڑی سے کم
تھی۔ میں نے یوسف سے کہا "یوسف ہم بری طرح پھنس گئے ہیں۔ لگتا ہے اس
کوئی آنا جانا بھی نہیں۔"

"باجی......... میرے ہاتھ........" یوسف نے بولنے کی کوشش کی تو اس کے
کے زخم سے پھر خون رسنے لگا۔

میں نے کہا "وہ دیکھ رہے ہیں' میں تمہارے ہاتھ نہیں کھول سکتی' اور اس کا فائدہ
ہے' وہ ہمیں بھاگنے نہیں دیں گے" میں اپنے لہجے کو حتی الامکان پرسکون رکھنے کی
کوشش کر رہی تھی۔ اس کے باوجود صورت حال کی سنگینی لہجے پر اثر انداز ہو رہی تھی۔
اس کی آنکھوں سے ہراس جھانک رہا تھا۔ میں نے کہا "یوسف! یہ لوگ مجھے اچھے نہیں
میرا خیال ہے تم انہیں باز کا پتہ دے دو۔ کہیں کوئی اور ہی مصیبت کھڑی نہ ہو
"

میری بات پر وہ ایک دم چونک سا گیا۔ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر سر
ہلا کر بولا "نہیں...... میں نہیں بتاؤں گا' مار بھی دیں گے تو نہیں بتاؤں گا"

میں نے کہا "یوسف! سب سے قیمتی جان ہوتی ہے جان گنوا دو گے تو پھر باقی کیا
بچے گا۔ ذرا سوچنے کی کوشش کرو۔"

وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولا "میں سب کچھ سمجھ رہا ہوں۔ بچہ نہیں ہوں میں۔"
اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھ پر شک کر رہا ہے۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔ وہ
عمر سے زیادہ سمجھدار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید یہ ان فریب کن حالات کا
نتیجہ تھا جن سے ہر یتیم بچے کو گزرنا پڑتا ہے۔ زمانے کی سنگ دلی اور بے حسی بے آسرا
بچوں کی ذہنی نشوونما کو کیسے کیسے متاثر کرتی ہے؟ اس کا مشاہدہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا۔ میں
ہمدرد اور خیر خواہ تھی لیکن وہ مجھ پر بھی بھروسا نہیں کر پا رہا تھا۔

میں نے دکھ سے کہا "یوسف! کیا تمہارا خیال ہے کہ میں ان سے ملی ہوئی ہوں!"

"تم سب ملے ہوئے ہو۔" وہ خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "خان رحیم
اور یہ بابو لوگ' سب ایک ہو۔"

میں نے کہا "یوسف سمجھنے کی کوشش کرو' اگر میں ان لوگوں سے ملی ہوئی ہوں
مجھے کیا ضرورت تھی تمہیں یہاں لانے کی' کیا یہ سب کچھ خان رحیمی کی کوٹھی پر
ہو سکتا تھا...... اور...... اور تمہارے سامنے میں نے اپنا پرس کھیتوں میں پھینکا تھا۔
کیا ضرورت تھی اتنی بڑی رقم ایسے پھینکنے کی۔ وہ تمہارے سامنے مجھے بھی گالیاں د
رہے ہیں اور مار رہے ہیں۔ کچھ سمجھنے کی کوشش کرو یوسف! میں تمہاری برائی میں
ہوں۔"

میں دس پندرہ منٹ اسے سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا شبہ کسی حد تک
دور ہو گیا مگر باز کے بارے میں اس نے کچھ بھی بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ تکرار
ایک ہی بات کہہ رہا تھا "باز میرا ہے میں نے اسے پکڑا ہے' میں کسی کو کیوں دوں؟"

اسی دوران لاکٹ والا اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس آ گیا۔ اب اس نے آنکھوں
کو سیاہ چشمے میں چھپا رکھا تھا۔ ایک تنکے سے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے اس
نو فرانہ انداز میں مجھے دیکھا اور بولا "ہاں مس لال پری! کیا فیصلہ کیا تم "دو دیوانوں
نے"...... پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ میرے چہرے کے تاثرات سے سب
سمجھ گیا۔ اس نے بخاری اور ایک موٹے لڑکے کو اشارہ کیا۔ انہوں نے مجھے دبوچ کر
جھٹکے ہی میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ اس مقصد کے لئے ایک ٹائی استعمال کی گئی
بندش اتنی سخت تھی کہ میری کلائیاں جیسے آگ میں جلنے لگیں۔ میں ان کے تیور دیکھ
کانپ گئی۔ میں نے کہا "خبردار! اسے کچھ نہ کہنا وہ پہلے ہی زخمی ہے۔"

انہوں نے میری بات جیسے سنی ہی نہیں۔ لاکٹ والے نے جس کا اصل نام ا
کے لاکٹ پر اختر زماں کندہ تھا اپنے ساتھی کو گالی دے کر کہا "ابے کبوتر! دیکھتا نہیں
زخمی ہے لا ادھر مرہم' میں لگاؤں اس کے ہونٹ پر" اس نے ساتھی لڑکے سے سلگتا
سگریٹ لے لیا اور دو کش لے کر بڑی بے دردی سے یوسف کے کٹے ہوئے ہونٹ
رکھ دیا۔ یوسف کے منہ سے ایک کربناک چیخ نکلی اور وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا
ایک ساعت کے لئے میں نے سوچا میرا فرحان بھی تو ایسے ہی کرب سے گزر کر موت

رہا تھا۔ وہ بھی تو ایسے ہی چیخا چلایا ہوگا' اپنی بدبخت ماں کو پکارتا رہا ہوگا۔ میں نے
آنکھیں کھولیں اور چلا کر کہا "چھوڑ دو...... اس کو چھوڑ دو' خدا کے عذاب سے ڈرو'
فرعون نہ بنو۔"

میں نے لپک کر یوسف کی طرف بڑھنا چاہا تو بخاری نے مجھے بالوں سے کھینچ لیا۔
زماں بولا "بڑا درد اٹھ رہا ہے اس کے دل میں' مجھے تو کوئی گہرا رشتہ لگتا ہے۔"
بخاری نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور جو کچھ کہا وہ میرے تن بدن کو آگ لگا گیا۔
نے کہا "شرم کرو بے غیرتو! کسی کو گالی دینے سے پہلے سوچ لو تمہیں بھی بیٹا' باپ اور
کہنے والیاں ہوں گی۔"

اختر زماں نے گھوم کر ایک زور کا تھپڑ میرے منہ پر مارا۔ اور پھر بڑے دھیمے اور
لہجے میں اس سے پوچھا۔
"ہاں میرے یوسف ثانی' کچھ بتائے گا کہ......" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس نے
ہاتھ سے اپنی گردن پر خیالی چھری چلائی۔ جواب میں یوسف نے ان پر گالیوں کی
بوچھاڑ کر دی۔ وہ پوری شدت سے انکار کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ضد پر آ گیا ہے......
کے اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ اتنی اذیت جھیل
بھی وہ ثابت قدم رہے گا۔ درحقیقت وہ کھیت میں محنت کرنے والا سخت جان کسان
کوئی نازک اندام شہری لڑکا ہوتا تو اب تک کئی بار بے ہوش ہو چکا ہوتا۔ سختی جھیل کر
اور بھی خود سر ہو گیا تھا۔
"چیف! میرا خیال ہے پہلے اس آئرن لیڈی کو پگھلا لیں پھر اس ابن فتومس کو بھی
بولیں گے۔"

اختر زماں نے خطرناک انداز میں عینک اتار کر ایک طرف پھینکی اور میری جانب
"کیا خیال ہے بلبل صحرا! تو بھی کوئی نغمہ سنائے گی یا اس راج گدھ کی طرح چپ ہی
رہے گی؟" غالباً اسے دوسروں کو نت نئے ناموں سے پکارنے کا شوق تھا۔ اس نے جتنی بار
مخاطب کیا تھا ایک نئے نام سے کیا تھا۔ اچانک اس نے بے پناہ سنگین لہجہ اختیار کیا اور
"میرا خیال ہے گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا' بے غیرتی کا تمغہ تو تو ہمیں دے
چکی ہے۔ اب تھوڑا سا بے غیرت بن جانا چاہئے کیوں تیرا کیا خیال ہے کبوترا خان؟"

کبوترا خاں نے کہا "حق کہہ رہے ہو چیف" اس نے سگریٹ سلگا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

اخترزماں مجھ پر جھپٹا اور سلگتی ہوئی سگریٹ میری کلائی پر مسل دی۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے صرف ٹانگیں آزاد تھیں۔ میں نے اخترزمان کو زور سے ٹھوکر ماری۔ دفعتاً پہلو سے کبوترا خاں عقاب کی طرح مجھ پر جھپٹا اور میرے بالوں کو بل دے کر مٹھی میں جکڑ لیا۔ ایکا ایکی یوسف زور زور سے چیخنے لگا۔ "رک جاؤ' چھوڑ دو اسے' میں کہتا ہوں چھوڑ دو اسے۔ میں بتاتا ہوں سب کچھ۔"

اس کی پکار سن کر اخترزماں' بخاری اور کبوترا خاں نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ بخاری اور کبوترا خاں پیچھے ہٹ گئے جبکہ اخترزماں بدستور میرے سرہانے کھڑا رہا اور میرے بالوں کو بل دے کر مٹھی میں جکڑے رکھا "ہاں بک' کیا بکنا چاہتا ہے باجے" اس نے گرج کر کہا۔

یوسف نے کہا "اس کو چھوڑ دو' میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔"

"بتاؤ پھر........ کہاں ہے باز؟"

یوسف نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "میرے ساتھ چلو' میں تمہیں وہاں تک لے چلتا ہوں لیکن باجی کو چھوڑ دو' اسے کچھ پتہ نہیں۔"

اخترزماں نے اس کی کمزوری پکڑتے ہوئے کہا "نہیں باجی تمہاری یہیں رہے گی۔ باز ہمیں مل جائے گا تو یہ چھوٹ جائے گی۔"

میں یوسف کے رویے کی تبدیلی پر حیران ہو رہی تھی' اس کا ظرف میری توقع سے کہیں زیادہ نکلا تھا۔ وہ اپنی جان پر اتنی اذیت سہہ گیا تھا لیکن مجھے مصیبت میں دیکھ کر سب کچھ ہارنے پر تیار ہو گیا تھا۔ ہم دونوں میں کوئی برسوں کی رفاقت نہیں تھی' نہ ہی مہینوں کا ساتھ تھا۔ چند دن پرانی شناسائی تھی۔ اس مختصر شناسائی نے اسے اتنے بڑے فیصلے پر آمادہ کر دیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ اخترزماں اور اس کے ساتھیوں کو سب کچھ بتانے پر تیار ہو گیا۔ اس نے اس بارے میں جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"اس دن یوسف جب چودھری شہاب کے آدمیوں سے ڈر کر بھاگا تھا تو سیدھا

سرسوں کے ان کھیتوں کی طرف گیا تھا جہاں اس کے خیال میں اس کا ماموں یا ماموں زاد بھائی کام کر رہے تھے مگر یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ اس کی ممانی بھی کھیت میں موجود تھی۔ وہ شوہر اور بیٹے کو روٹی دینے وہاں آئی ہوئی تھی۔ یوسف نے اسے دور ہی سے بھانپ لیا۔ ممانی کے ہوتے ہوئے وہ کھیت میں نہیں جا سکتا تھا اچانک اسے خیال آیا کہ اگر ممانی یہاں موجود ہے تو صغراں گھر میں اکیلی ہو گی اس نئی امید کے سہارے وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ باز اس نے ایک کھیس میں لپیٹ رکھا تھا اور کھیس کے اندر اس کے سر پر ٹوپی چڑھا رکھی تھی۔ ٹوپی کی وجہ سے باز بالکل بے حس و حرکت تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کپڑے کے اندر پرندہ ہے۔ وہ گاؤں کی چند گلیوں سے گذر کر ماموں کے مکان کے پچھواڑے میں پہنچ گیا اور چار فٹ اونچی چار دیواری پھلانگ کر اندر چلا گیا۔ خوش قسمتی سے اسے صغراں تنہا مل گئی۔ اس نے اسے باز تھمایا اور ضروری ہدایات دینے کے بعد جیسے آیا تھا ویسے ہی نکل گیا۔ اس کے بعد کے واقعات بھی اس نے مختصراً بیان کر دیے۔

یوسف کی پوری بات سننے کے بعد اخترزماں نے پوچھا "یہ صغراں کون ہے؟"

یوسف نے کہا "میرے ماموں کی بیٹی اور میری منگیتر۔"

اختر زماں بولا "وہی جس کے بال بھورے ہیں اور ٹھوڑی پر پاس پاس دو تل ہیں۔"

یوسف نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ اخترزماں کی معلومات سے اندازہ ہوتا تھا کہ یوسف کے روپوش ہونے کے بعد شکاری پارٹیوں نے اس بارے میں کافی تفتیش کی تھی۔ یقیناً انہوں نے اس کی چھوڑی ہوئی سائیکل سے یا کسی اور ذریعے سے یہ سراغ لگا لیا تھا کہ باپ کے گھر سے غائب ہونے کے بعد وہ قریبی گاؤں میں شاید ماموں رحیم بخش کے گھر رکا ہے۔ وہاں سے انہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس نے اپنے ماموں کے گھر کا رخ کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ماموں اور دوسرے گھر والوں سے پوچھ گچھ کی ہو گی...... یہ بڑا لمبا چکر تھا۔

ایک طرف میں اپنے خیالوں میں گم تھی اور دوسری طرف اخترزماں اور یوسف سوچے جا رہا تھا کہ یوسف' صغراں سے باز کیسے حاصل کرے گا اور کیسے اخترزماں کو

ہینڈ اوور کرے گا۔ اخترزماں کے اصرار پر یوسف رضامند ہو گیا کہ وہ پیغام بھجوا کر صغراں کو باز سمیت کسی جگہ بلا لیتا ہے۔ اب مسئلہ صغراں کو بلانے کا تھا۔ طے یہ ہوا کہ یوسف اپنے ماموں کے گاؤں "گوپور" میں اپنی ایک رازداں عورت سے مدد لے گا۔ اس کا نام سرداراں تھا۔ یہ رشتے کرانے والی نائن تھی۔ یوسف کے گاؤں میں بھی آتی جاتی تھی اور یوسف اس سے صغراں کا حال احوال دریافت کرتا رہتا تھا۔ اس کا گھر گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھا اور رات کے اندھیرے میں یوسف باآسانی اس سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔

شام سے ذرا پہلے اخترزماں نے بخاری کو حکم صادر کیا کہ وہ اور کبوترا' یوسف کے ساتھ گوپور چلے جائیں۔ اس نے اپنے ریوالور کے علاوہ ایک واکی ٹاکی بھی بخاری کو دے دیا۔ یہ خاصی لمبی رینج کا سیٹ نظر آتا تھا۔ غالباً یو ایس اے کا بنا ہوا تھا۔ یو ایس اے ہی کی ایک طاقتور الیکٹرانک دوربین بھی میں نے جیپ میں دیکھی تھی۔ کبوترا کے پاس ایک ہلکی سی مگر بہت طاقتور گن تھی۔ ایسی گن میں نے ایک دفعہ ائرپورٹ پر ایک سیکورٹی آفیسر کے پاس دیکھی تھی۔ یہ گن بھی خاصی قیمتی دکھائی دیتی تھی۔ ان لوگوں کا ساز و سامان دیکھ کر میں حیران ہونے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی۔ اخترزماں نے یوسف کو کبوترا کی گن دکھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک سیکنڈ میں چھبیس گولیاں نکالتی ہے۔ ہوشیاری دکھاؤ گے تو چہرہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا تمہارا......... ہاں اگر اچھے فتھومس بن کر تعاون کرو گے تو جان بھی بچے گی اور انعام بھی ملے گا۔"

کبوترا نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اس نے ایک بوسیدہ سے کمبل کی بکل ماری تو پہچاننا مشکل ہو گیا کہ وہ شہری ہے یا دیہاتی۔ بخاری بھی چھولداری میں گیا اور اپنے ملازم کی شلوار قمیض پہن کر آ گیا۔ عینک اتار کر اس نے گرم چادر کی بکل ماری تو منڈے ہوئے سر کے ساتھ وہ سکہ بند دیہاتی نظر آنے لگا۔ صرف جوتے کی کسر تھی مگر اندھیرے میں جوتا کس نے دیکھنا تھا۔ پوری طرح تیار ہو کر انہوں نے یوسف کے ہاتھ پاؤں کھولے اور اسے لے کر پک اپ میں جا بیٹھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد پک اپ دھول اڑاتی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

سرد اور تاریک رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ شہر کی سردی اور گاؤں کی سردی کا فرق مجھ پر واضح ہو رہا تھا۔ گھنے درختوں میں سرسراتی ہوا گوشت پوست سے گزر کر ہڈیوں کو چھو رہی تھی۔ یوسف اور بخاری وغیرہ کو گئے ہوئے اب چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ ابھی تک ان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ان کا آخری پیغام کوئی ڈھائی گھنٹے پہلے ملا تھا۔ تب وائرلیس پر انہوں نے اخترزماں کو اطلاع دی تھی کہ وہ تریموں ہیڈورکس کو جانے والی سڑک پار کر چکے ہیں اور اب مطلوبہ گاؤں کوئی ڈیڑھ دو میل کی دوری پر ہے۔ اس کے بعد ان کی گاڑی وائرلیس کی رینج سے دور چلی گئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ اخترزماں کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک وہ واپس آ جائیں گے مگر اب نو بج چکے تھے۔ نہ وہ خود آئے تھے اور نہ ہی رابطہ بحال ہوا تھا۔ میں ایک چھولداری میں دہرا کمبل لپیٹے بیٹھی تھی۔ چند فٹ کی دوری پر اکائی کا ڈیک پورے زور شور سے انگلش دھنیں بجا رہا تھا۔ چھولداری سے باہر جیپ کے پاس اخترزماں' ان کا چوتھا ساتھی مقصود اور ملازم جیدا بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی نہ جانے وہاں کیا حالات پیش آئے ہوں گے۔ بہت سے سوال ذہن میں ابھر رہے تھے۔ اگر یوسف نے باز واقعی اپنی منگیتر کو دیا تھا تو اس بیچاری کے لئے یقیناً مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ سب سے پہلا مسئلہ تو یہ تھا کہ اس نے اسے رکھا کہاں ہو گا۔ وہ کوئی عام پرندہ نہیں تھا کہ مرغیوں کے ڈربے میں بند کر کے دانہ ڈال دیا جاتا۔ پھر صغراں کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اسے رازداری سے رکھتی۔ اسے یہ معاملہ اپنی ماں سے بھی چھپانا تھا۔ اگر وہ پرندہ اب بھی اس کے پاس تھا تو یہ کیا ضروری تھا کہ یوسف کے پیغام پر وہ اتنی رات گئے اس سے ملنے فوراً چلی آتی۔ اگر وہ نہ آتی یا سرداراں نامی اس عورت کو ہی کسی طرح کا شک پڑ جاتا تو معاملہ بہت گڑبڑ ہو سکتا

میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک اخترزماں کا رابطہ پک اپ سے قائم ہو گیا۔ وہ تیز لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ پہلے اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آئے۔ پھر پریشانی کے سائے لہرانے لگے۔ اس نے دو تین گالیاں بھی بکیں۔ پھر تیز تیز کچھ ہدایات سنائیں۔ رابطہ منقطع کر کے وہ بے قراری سے آگ کے گرد ٹہلنے لگا۔ ان کا چوتھا ساتھی بھی الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ صورت حال کسی طوفان کا پیش خیمہ دکھائی دے

رہی تھی۔ کوئی نصف گھنٹے بعد جنوبی سمت سے پک اپ کے انجن کا تیز شور سنائی دیا۔ چند ہی لمحے بعد پک اپ لہراتی، شور مچاتی آگ کے پاس آ کر رکی۔ پک اپ کے اندر کا منظر دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ایک لڑکی کبوترا خان کی بانہوں میں بری طرح مچل رہی تھی۔ اس کی چیخیں انجن کے شور میں سے ابھر ابھر کر چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ بخاری اور یوسف کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ڈرائیور، جو پک اپ چلا رہا تھا، آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ جب دروازہ کھول کر باہر نکلا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اس کے ایک کندھے سے قمیص پھٹی ہوئی تھی اور خون بہہ رہا تھا۔ کبوترا خاں نے لڑکی کو دونوں بازوؤں میں اٹھایا اور آگ کے پاس لا کر پٹخ دیا۔ وہ بری طرح مچل رہی تھی اور اس کی چیخیں دور تک گونج رہی تھیں۔ آگ کی روشنی میں میں نے لڑکی کا چہرہ دیکھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہی صغراں ہے۔ اس کے بال بھورے تھے اور وہ کم عمر بھی تھی۔ بمشکل پندرہ سال عمر رہی ہوگی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"مجھے چھوڑ دو....... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میرا ابا مجھے جان سے مار دے گا مجھے گھر جانے دو۔"

کبوترا خان نے اختر زمان سے کچھ کہا۔ اختر زمان نے اسے اشارہ کیا کہ لڑکی کو جیپ میں لے جائے۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی کی چیخ و پکار کسی بھولے بھٹکے شخص کو یہاں کھینچ لائے (حالانکہ اس کا امکان نہیں تھا۔)

میں ششدر تھی کہ یہ بگڑے ہوئے رئیس زادے کیسی من مانیاں کر رہے ہیں۔ مالی فائدے یا شوق کی خاطر وہ ہر اخلاقی قدر کو پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان کے اس اقدام کے کتنے سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ جس لڑکی کو یہاں اٹھا لائے تھے وہ کلبوں میں شامیں گزارنے والی اور گولف کھیلنے والی کوئی انگلینڈ پلٹ ماریہ، نادیہ یا نینا وغیرہ نہیں تھی، صغراں تھی، دیہاتن صغراں، تیل سے بال چپڑنے والی، موٹی اوڑھنی اوڑھنے والی اور شام کے بعد دہلیز سے قدم باہر نہ رکھنے والی۔ وہ اس زمین کا وہ نرم و نازک پودا تھی جو باد سموم کے پہلے جھونکے ہی سے فنا ہو جاتا ہے۔ اور یہ غنڈے اسے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے۔ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا، انہوں نے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔

وہ چلا رہی تھی "میرا ابا مجھے مار ڈالے گا" اور وہ اسے ٹیوٹا جیپ کی طرف کھینچ رہے تھے۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا کہ کیا کروں، چند لمحے کے لئے میں پتھرا کر رہ گئی۔

دفعتاً میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور لپکتی ہوئی جیپ کی طرف گئی، صغراں کو اب اٹھا کر جیپ میں ڈالا جا رہا تھا۔ "رک جاؤ..... رک جاؤ" میں نے چیخ کر کہا مگر میرے وہاں پہنچتے پہنچتے صغراں اس چھوٹے سے عقوبت خانے میں پہنچ چکی تھی۔ کبوترا اور اختر زماں بھی اس کے ساتھ ہی جیپ میں گھس گئے تھے۔ میں نے دروازے کا ہینڈل پکڑ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر وہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کھڑکی کے شیشے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ چوڑے جبڑوں اور گندمی رنگت والا مقصود مجھے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اختر زماں نے دانت کچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ ایک گالی دے کر بولا "آنے دو اس کو بھی اندر" اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بازو تھام کر مجھے اندر کھینچ لیا۔ گرج کر بولا "چپ چاپ اس پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ، شور مچاؤ گی تو شوٹ کر دوں گا" اپنے باپ کی قسم شوٹ کر دوں گا۔" اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا اور نشے کی زیادتی کی وجہ سے اس کا سارا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ کبوترا خاں نے کھڑکیوں پر پردے کھینچ دیئے۔ چیخ چیخ کر صغراں کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ اب وہ پورے زور سے بولتی تھی تو بھی اس کی آواز دس بارہ فٹ سے دور نہیں جاتی تھی۔

"باجی جی! مجھے بچا لیں" وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوئی بولی "خدا رسول ﷺ کی قسم میرا کوئی قصور نہیں ہے" گاڑی کی اندرونی روشنی میں، میں نے غور سے اس کا جائزہ دیکھا۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں، گردن پر خراشیں تھیں اور چھینٹ کی پھولدار قمیص بھی آستین سے ادھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی شکل و صورت کی وجہ سے کم سن نظر آتی تھی۔

اختر زماں نے غرا کر کہا "چپ کر جا، کچھ نہیں کہیں گے ہم تجھے لیکن اگر شور مچاتی رہی تو....." اس نے ریوالور لہرا کر صغراں کو دھمکی دی۔ وہ بیچاری سہم کر چپ ہو گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہونٹ مضبوطی سے بھینچ لئے اور ہچکیاں روکنے کی کوشش کرنے

گئی۔

اختر زماں نے تیز لہجے میں کبوترا سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟ وہ تیرا باپ بخاری کہاں ہے؟ اور وہ لڑکا؟"

کبوترا نے کہا "چیف! شکر کر ہم آ گئے ہیں۔ وہاں تو قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ اب بھی کچھ پتہ نہیں کیا بنتا ہے۔ میرا تو خیال ہے یہاں سے بستر بوریا گول ہی کر لیں۔"

"کیوں' ہوا کیا ہے؟"

"پولیس پیچھے لگ گئی ہے' بڑی مشکل سے جان چھڑا کر آئے ہیں۔ تریموں ہیڈ ورکس کے پاس انہوں نے روکا تھا' ہم بھاگ نکلے۔ پانچویں میل سے ذرا آگے گڑ بڑ ہو گئی۔ ہماری جیپ ایک سائیکل والے کو گرا کر کچے میں اتری اور درخت سے ٹکرا گئی۔ پولیس والوں کی پک اپ بھی قلابازی کھا گئی۔ پتہ نہیں کتنے مرے ہیں اور کتنے بچے ہیں۔" کبوترا کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

اختر زماں نے غرا کر کہا "پاگل کے بچے! مجھے شروع سے بتا کیا ہوا تھا' لڑکی کہاں سے ملی اور پولیس کب پیچھے لگی؟"

کبوترا گھگیا کر بولا "چیف! یہ سب کچھ بتانے کا وقت نہیں ہے' میں تو کہتا ہوں بھاگ چلیں۔"

اختر زماں نے پوچھا "کوئی بندہ قتل تو نہیں ہو گیا تم سے؟"

کبوترا بولا "چیف! قتل تو نہیں ہوا مگر پلسیوں کی پک اپ جو الٹ گئی ہے۔ کیا پتہ ایک دو ختم ہو گئے ہوں۔"

اختر زماں کچھ دیر پریشانی سے سوچتا رہا۔ لگتا تھا وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ آخر اس نے ایک نظر کلائی کی گھڑی پر ڈالی اور بولا "اچھا ٹھیک ہے' اگر نکلنا ہے تو جلدی نکلو۔ فالتو' خیمے وغیرہ رہنے دو ادھر ہی' ضروری سامان لے لو چلو جلدی کرو۔"

اس کی ہدایت پر کبوترا دروازہ کھول کر باہر نکلنے لگا تو چیف نے پوچھا "لیکن ان دونوں کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

کبوترا بولا "وہ بڑی نہر کی طرف گئے ہیں۔ میواتیوں کے گاؤں میں۔ پہلے یہاں سے نکل چلیں پھر میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔"

کبوترا' مقصود' ملازم اور ڈرائیور جلدی جلدی سامان سمیٹنے لگے۔ اختر زماں نے مجھے حکم دیا کہ میں صغراں کا پراندہ کھول کر اس سے اس کے ہاتھ باندھ دوں۔

"میں یہ نہیں کروں گی" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ خوفناک لہجے میں انتہائی خوفناک دھمکیاں دینے لگا۔ اس گھڑی وہ سچ مچ کوئی درندہ نظر آ رہا تھا۔ بھرا ہوا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور جلتی آنکھیں ہم دونوں کو گھور رہی تھیں۔ یکایک کہیں نزدیک سے گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ یہ دو یا تین گاڑیاں تھیں۔

کبوترا اور مقصود بھاگتے ہوئے جیپ میں آ گئے۔ کبوترا کی آنکھوں میں ہراس تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا "یار چیف! میرا خیال ہے وہ آ گئے۔"

اختر زماں ہم دونوں کو ریوالور کی زد میں لے کر غرایا "اگر تم دونوں نے اونچی آواز میں سانس بھی لیا تو میں مار دوں گا۔" پھر اس نے مقصود سے کہا "چل صودی! اب آگے لگ' تیرا باپ ایس پی ہے تو ہی نبڑ اپنے رشتے داروں سے۔"

مقصود عرف صودی بولا "ٹھیک ہے" پھر وہ ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تم ان کو آواز نہ نکالنے دینا۔ دروازے اندر باہر سے لاک کر لو۔ میں بات کرتا ہوں ان [illegible]۔"

اس گفتگو کے دوران گاڑیاں موقعے پر پہنچ چکی تھیں۔ ان کی تیز ہیڈ لائٹس کھڑکیوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ ان کے ڈرائیوروں نے بڑی دانشمندی سے بھاگنے کے دونوں راستے مسدود کر دیئے تھے۔ ہماری گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ لہٰذا باہر کی آوازیں نہ ہونے کے برابر ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ اختر زماں نے ایک کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا ہٹایا تو میں نے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ ایک گاڑی کی روشنی میں' میں نے دیکھا' مقصود پولیس انسپکٹروں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کے اشاروں اور بولنے کے انداز سے اعتماد کا اظہار ہوتا تھا۔ میں دیکھ رہی تھی۔ ایک پک اپ پاس ہی کھڑی تھی جس کا پیچھا کرتے ہوئے پولیس کی جیپ الٹی تھی۔ پک اپ کا زخمی ڈرائیور بھی نزدیک ہی موجود تھا۔ ان دونوں اہم ثبوتوں کی موجودگی میں وہ نہ جانے پولیس کے سامنے کیا صفائی پیش کر رہا تھا...... تھوڑی دیر بعد وہ آوازیں جیپ کے قریب سے آنے لگیں۔ بولنے والے بڑے تیز تیکھے لہجے میں بول رہے تھے۔

"انسپکٹر! میں پھر کہہ رہا ہوں' تم اچھا نہیں کر رہے ہو" یہ مقصود کی آواز تھی۔

جواب میں انسپکٹر کی بھاری آواز سنائی دی "اوئے دیکھ لیں گے ہم تجھ پانے خاں کو' چل پیچھے ہٹ' نہیں تو نکالتا ہوں گور تری........."

مقصود کی خطرناک آواز آئی "ٹل جا انسپکٹر' اب بھی ٹل جا۔"

جواب میں کسی نے بند دروازے کے ہینڈل کو جھٹکا دیا اور زور سے بولا۔

"باہر نکلو اوئے" یہ دوسرے انسپکٹر کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی باہر سے ہاتھاپائی کی آوازیں آئیں۔

اختر زماں نے جیپ کے بند دروازے کو ایک سخت جھٹکے سے کھولا۔ انسپکٹر جو باہر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا' دروازہ لگنے سے دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی مقصود نے اوپر تلے دو فائر کئے۔ میں نے ایک دراز قد پولیس والے کو زخمی ہو کر گرتے دیکھا۔ پھر دو گولیاں سنسناتی ہوئی جیپ کی باڈی میں لگیں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ صغراں بھی ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ کبوترا خاں نے جیپ کے اندر ہی سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔ اس کا رخ بائیں جانب تھا۔ اس کی جدید آٹومیٹک رائفل اوپر تلے شعلے اگل رہی تھی۔ یکایک ایک زبردست چھناکے سے جیپ کی ونڈ اسکرین چور چور ہو گئی۔ "بھاگو صغراں" میں نے دبی دبی آواز میں کہا اور خود بھی کھسکتی ہوئی جیپ سے باہر آ گئی۔ تاریکی میں چاروں طرف شعلے سے لپک رہے تھے۔ کسی پولیس افسر کی گرجدار آواز سنائی دی "نذر حسین! بائیں طرف ہو جا' کوئی بھاگنے نہ پائے" جواب میں اختر زماں نے بلند آواز میں اپنے کسی ساتھی کو للکارا۔ میں حتی الامکان جھک کر چلتی ہوئی آڑ کی تلاش میں بھاگی۔ میں نے محسوس کیا کہ صغراں بھی میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں ایک پولیس جیپ کے پاس سے گزریں۔ غالباً پک اپ کی طرف سے ہم پر فائرنگ کی گئی۔ پولیس جیپ کی دونوں ہیڈلائٹس چھناکوں سے ٹوٹ گئیں اور شیشے کی کئی چھوٹے ٹکڑے میرے بائیں ہاتھ پر لگے۔ میں نے صغراں کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی محفوظ سمت لے گئی۔ گہری تاریکی میں ہم دور تک بھاگتی چلی گئیں۔ آخر صغراں ہانپ کر بیٹھ گئی۔ ہانپتے ہوئے بولی "باجی! پولیس والوں نے انہیں پکڑ لیا ہوگا' اب تم کہاں بھاگی جا رہی ہو؟"

ایک لمحے کے لئے میں چونک گئی۔ صغراں کی اور میری سوچ میں فرق تھا۔ اس کے لئے پولیس سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں تھی جبکہ میرے پاس تھی' میں ایک مفرور تھی۔ حالانکہ پولیس ہمارے لئے امداد غیبی کی صورت میں آئی تھی مگر اس "امداد" کا سامنا کرنا میرے لئے بے حد دشوار تھا۔

میں نے کہا "اٹھو صغراں' ہمیں آگے جانا ہے یہاں رکنا خطرناک ہے" وہ نیم رضامندی سے اٹھی اور ایک بار پھر میرے ساتھ بھاگنے لگی۔

اس جگہ سے کوئی ایک میل آگے آنے کے بعد ہم بڑی نہر تک پہنچ گئیں اور ایک تنگ پلیا کے نیچے بیٹھ کر ہانپنے لگیں۔ اس وقت تک رات کے قریباً ساڑھے ... بج چکے تھے۔ ٹھٹھری ہوئی "دیہاتی رات" اوس میں بھیگی اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بس بہتے پانی کا ہلکا سا شور تھا جو گھنے پتوں کی سرسراہٹ کے ساتھ مل کر فضا کو کچھ عیاں کر رہا تھا۔ میرے جسم پر ایک گرم چادر تھی جبکہ صغراں کا سر بھی ننگا تھا اور پاؤں بھی۔ جونہی اس کی سانسیں کچھ بحال ہوئیں وہ سردی سے کانپنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ہچکیاں بلند ہونے لگیں۔ وہ رو رہی تھی "ہائے ربا' میں کیا کروں؟ یہ کیا ہو رہا ہے ... ساتھ.........؟" اس نے کراہتے ہوئے کہا......... مجھے تھوڑی دور ایک کشتی کے آثار نظر آئے۔ یہ کافی بڑی کشتی تھی۔ اسے پانی سے نکال کر کوئی آٹھ دس فٹ خشکی پر لایا گیا تھا۔ کشتی پر ایک چھوٹا سا خیمہ یا جھونپڑا بھی تھا۔ میں صغراں کو لے کر کشتی کی طرف بڑھی۔ یہ ایک پرانی اور شکستہ کشتی تھی۔ جگہ جگہ جوڑ لگے ہوئے تھے۔ جھونپڑا بھی چھوٹا تھا۔ تاہم اس وقت ہمیں یہاں پناہ مل سکتی تھی۔ میں نے احتیاط سے کشتی کا جائزہ لیا اور صغراں کو لے کر جھونپڑے میں آ گئی۔ یہاں ایک پیال کا ڈھیر لگا تھا۔ یہ ڈھیر ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ تھا۔ ہم دونوں نے گرم چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹی اور پیال میں گھس کر بیٹھ گئیں۔ سن رکھا تھا کہ پیال سردیوں میں لحاف کا کام دیتی ہے۔ آج یہ بات ثابت ہو رہی تھی۔

میں ہمدردانہ لہجے میں صغراں سے باتیں کرنے لگی۔ میرے خلوص نے اسے متاثر کیا اور وہ جلد ہی اپنے دکھ کی شدت میں کمی محسوس کرنے لگی۔ میں نے اسے یوسف کے ساتھ ملاقات کے بارے میں بتایا اور یہ بتایا کہ یوسف اور میں کن حالات میں

اخترزماں کے چنگل میں پھنسنے اور پھر یوسف کو کیونکر اسے پیغام دے کر بلانا پڑا۔ یہ جان
کہ میں نے خان رحیمی کی کوٹھی میں تین دن یوسف کو پناہ دے رکھی تھی صغراں مجھ
اور بھی متاثر ہوئی۔ وہ اب سمجھ گئی تھی کہ یوسف مجھے اپنے حالات کے بارے میں
کچھ بتا چکا ہے۔ لہٰذا وہ بھی کھل کر باتیں کرنے لگی۔ اس نے فکرمندی سے کہا "باجی!
نہیں، وہ یوسف کو کہاں لے گیا ہے وہ تو زخمی بھی تھا۔ ہائے اللہ کتنی چوٹ آئی ہے اس
منہ پر، میرا تو دل ہول رہا ہے۔"

"کون لے گیا ہے اس کو، وہی منڈھے ہوئے سر والا تو نہیں تھا؟"

صغراں نے اقرار میں سر ہلایا اور بولی "وہ بڑا غصے میں تھا، کہیں وہ یوسف سے
نہ پڑا ہو، باجی......... مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے......... اب کیا ہو گا میرا......... میرا ابا تو مجھے
کاٹ ہی ڈالے گا۔"

وہ سخت پریشان تھی اس کا دھیان یوسف کی طرف جا رہا تھا اور کبھی اپنے اب
طرف، رہ رہ کر وہ پولیس کی جیپ کا ذکر بھی کر رہی تھی جو اس کی آنکھوں کے سا
الٹ کر کھیت میں گری تھی۔ اس کی آنکھوں میں دیکھے اور ان دیکھے مناظر خوف بن
جمے ہوئے تھے۔ میں نے کہا "صغراں! مجھے اس طرح کچھ سمجھ نہیں آ رہی، تو مجھے
سے بتا کیا واقعہ ہوا ہے۔ کیا وہ باز سچ مچ......... میرا مطلب ہے کیا ہوا ہے اس باز
ساتھ؟"

صغراں نے بڑی معصومیت کے ساتھ ناک سے شوں شوں کی آواز نکالی اور
ہاتھ سے آنسو پونچھ کر بولی "باجی! یہ منگل کی بات ہے، پچھلا ٹائم تھا۔ یوسف بڑا گھبرا
ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ میں اس وقت اکیلی تھی۔ اس نے کھیس میں لپٹا ہوا ا
مجھے دیا اور کہا میں اسے کہیں چھپا لوں۔ وہ کل یا پرسوں کسی وقت آ کر لے جائے گا
نے یہ بھی کہا کہ کسی کو اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہئے۔ میں باز کو چھت پر اپلو
کوٹھڑی میں لے گئی۔ اس کوٹھڑی میں میرے سوا کوئی کم ہی آتا جاتا ہے۔ میں
یہاں یہ حفاظت سے رہے گا۔ مرغیاں ڈھانپنے والا ایک پرانا ٹوکرا ہمسائی کی چھت
تھا۔ میں اٹھا لائی اور باز کو اپلوں والی کوٹھڑی میں اس کے نیچے رکھ دیا۔ تین دن
بالکل پتہ نہیں چلا۔ آج سویرے جب میں باز کو کلیجی کے ٹکڑے کھلانے کے لیے

پہنچی تو دیکھ کر حیران رہ گئی کہ باز وہاں نہیں ہے۔ میں بڑا گھبرائی۔ سارے کوٹھے پر دیکھا پر
کچھ پتہ نہیں چلا۔ کوٹھڑی کے کچے فرش پر کسی بچے کے پاؤں لگے ہوئے تھے۔ ایک ایسا
ہی نشان ایک تیلے اپلے پر بھی تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کون بچہ ہے جس نے یہ کام
کیا ہے۔ ابھی سورج نکلا ہی تھا کہ ہمارے گاؤں کا ڈاکیا نور محمد ہمارے گھر آ کر میری ماں سے
باتیں کرنے لگا۔ میں بھی پاس جا کر سننے لگی۔ ڈاکئے نور محمد نے ماں سے کہا۔

"بہن جی! صبح نماز پڑھنے جا رہا تھا کہ ایک بچہ آپ کے گھر کی پچھلی طرف سے
نکل کر قبرستان کی طرف جاتا نظر آیا۔ میں حیران ہوا کہ یہ کس کا بچہ ہے۔ میں نے غور
سے دیکھا تو وہ بالو تھا۔ میں نے آواز دی لیکن وہ سنی ان سنی کر کے نکل گیا۔ سوچ سوچ کر
آپ کی طرف آیا ہوں کہ کہیں وہ آپ کی کوئی چیز ہی اٹھا کر نہ لے گیا ہو۔ آپ ذرا اندر
اندر دیکھ بھال لیں۔

میری ماں گھبرائی ہوئی اٹھی اور اندر جا کر ٹرنک وغیرہ دیکھنے لگی۔ اسے زیادہ فکر
میرے جہیز کے سامان کی تھی۔ سب کچھ دیکھ لیا مگر کوئی ایسی بات نہیں تھی سب کچھ ٹھیک
ٹھاک تھا۔ چاچے نور محمد کو اطمینان ہو گیا اور وہ چلا گیا......... میرا دل خون کے آنسو رو رہا
تھا۔ ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی پر میں کسی کو بتا نہیں سکتی تھی......... یوسف نے
مجھے زبان بند رکھنے کو کہا ہوا تھا۔

یہ بالو میواتیوں کی بستی کا رہنے والا ہے۔ اس کا قد بہت چھوٹا ہے بس تین ساڑھے
تین فٹ ہو گا۔ سر بہت بڑا ہے، عمر کوئی چالیس سال ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا
ہے اسے گاؤں کی گلیوں میں بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ اس کی آواز اچھی ہے۔ دردناک آواز
میں قصے کہانیوں کے شعر پڑھتا ہے اور لوگوں سے پیسے اناج وغیرہ اکٹھا کرتا ہے۔ کبھی کبھی
اسے چوری بھی کرتے دیکھا گیا ہے۔ میرے دل نے کہا کہ ہو نہ ہو یہ اسی بالو کا کام ہے۔ میں
سارا دن روتی رہی اور سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ شام کے وقت سرداراں آ گئی۔
اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر بتایا کہ گاؤں سے باہر یوسف میرا انتظار کر رہا ہے اور
اس نے کہا ہے کہ جو چیز اس نے مجھے سنبھالنے کو دی تھی وہ لے کر آ جاؤں۔ میں کسی نہ
کسی طرح بہانہ بنا کر گھر سے نکلی اور پرانے باغ میں یوسف سے ملنے آ گئی۔ میں نے
اس کو بتایا کہ باز گم ہو گیا ہے۔ وہ مجھے ڈانٹنے ڈپٹنے لگا۔ اتنے میں درختوں سے تین

106168

آدمی نکل آئے۔ ان میں ایک تو کبوترا خان تھا اور دوسرا وہی گنجے سر والا' وہ مجھے گھورنے لگے اور کہنے لگے "تم جھوٹ بول رہی ہو' سچ بتاؤ باز کہاں ہے" میں ڈر کر رونے لگی۔ وہ ہم دونوں کو لے کر اپنی نیلی گاڑی کے پاس آگئے...... یوسف کے پوچھنے پر میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ میری زبان سے بالو کا نام سن کر یوسف نے کہا "تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ جب میں تمہیں پھیرو دینے کے لئے تمہارے گھر آیا تھا اور پچھلی دیوار پھلانگی تھی' یہ بالو گلی میں موجود تھا اور اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اگر باز کسی نے چوری کیا ہے تو وہ بالو کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا......" گنجے سر والا اور اس کے ساتھی ہم دونوں کی باتوں کو جھوٹ سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یوسف نے مجھے کوئی اشارہ کر دیا ہے یا میرے کان میں کوئی بات کہہ دی ہے جس کی وجہ سے میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ کبوترا خان نے اپنی بندوق میری طرف سیدھی کر لی اور غصے سے بولا'

"ایسی کہانیاں ہم نے بہت سنی ہوئی ہیں' ہمیں باز کے بارے میں بتاؤ یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

میں سچ مچ ڈر گئی۔ میں نے قسمیں کھا کر کہا کہ جو کچھ کہہ رہی ہوں وہی سچ ہے لیکن ان میں سے کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے یوسف کے ساتھ مجھے بھی ڈرا دھمکا کر گاڑی میں سوار کر لیا اور کہا کہ ہم انہیں اسی وقت بالو کے پاس لے چلیں۔ میواتیوں کا گاؤں اسی نہر کے دوسرے کنارے پر یہاں سے تقریباً تین چار میل کی دوری پر ہے۔ ہمارے گاؤں سے بھی اس کا فاصلہ چار پانچ میل کے قریب ہے لیکن راستہ خراب ہے اور گاڑی آگے تک نہیں جا سکتی...... ہماری گاڑی بھی کوئی دو میل جانے کے بعد رک گئی۔ راستہ تھا ہی نہیں۔ کھیت تھے یا پگڈنڈیاں تھیں۔ گنجے سر والے نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور یوسف کو لے کر نیچے اتر گیا۔ اس نے کبوترا سے کہا کہ وہ مجھے لے کر ڈیرے پر چلا جائے...... خود وہ یوسف کو لے کر پیدل ہی آگے بڑھ گیا۔ میں چلانے لگی۔ کبوترا نے مجھے تین چار تھپڑ مارے۔ یہ دیکھ کر یوسف نے گنجے سر والے سے ہاتھا پائی شروع کر دی مگر اس نے پستول کی نال یوسف کے سر سے لگا دی اور اسے دھکیلتا ہوا درختوں کی طرف لے گیا......" یہاں تک کہہ صغراں سسکنے لگی۔ میں نے گرم جوشی سے اچھی طرح اس کے کندھوں پر ڈالی اور دلاسہ دے کر چپ کرایا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"میں بہت روئی چلائی مگر کبوترا نے میری دونوں بانہیں جکڑ کر مجھے سیٹ پر بٹھا دیا اور گاڑی موڑ کر دوسری طرف کا رخ کر لیا۔ دو میل کچے راستے پر سفر کرنے کے بعد ہم پکی سڑک پر پہنچے تو میری چیخیں سن کر پلس کی ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی۔ پلس کو دیکھ کر کبوترا ڈر گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ گاڑی تیز چلائے اور کچھ بھی ہو جائے آہستہ نہ کرے۔ ڈرائیور نے ایسا ہی کیا۔ دونوں گاڑیاں بہت دوڑ گئیں۔ ہماری گاڑی دائیں بائیں ڈول رہی تھی اور کبھی کبھی تو لگتا تھا ابھی الٹ جائے گی۔ پلس کی گاڑی پرانی تھی پھر بھی وہ پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ پھر دونوں گاڑیاں بالکل پاس پاس چلنے لگیں۔ ایک دو بار گولی بھی چلی۔ مجھے پتہ نہیں وہ کون سی جگہ تھی جہاں ہمارے والی گاڑی ایک سائیکل والے کو بچاتی بچاتی کچے میں اتر گئی اور زور زور سے اچھلنے کے بعد ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ پلس کی گاڑی بھی ہمارے بالکل پیچھے تھی۔ وہ الٹ گئی اور قلابازی کھا کر ایک کھیت میں جا کر گری۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میری چیخیں نکل گئیں۔ کبوترا خاں نے چلا کر ڈرائیور سے پوچھا بچ گئے ہو۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا "بڑی سخت چوٹ آئی ہے پر بچ گیا ہوں" وہ بولا "پھر سوچتے کیا ہو بھاگو' انہوں نے گاڑی ذرا پیچھے ہٹائی اور ایک بار پھر پکی سڑک پر چڑھا دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پلس کی گاڑی میں سے دھواں نکل رہا تھا اور سپاہی اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے...... اس کے بعد آپ کو پتہ ہی ہے ہم کیسے وہاں پہنچے اور کیسے پلس نے وہاں چھاپہ مارا۔"

صغراں کی روئیداد نے بہت سی کڑیاں آپس میں ملا دی تھیں۔ اس کا مطلب تھا ان باز کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے جو ایک نہایت قیمتی اور "شام الاٹ" چیز کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ غالباً بالو نامی اس شخص نے یوسف کو پراسرار انداز میں صغراں کے گھر داخل ہوتے دیکھ لیا اور یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔ اسی تجسس نے اسے چوری پر ابھارا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ قیمتی پرندہ اب صغراں کے گھر سے غائب تھا......

میں انہی سوچوں میں گم تھی کہ کچھ آہٹیں سن کر چونک گئی۔ یہی کیفیت صغراں کی ہوئی۔ اس کا چھوٹا سا خوبصورت دہن کھل گیا اور ڈری ڈری ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ایک سے زائد افراد تیز تیز چلتے اس کشتی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں

بھی کر رہے تھے۔ ہم دونوں پیال کے اندر کچھ اور بھی دبک گئیں۔ میں نے دل کو دلاسہ دیا کہ رات کے اس پہر اس شکستہ حال کشتی کی طرف کس نے آنا ہے۔ راہ گیر ہوں گے پاس سے گزر جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا وہ افراد سیدھے کشتی کی طرف آئے۔ پھر میں نے کشتی میں جنبش محسوس کی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ ان لوگوں کا تعلق یقیناً اسی کشتی سے تھا۔ صغراں سہم کر میرے ساتھ چپک گئی۔ کچھ دیر کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر ایسے لگا کہ تین چار افراد مل کر زور لگا رہے ہیں۔ ایکاایکی کشتی اپنی جگہ سے حرکت میں آ گئی۔ وہ دور ڈھلوان کیچڑ پر پھسلتی ہوئی پانی کی طرف جا رہی تھی۔ ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ میں نے کشتی کو پانی کی لہروں پر محسوس کیا۔ کشتی نہر میں اتاری جا چکی تھی۔ یہ بڑے سنگین لمحات تھے۔ یہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کشتی کو رات کے اس پہر کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ صغراں رو دے گی یا اٹھ کر بھاگ نکلے گی۔ میں نے ایک بازو اس کی گردن میں ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ کشتی والے چپو چلاتے ہوئے تیزی سے بہاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی بھرائی ہوئی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سے جاگے ہیں یا جگائے گئے ہیں۔ اب پتہ چل رہا تھا کہ ان کی تعداد پانچ سے کم ہرگز نہیں ہے۔ ان میں سے ایک شخص کے لہجے میں کچھ زیادہ گھبراہٹ تھی۔ وہ کسی جگہ آگ لگنے کا ذکر کر رہا تھا۔ لاش' جلی ہوئی بکریاں اور صلو بھائی کے الفاظ بھی بار بار اس کی گفتگو میں آ رہے تھے۔ پانی کے بہاؤ کشتی کی رفتار ہر لحظہ تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کی گفتگو میں بھی تیزی آ رہی تھی۔ جلد ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ کسی جگہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے شاید آگ وغیرہ لگ گئی ہے۔ قریبی گاؤں سے ایک ڈاکٹر اور ایک کمپاؤنڈر کو جائے حادثہ لے جایا جا رہا ہے۔ کشتی میں اس گاؤں کا چودھری بھی سوار تھا۔ ہم دونوں کو ہر لحظہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اندر نہ آ جائے۔ ایسا ہو جاتا اور آنے والے کے پاس معمولی بھی ہوتی تو ہمارا پکڑا جانا یقینی تھا۔ کشتی کی رفتار سائیکل کی عام رفتار سے کم نہیں چپوؤں کی چھپاچھپ سناٹے میں دور تک گونج رہی تھی۔ آخر ہمیں کشتی والوں کی سے اندازہ ہوا کہ وہ منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ چپوؤں کی صدا مدھم ہوئی۔ چند ہلکے جھٹکے کھانے کے بعد کشتی کنارے سے جا لگی۔ کشتی کو کھینچ کر کنارے پر چڑھا دیا

وقت میں نے پیال میں سے تھوڑا سا آگے کو کھسکتے ہوئے دروازے سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ مجھے کچھ فاصلے سے بہت سی ملی جلی آوازیں آئیں اور اس کے ساتھ ہی آسمان پر نامانوس سرخ روشنی دکھائی دی۔ میرے دل نے پکار کر کہا کہ کہیں آگ لگ ہے۔ جھونپڑے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے باہر دیکھا۔ کشتی خالی تھی۔ کنارہ ہوا تھا اس لئے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہاں فضا میں ایک حدت سی رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بے موسمی حدت آگ کی مرہون منت تھی۔ میں نے سرگوشی میں کو باہر آنے کی ہدایت کی۔ وہ میری چادر لپیٹے ہوئے باہر آ گئی۔ کشتی کی نوک کے ایک خانے میں بوسیدہ سی نیم روشن لالٹین رکھی تھی۔ لالٹین کے پاس ہی ایک ہوئی یا اس قسم کا کوئی کپڑا تھا۔ میں نے یہ کپڑا اٹھا کر اوڑھ لیا۔ کشتی کے درمیان والے میں اب کوئی ایک انچ پانی کھڑا تھا۔ غالباً کشتی کا پیندہ رستا رہتا تھا۔ عجیب سی کشتی تھی۔ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہمیں چلا کر اتنی دور سے آئی ہے۔

میں صغراں کے ساتھ احتیاط سے کنارے پر چڑھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے عجیب منظر آیا۔ ایک کچی پکی بستی کا ایک حصہ آگ کی زد پر تھا۔ بہت سے مکان جل راکھ ہو چکے تھے اور کچھ ابھی جل رہے تھے۔ بستی کے اردگرد نشیب و فراز میں ہوئی لالٹینوں کا ہجوم تھا۔ آگ کی روشنی ان کے متحرک جسموں پر منعکس ہو رہی تھی۔ ان عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ لوگ ٹولیوں اور مجمعے کی صورت میں جگہ جگہ کھڑے اردگرد کی پگڈنڈیوں پر لوگ تیز قدموں سے آ جا رہے تھے............ ہم دونوں نے انداز میں چادریں لپیٹیں اور دھڑکتے دل کے ساتھ ہجوم میں شامل ہو گئیں۔ اس پر تیرگی میں امید نہیں تھی کہ کوئی ہمیں پہچان سکے گا۔ میں نے دیکھا ایک جگہ تین زمین پر رکھی تھیں ان کے قریب بہت سی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ ان عورتوں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا یہ عورتیں میواتی تھیں۔ تماشائیوں میں بہت سے میواتی نظر آ رہے تھے۔ صغراں حیران کن نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے میرا بازو دبایا اور میرے کان کے پاس منہ لا کر کہنے لگی۔

"باجی! یہ تو میواتیوں کا گاؤں ہے۔ میں ایک دو بار اس راستے سے گزر چکی اچھی طرح پہچانتی ہوں میں۔"

صغراں کے لہجے میں دنیا جہان کا خوف سمٹا ہوا تھا۔ شاید اسے یوسف کا خیال آ
تھا۔ وہ بھی تو دو ڈھائی گھنٹے پہلے بخاری کے ساتھ اسی گاؤں کی طرف روانہ ہوا تھا......
نہیں یہاں پر کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں سے سنگین تر
خطرات کی بو آ رہی تھی۔ فرطِ غم سے نڈھال ہو کر صغراں ایک درخت کے تنے
ساتھ بیٹھ گئی۔ "باجی...... مجھے کچھ ہو رہا ہے۔" اس نے اپنا سر تھامتے ہوئے کہا۔ م
نے جلدی سے بیٹھ کر اسے تھام لیا۔ اس کا دل ہائی سپیڈ مشین کی طرح دھڑک رہا تھ
بڑی نرم و نازک لڑکی تھی وہ۔ اوپر سے محبت کی مار نے اسے بالکل ہی بے دم کیا ہوا تھ
بڑی مشکل سے اس کے حواس بحال ہوئے۔ میں نے عاجزی سے کہا۔

"صغراں! حوصلے سے کام لے' اس طرح تو لوگوں کو شک پڑ جائے گا' چل اٹھ
کھڑی ہو جا' چل شاباش" وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کھڑی ہو گئی۔ میں اسے لے کر واپ
طرف بڑی۔ اچانک ایک طرف سے شور بلند ہوا کچھ لوگ ایک بڑی سی چارپائی کندھوں
اٹھائے برآمد ہوئے اور اسے بڑے آرام سے ایک درخت کے نیچے رکھ دیا۔ جلے ہو
گوشت کی بو سے دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے آنکھوں پر جبر کرتے ہوئے چارپائی پر نگا دوڑائ
ایک گرانڈیل لاش پوری چارپائی پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس شخص نے چوڑی دار پاجامہ
کوٹ پہن رکھا تھا۔ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں تھیں۔ سینے اور گردن پر بال ہی بال
اور چہرہ...... چہرے کی طرف دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بری طرح جلا ہوا تھا۔ میواتی عور
کی ایک جماعت اس لاش کے گرد بین کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ان کی گریہ زاری
کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں صغراں کو کھینچتی ہوئی اس منظر سے دور ہٹنے لگی۔ مگر اس ہ
میں زیادہ آگے نہیں جا سکی۔ اتفاقاً میری نگاہ پولیس کی گاڑیوں پر پڑ گئی تھی۔ وہ دو گا
تھیں اور ان کے اردگرد مسلح سپاہی ٹہل رہے تھے۔ اب اس جگہ ایک لمحہ بھی رکنا ہم
لئے خطرناک تھا۔ میں نے صغراں کو مخالف سمت میں کھینچا اور ہجوم کو چیرتی ہوئی
طرف بڑھنے لگی۔ کشتی ابھی تک اسی جگہ کھڑی تھی لیکن خالی نہیں تھی۔ چند آد
زخمی کو ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اس میں سوار ہو رہے تھے۔ بہرحال کشتی سے
کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ہم نہر کی ساتھ ساتھ اوپر کی طرف بڑھنے لگیں۔ تاریکی میں
قدم پر خوف کا پہرہ تھا اور ہر شجر کے پیچھے جیسے ایک حادثے نے گھات لگا رکھی

اونچے سرکنڈوں میں چلتی ہم کوئی دو فرلانگ آگے آئی تھیں کہ ایک موڑ پر اچانک ایک
سایہ ہمارے سامنے آ گیا۔ ہم ٹھٹھک کر پیچھے ہٹیں۔

"بب...... باجی' یہ میں ہوں یوسف" یوسف کی آواز سن کر میں سناٹے میں رہ
گئی' ظاہر ہے صغراں کا بھی یہی حال ہوا ہو گا۔ چند لمحوں کے لئے ہم کچھ بھی نہ بول
سکیں۔ پھر صغراں بے تابی سے یوسف کی طرف بڑھی لیکن چند قدم چل کر رک گئی۔ غالباً
اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔

"یوسف کہاں تھے تم؟" اس نے جذبات سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

یوسف نے قریب آ کر کہا "میں نے آپ کو پولیس کی گاڑیوں کے پاس سے مڑتے
دیکھ لیا تھا مگر...... مگر یہ ان باتوں کا موقع نہیں' آپ آئیں میرے ساتھ...... میں آپ کو
بتاتا ہوں سب کچھ۔"

وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ ٹخنے کے زخم کی وجہ سے وہ
بری طرح لنگڑا رہا ہے۔ اسے بولنے میں بھی خاصی دقت پیش آئی تھی۔ کچھ دیر چلنے کے
بعد وہ ہمیں درختوں کے درمیان ایک ہموار جگہ لے آیا۔ یہاں فربہ جسم اور چھوٹی چھوٹی
داڑھی والا ایک شخص موجود تھا۔ اس نے گھٹنوں تک لمبا ایک چوغہ پہن رکھا تھا۔ چوغے
کا رنگ اندھیرے میں تو نظر نہیں آیا لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ زرد تھا۔ چوغے والے کے
گلے میں کچھ مالائیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ یہ شخص کوئی پیر قسم کی چیز
ہے۔ یوسف نے اسے بڑے ادب سے "حضرت جی" کہہ کر مخاطب کیا اور بولا۔

"میں انہیں لے آیا ہوں جی۔"

چوغے والے نے ایک تیز گہری نظر ہم دونوں پر ڈالی اور پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔
ایک چھوٹا سا خشک نالہ پار کر کے وہ ہمیں اپنی کٹیا میں لے آیا۔ میرے لئے زندگی میں پہلا
موقع تھا کہ میں کسی پیر فقیر کی رہائش گاہ کو اندر سے دیکھ رہی تھی۔ ایک بے روغن کے
آہنی ٹرنک پر دو مٹی کے دیئے جل رہے تھے۔ جیسے ٹرنک کی بجائے قبر پر پڑے ہوں۔
ایک تکیہ' ایک گدیلا' ایک لالٹین جو جھونپڑی کے بانس سے لٹک رہی تھی' مٹی کا ایک
گھڑا۔ سلولائیڈ کا ایک پیالہ اور دو عدد لوٹے۔ قریباً یہی کل سامان تھا اس جھونپڑی کا۔
یوسف نے چوغے والے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے حضرت جی ہیں۔ مجھ سے پہلے اللہ بخشے ابا جی بھی ان کے ہاتھ پر بیعت تھے۔"

چومنے والے نے یوسف کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا "بی بیو! تمہارے بارے میں اس نے مجھے بتا دیا ہے۔ یہاں تم تینوں آرام سے رات گزار سکتے ہو' گھبرانے اور خوف کھانے کی کوئی بات نہیں۔ سونا ہے تو آرام سے سو جاؤ' ورنہ وہ لوٹے پڑے ہوئے ہیں وضو کر لو اور نفل پڑھو' تہجد کا وقت بھی بس ہونے ہی والا ہے۔" مجھے یہ شخص روایتی پیروں فقیروں سے بہت مختلف نظر آ رہا تھا۔ اس کے لمبے کھچڑی بال شانوں تک تھے اور آنکھوں میں آسودہ سی چمک تھی۔ ماتھے کے محراب اور پیشانی کی شکنوں نے اسے ایک محترم شخصیت کا روپ دے دیا تھا۔

اس کے بزرگانہ لہجے نے صغراں کو ایک بار پھر سسکنے پر مجبور کر دیا۔ اسے روتا دیکھ کر یوسف کے مرشد نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور یوسف سے بولا۔

"اوے 'کھوتے' تو نے کیا تکلیف دی ہے میری بیٹی کو' کیوں رو رہی ہے یہ؟"

یوسف نے کہا "حضرت جی! جلدی کی وجہ سے میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکا تھا اگر اب اجازت ہو تو......؟"

"ہاں ہاں سنا' یہ کیا کہانی ہے؟"

جواب میں یوسف نے مختصراً الفاظ میں شروع سے آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ باز کا ہاتھ آنا' پڑوسی اصغر اور بندے شاہ کا باز خریدنے پر جھگڑا' اختر زماں وغیرہ کا پیچھے لگنا اور یوسف کا صغراں کو باز سونپ کر خان رحیمی کی کوٹھی میں جا چھپنا۔ پھر اس کے بعد کے واقعات اور آخر میں یوسف کا عاطف بخاری کے ساتھ میواتیوں کے گاؤں کی طرف روانہ ہونا' اس نے سب کچھ پیر صاحب کے گوش گزار کر دیا۔ غالباً وہ ان سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ جب وہ اپنی روائیداد کے اس مرحلے پر پہنچا جہاں وہ عاطف بخاری کے ساتھ میواتی گاؤں کی طرف روانہ ہوا تھا تو میں اور صغراں زیادہ توجہ سے اس کی بات سننے لگیں کیونکہ اس کے بعد کے واقعات کا ہمیں علم نہیں تھا۔ یوسف نے کہا۔

"وہ گنجے سروالا باؤ مجھے لے کر میواتی گاؤں میں پہنچا تو یہاں اور ہی تماشا نظر آیا۔ پوری بستی چودھری کے گھر کے سامنے جمع تھی۔ احاطے کی چار فٹ اونچی چار دیواری کے

اندر الاؤ دہک رہا تھا اور چارپائیاں بچھی تھیں۔ چارپائیوں اور کرسیوں پر کم از کم تیس آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں زیادہ تر مسلح تھے۔ سب اونچی اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ چودھری جسے یہاں کے سارے میواتی صلو بھائی کہتے ہیں کچھ پریشان نظر آ رہا تھا۔ آخر اس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "دیکھو بھائی! تم سب بڑے بڑے لوگ ہو۔ کوئی زمیندار ہے' کوئی جاگیردار ہے' کوئی شہر کا سیٹھ ہے اور کوئی خان رحیمی کی طرح جنگل کا سیٹھ......... میں تم سب میں چھوٹا آدمی ہوں پر تمہارا میزبان ہوں۔ اس وقت میرا حق ہے کہ تم میری بات سنو...... دیکھو میرے بھائیو! بات یہ ہے.........."

ایک دم شور بلند ہوا اور سب بلند آواز سے چیخ و پکار کرنے لگے۔ ایک موقع پر تو لگا کہ وہ ایک دوسرے کے گلے پڑ جائیں گے۔ پھر خان رحیمی نے اٹھ کر کہا کہ یہ جگہ بات کرنے کے لئے ٹھیک نہیں اس لئے مکان کے اندر چلو۔ سب لوگ اٹھ کر چودھری صلو کی بیٹھک میں چلے گئے۔ بخاری کے کہنے پر میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس نے بتایا کہ صلو بھائی کے سالے نے ایک قیمتی باز پکڑا ہے۔ کئی شکاری اس باز کی تلاش میں تھے۔ ان سب کو پتہ چل گیا ہے اور اب وہ باز خریدنے کے لئے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ (صلو بھائی کا سالا وہی ٹھگنے قد والا بالو تھا' مجھے حیرانی ہوئی کہ چودھری کا رشتے دار ہونے کے باوجود وہ بھیک مانگتا تھا' غالباً اس بھیک کو وہ اپنے فن کی داد سمجھتا تھا) یوسف نے اپنی روئیداد کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "ہم سب وہاں کھڑے رہے اور صلو بھائی کی بیٹھک کے اندر گرما گرم باتیں ہوتی رہیں۔ پھر پتہ چلا کہ معاملہ طے ہو گیا ہے۔ سب نے مل کر نیلامی کا فیصلہ کیا ہے۔ جو بھی زیادہ بولی دے گا باز اٹھا لے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ باز بیٹھک کے اندر پہنچ چکا ہے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بیٹھک کے اندر سے پھر لڑائی جھگڑے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے بعد گولی چلنے کی آواز آئی۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا اور کئی آدمی ایک دوسرے سے گتھم گتھا باہر آ گرے۔ پھر میں نے ایک لمبے شخص کو دیکھا وہ چار دیواری کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ میں ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا مگر میرا خیال ہے کہ وہ باز کا پنجرہ تھا۔ چار دیواری کے قریب اسے سات آٹھ میواتیوں نے گھیر لیا۔ ان سب کے پاس لاٹھیاں اور بلم تھے۔ وہ شخص بڑا جی دار تھا' زور آور بھی خوب تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی چیز چار دیواری

سے باہر پھینک دی۔ جہاں سے اسے فوراً کسی دوسرے بندے نے اٹھا لیا۔ لمبے قد و...
میواتیوں سے بھڑ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس نے دو میواتیوں کے پیٹ میں چھ...
مارا۔ اتنے میں اور میواتی آ گئے۔ پھر تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کیا ہو
رہا ہے۔ سارے گاؤں والے تتر بتر ہو گئے۔ میں بھی ایک بیل گاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔
پھر پتہ نہیں کیسے چودھری صلو کا بھینس خانہ جلنے لگا' اس کے چھپروں کو آگ لگ گئی تھی۔
دیکھتے ہی دیکھتے ایک پورا محلہ جلنے لگا۔ ادھر فائرنگ بھی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے خا...
رحیمی کی بڑی سفید جیپ کو دیکھا' وہ بڑی تیزی سے ایک لال کار کے پیچھے بھاگی' پھر پتہ
نہیں کیا ہوا وہ ایک دم مڑی اور ایک گھر کی کچی دیوار توڑ کر صحن میں جا گھسی۔ ہر طرف
چیخ و پکار ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں بیل گاڑی کے پیچھے سے اٹھ کر بھاگ جاؤں مگر
ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ لگاتار گولیاں چل رہی تھیں۔

چودھری صلو کے گھر کے سامنے چار پانچ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ گاڑیاں چھ سات
میل کا چکر کاٹ کر نہر کے پل کی طرف سے آئیں تھیں کیونکہ اس میواتی گاؤں تک گاڑ...
...نے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاڑیاں ایک ایک کر کے وہا...
غائب ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی گولیاں چلنا بھی رک گئیں۔ گاؤں کے لوگ بالٹیاں
گھڑے اور کنستر وغیرہ لے کر نہر کی طرف بھاگے اور آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگے
میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ اپنے ہاتھوں سے میں نے دو بچوں کو آگ سے نکالا ہے۔
دیکھئے میرے ہاتھ"...... یوسف نے اپنے ہاتھ روشنی کی طرف کر دیئے۔ کئی جگہ...
کھال جلی ہوئی تھی جس پر اس نے نمک تیل لگا رکھا تھا۔ پھر وہ بولا "چودھری صلو...
لاش میرے سامنے ایک دیوار کے نیچے سے نکالی گئی ہے۔ اس کی بھینس خانے کی کم از...
چار بھینسیں جل گئی ہیں اور بکریوں کا تو کوئی حساب ہی نہیں" یوسف نے جھرجھری لے...
آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ جلتی اور ممیاتی ہوئی بکریوں کو آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا...

میں نے پوچھا "بخاری کا کیا ہوا' وہ بھی تو تیرے ساتھ تھا؟"

"مر گیا وہ بھی" یوسف نے کہا "میں خود اس کی لاش دیکھ کر آ رہا ہوں اس...
گردن میں سامنے گولی لگی ہے جو گردن کے پیچھے سے نکل گئی ہے۔ جب گولیاں...
شروع ہوئیں تو وہ مجھے بھول کر اندر کی طرف بھاگا تھا۔ اس کے بعد جب چودھ...

...بھینس خانے کو آگ لگی تو میں نے اسے ایک میواتی سے گتھم گتھا دیکھا۔ اس کے بعد پتہ
...نہیں چلا کہ وہ کہاں گیا اور کس نے اسے گولی ماری۔"

جھونپڑی کے اندر گہرا سناٹا طاری ہو گیا۔ ہم میں سے ہر کوئی اس واقعے کی بے پناہ
...ت محسوس کر رہا تھا۔ یوسف نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے وہ کچھ
...زیادہ متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"باز کا کچھ پتہ چلا؟"

یوسف نے کہا "یہاں چودھری صلو کے کارندے اور دوسرے لوگ جو باتیں کر
رہے ہیں ان سے پتہ چلا ہے کہ سارا معاملہ ایک غنڈے بابری کی وجہ سے خراب ہوا
ہے۔ یہ شخص کچھ ہی عرصہ پہلے کسی دوسرے علاقے سے آیا ہے اور بڑا ہتھ چھٹ اور
...مشہور ہے۔ ان دنوں یہ شخص ضلع بھکر کے ایک مالدار شخص شاہ دین ٹوانہ کے لئے
...کام کر رہا ہے۔ ٹوانہ کو جانتے ہیں آپ؟"

یوسف اپنی بات روک کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے نفی
میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا "اچھا اس کے بارے آپ کو پھر بتاؤں گا...... ابھی کچھ دیر پہلے
چودھری صلو کی بیٹھک میں جو "اکٹھ" ہوا تھا اس میں شاہ دین ٹوانہ اور اس کا غنڈہ بابری
بھی بیٹھے تھے۔ نیلامی کی بولی سے پہلے ہی بابری کا چودھری صلو سے جھگڑا ہو گیا۔ بابری نے
بڑی ہوشیاری سے چودھری کے ایک کارندے کو نہتا کر کے چودھری کو چارپائی سمیت اٹھا
...پھر وہاں ایسی کھلبلی مچی کہ کسی کو کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ جس لمبے شخص کو میں نے
...میواتیوں سے لڑتے دیکھا تھا وہ بابری ہی تھا۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک شخص گھبرایا ہوا جھونپڑی میں داخل ہوا۔ یہ
باریش نوجوان تھا۔ اس نے بڑے ادب سے چوغے والے کو سلام کیا اور دو زانو ہو
...کر "حضرت جی! ڈی ایس پی کی ہدایت پر پولیس نے ناکہ بندی کر کے گھر گھر تلاشی
شروع کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس طرف بھی آئیں۔"

چوغے والے نے پوچھا "کون سا ڈی ایس پی ہے؟"

باریش نوجوان نے کہا "میرا خیال ہے جھنگ والے چودھری صاحب کا بھائی اشفاق
...احمد ہے" چوغے والے نے کہا "ٹھیک ہے جاؤ" وہ ادھر نہیں آئے گا آیا بھی تو میں

بات کر لوں گا" وہ جانے لگا تو چونے والے نے کہا ٹھہرو۔

بارلیش نوجوان الٹے پاؤں چلتا چلتا پتھر کی طرح ساکت ہو گیا "جی حضرت جی!" اس نے جھک کر کہا۔

"جاؤ دیکھ کر آؤ کہ اُچی پلی والا راستہ صاف ہے اگر صاف ہے تو مجھے آکر بتاؤ"

بارلیش نوجوان ادب سے سلام کر کے باہر چلا گیا۔"

چونے والے حضرت جی پورے حالات سے آگاہ ہو چکے تھے انہیں صغراں اور یوسف کی کہانی کا تو پہلے ہی سے علم تھا میرے بارے میں بھی یوسف انہیں کافی کچھ بتا چکا تھا۔ انہوں نے یوسف کا کان پکڑتے ہوئے کہا "تو بڑا نالائق ہے یوسفے ' صغراں کی جگہ تیری ماں بہن اس طرح رات گھر سے باہر رہتی تو کیا کرتا تو؟ بدبخت تجھے ذرا احساس نہیں دیکھ بیچاری کا رو رو کر کیا حال ہو رہا ہے چل اسی وقت اسے گھر چھوڑ کر آ۔"

یوسف دم بخود سر جھکائے بیٹھا تھا اس کا کان ابھی تک حضرت جی کے ہاتھ میں تھا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "بیٹی تو تو بڑی سیانی لگتی ہے پڑھی لکھی بھی ہے تجھے چاہئے تھا اس بیچاری کو گھر پہنچاتی تو اسے لے کر ادھر نکل آئی۔"

میں نے کہا "حضرت جی مجھے مہلت ہی نہیں ملی ان غنڈوں اور پولیس میں گولی چلنے لگی ہم بھاگ کر نہر پر پہنچیں اور ایک بیڑی میں چھپ گئیں ابھی میں اس سے اتنا ہی پوچھ رہی تھی کہ بیڑی ہمیں لے کر ادھر روانہ ہو گئی میں تو حضرت جی خود بہت پریشان تھی پتہ نہیں اس کے گھر والوں پر کیا گزری ہو گی؟"

صغراں گھٹنوں پر منہ چھپائے مسلسل روتی جا رہی تھی حضرت جی نے کہا "چپ کر دھی رانی اللہ خیر کرے گا اللہ سے خیر مانگ چپ کر جا اچھا چل میں خود جاتا ہوں تیرے ساتھ۔ تیرے گھر چھوڑ کر آؤں گا۔ کچھ نہیں ہوا ہے تجھے ڈلے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا" صغراں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے وہ کسی ننھی بچی کی طرح ہچکیوں سے رونے لگی اسی دوران حضرت جی کا بھیجا ہوا بندہ واپس آیا اور اس نے بتایا کہ اچی پلی والا راستہ صاف ہے ادھر تاکہ نہیں لگا ہے۔ حضرت جی چونہ سنبھال کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور بارلیش نوجوان سے بولے "نذیر محمد! تو جلدی سے دو گھوڑیاں لے آ مولوی یٰسین سے چل فٹافٹ آ۔" نذیر محمد سر جھکا کر باہر نکل گیا حضرت جی نے یوسف کو ٹھوکر مار کر کہا

"چل کم بختا اٹھ تو بھی ساتھ چل ہمارے کھوتا کہیں کا۔" صغراں کے آنسو خشک ہو چکے تھے وہ کبھی چور نظروں سے یوسف کی طرف دیکھ لیتی تھی بڑی پیاری جوڑی تھی ان دونوں کی۔ یوسف ساتھ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا حضرت جی اپنی پگڑی باندھنے لگے اتنے میں دروازے سے باہر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی میرا دل دھک سے رہ گیا اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ پولیس کے آدمی ہیں پھر کسی نے دھیمی آواز میں حضرت جی کو پکارا بولنے والا کوئی رعب دار شخص لگتا تھا۔

"کون ہے؟" حضرت جی نے اندر سے پوچھا۔

"حضرت جی میں ڈی ایس پی اشفاق ہوں اندر آسکتا ہوں؟"

"ٹھہرو میں خود باہر آتا ہوں" حضرت جی نے جواب دیا۔

وہ پگڑی لپیٹ کر باہر نکلے "کیا بات ہے گوندل؟" ان کی آواز آئی۔ ڈی ایس پی گوندل نے کہا "حضرت جی آپ کو پتہ چلا ہی ہو گا میواتی گاؤں میں کیا قیامت ٹوٹی ہے؟"

"ہاں بڑا افسوس ہوا ہے یہ سن کر پتہ نہیں ہمارے اس علاقے میں کیا مصیبت آگئی ہے۔"

ڈی ایس پی اور حضرت جی اس واقعے کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ڈی ایس پی کا انداز مودبانہ تھا کچھ دیر بعد وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا خوف کا ہاتھ ایک بار پھر مجھے چھو کر گزر گیا تھا حضرت جی نے اندر آکر کہا "چلو یہ بھی اچھا ہوا اب اس طرف کوئی نہیں آئے گا" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے تم آرام سے یہاں بیٹھو تہجد کا وقت ہو گیا ہے۔ بہتر ہے کہ نماز پڑھ لو۔ میں اس لڑکی کو چھوڑ کر سورج نکلنے تک آ جاؤں گا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

بارلیش نوجوان جسے حضرت جی نے نذیر محمد کہا تھا گھوڑیاں لے آیا تھا۔ صغراں نے میری طرف الوداعی نظروں سے دیکھا اور اپنا معصوم چہرہ اوڑھنی میں چھپا کر یوسف کے ساتھ باہر نکل گئی۔ حضرت جی چلے گئے اچانک مجھے ایک بات یاد آئی میں نے جھونپڑی کے دروازے سے یوسف کو آواز دی وہ گھوڑیوں کی طرف جاتے جاتے رک گیا میں نے اسے پاس بلایا قریب آکر وہ سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا میں نے کہا تمہارا راستہ تو وہی ہے اگر ہو سکے تو اس کھیت میں دیکھ لینا۔

وہ سمجھ گیا کہ میرا اشارہ رقم والے پرس کی طرف ہے۔ سرہلا کر بولا "آپ بے فکر رہیں باجی مجھے سب یاد ہے بس دعا کریں میرے پہنچنے سے پہلے کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔"

"میں نے کہا اللہ خیر کرے گا ابھی کافی اندھیرا ہے" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھوڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

حضرت جی اور یوسف کی واپسی قریباً آٹھ بجے صبح ہوئی وہ صغراں کو اس کے گاؤں چھوڑ آئے تھے۔ معلوم نہیں یہ حضرت جی کی کاوش کی برکت تھی یا صغراں کی اپنی خوش بختی کا کرشمہ کہ اس گھر میں سب کچھ معمول کے مطابق ملا تھا۔ دراصل گھر میں کسی کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ صغراں رات بھر اپنے بستر سے غائب رہی ہے اور کئی میل کی خاک چھان کر علی الصبح گھر لوٹی ہے۔ جب حضرت جی اسے ساتھ لے کر گھر چھوڑنے گئے تو گھر کا بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صغراں کا والد یوسف کا ماموں فجر کی نماز پڑھنے مسجد گیا ہوا تھا باقی اہل خانہ محو خواب تھے صغراں خاموشی سے اندر چلی گئی۔

یوسف نے مجھے کانپتے لہجے میں بتایا کہ رقم والا پرس اسے مل گیا ہے وہ پرس اس نے وہیں کھیت میں ایک محفوظ جگہ مٹی میں دبا دیا تھا۔

میں حضرت جی کو اپنی پر غم روئیداد سنا کر کچھ رہنمائی حاصل کرنا چاہتی تھی مگر اس کا موقع نہیں ملا۔ واپس آنے کے بعد حضرت صاحب نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا سادہ سا کھانا تھا مکی کی روٹی گڑ کی چائے اور شلجم کا سالن اس کے بعد وہ بیٹھے ہی تھے کہ ایک بیجارو جیپ آ گئی اس میں سے چند افراد اترے اور حضرت جی کو بصد احترام و اصرار اپنے ساتھ لے گئے۔ حضرت جی کے جانے کے بعد ان کے باریش مرید نذیر محمد نے بتایا کہ وہ شور کوٹ چلے گئے ہیں اور اب دو تین روز بعد ہی آئیں گے ہم دونوں یہ سن کر حیران رہ گئے دراصل شور کوٹ میں حضرت جی کا کوئی نیازمند الیکشن میں حصہ لے رہا تھا وہ اپنی انتخابی مہم کا آغاز کرنے سے قبل حضرت جی کے دستِ مبارک سے کوئی فیض حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حضرت جی سے میری شناسائی چند گھنٹے سے زیادہ پرانی نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں ان کی روانگی نے مجھے ایک دم اداس سا کر دیا مجھے لگا جیسے میں اپنے کسی بزرگ کے سائے سے محروم ہو گئی ہوں۔ اس احساس کی غالباً دو وجوہات تھیں ایک تو محترم بزرگ کی

شخصیت اور دوسرے میرے حالات جنہوں نے ہر طرف سے یورش کر کے مجھے دوا کی تفسیر بنا دیا تھا۔ الیکشن کے ذکر پر میرا دھیان خود بخود وہاب کی طرف چلا گیا۔ میری اطلاعات کے مطابق اب اپنے مقتول بھائی کی جگہ وہ خود الیکشن میں حصہ لے رہا تھا اس نے واصف کے قتل میں چودھری شباب کو ملوث کر کے اپنی انتخابی مہم کو ایک اور ہی رُخ دے دیا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ انسان کے بھیس میں وہاب جیسا درندہ اپنے حلقے کا نمائندہ بن گیا تو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ساتھ یہ کتنا سنگین مذاق ہو گا۔ وہ جنونی شخص جو ایک معصوم بچے کو تڑپا تڑپا کر مار سکتا ہے اختیار کا قلمدان سنبھال بیٹھا تو کس کس کی تقدیر میں جاں سوز عذاب نہیں لکھے گا۔ کاش تاریکی کی یہ پیش قدمی کسی طرح رک جائے۔

اس شام جب نذیر محمد تین میواتیوں کے جنازے میں شریک ہونے کے بعد قریبی گاؤں سے ہمارے لئے کھانا لینے گیا ہوا تھا اور میں اور یوسف جھونپڑی کے ملگجے اجالے میں پاس پاس بیٹھے تھے میں نے یوسف سے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے؟"

وہ بولا "باجی پھیرو ہمیں مل سکتا ہے اب بھی مل سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا "میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں شاہ دین ٹوانہ کو جانتا ہوں" میں نے اثبات میں جواب دیا۔

"ہاں بتایا تو تھا۔"

وہ بولا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ کیسے جانتا ہوں۔"

"ہاں، نہیں بتایا تھا" میں نے قدرے جھلا کر کہا۔

اس نے ہونٹ کے زخم کو انگلی سے دھیرے دھیرے چھونا شروع کیا اور بولا، پچھلے برس انہی دنوں میں شاہ دین اپنے سب سے چھوٹے بھائی کی بارات لے کر ہمارے گاؤں آیا تھا۔ بڑی دھوم کی شادی تھی وہ۔ زمیندار مرزا اسماعیل نے بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی پورے چار دن اس نے بارات کو اپنے گھر ٹھہرایا وہ دعوتیں ہوئی تھیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ ایسی شادی نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ بارات میں عورتیں بھی تھیں۔ ایک روز عورتیں زمیندار اسماعیل کا باغ دیکھنے کے لئے گئیں وہاں کہیں شہد کا چھتا لگا ہوا تھا کسی

نے مکھیاں چھیڑ دیں عورتیں چیخیں مارتی ہوئی ادھر ادھر بھاگیں۔ ان میں سے ایک بڑی عمر کی عورت جو شاہ دین کی بیوی تھی گھبرا کر دوڑی تو نہر میں گر گئی۔ میں اس وقت یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ عورت غوطے کھانے لگی تو میں بھاگ کر گیا اور نہر میں چھلانگ لگا دی وہ کافی بھاری بھرکم تھی مگر میں نے کسی نہ کسی طرح اسے نکال ہی لیا۔ وہ رو رو کر مجھے گلے لگانے لگیں اور کہنے لگیں کہ اگر اس کا اپنا بیٹا زندہ ہوتا تو بالکل میرے جتنا ہوتا۔ وہ چند دن ہمارے گاؤں رہی صبح شام میری تعریفیں کرتی رہی۔ جاتے جاتے اس نے مجھے زبردستی پانچ سو روپے بھی دیئے۔ پندرہ بیس دن بعد وہ پھر گوپور آئی تو سیدھا ہمارے گھر پہنچی اور بڑی دیر تک بیٹھی رہیں چند سال پہلے اس کا بیٹا گم ہو گیا تھا وہ بڑی دکھی تھی وہ مجھے اپنے سامنے بٹھا کر دیکھتی رہتی اور کہتی کہ میری آنکھیں بالکل اس کے بیٹے سے ملتی ہیں۔

پچھلے محرم میں تو وہ پورے بیس دن ہمارے گاؤں میں رہی میری ماں سے کہنے لگی کہ یہ بیٹا مجھے دے دو میری ماں نے کہا میرے پاس یہی تو ایک جینے کا سہارا ہے دو بچے ہوتے تو تمہاری بات کبھی نہ ٹالتی۔ پھر اس کے پیچھے اس کا شوہر شاہ دین خود آ گیا وہ اسے سمجھا بجھا کر واپس لے گیا۔"

یوسف کی پوری بات سننے کے بعد میں نے پوچھا تم کہنا کیا چاہتے ہو کیا تمہارا خیال ہے کہ بیوی کے کہنے پر شاہ دین وہ باز ہمیں دے دے گا؟"

وہ بولا "میرا یہ مطلب نہیں لیکن مجھے پکا یقین ہے کہ اگر ہم بھکر میں شاہ دین کے فارم پر پہنچ جائیں تو کوئی نہ کوئی رستہ نکل آئے گا ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا مطلب ہے جو آپ نے کہا ہے کہ وہ عورت ہمیں باز ہی لے دے ستر اسی ہزار روپیہ ان لوگوں کے لئے کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ میں نے یوسف سے کہا "کیا تم اب بھی یہی رہے ہو کہ وہ باز ستر اسی ہزار کا ہے!"

وہ کچھ چونک گیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "کبھی کبھی مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ اس سے بھی مہنگا باز ہے جس طرح یہ لوگ اس کے لئے گولیاں چلا رہے ہیں بندے مار رہے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

مجھے احساس ہوا کہ میرے منہ سے ایک غلط بات نکل گئی ہے کہ کم از کم ابھی یوسف سے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے تھی وہ تجسس سے بولا "باجی آپ کا کیا خیال

کتنی قیمت ہے اس کی؟"

میں نے بات بدل کر کہا "قیمت تو اس کی ستر اسی ہزار ہی ہوگی مگر آپس کی ضد کی وجہ سے وہ اس کی زیادہ قیمت دینے پر بھی تیار ہیں۔ ان کے آپس کے لڑائی جھگڑے بھی اسی ضد کی وجہ سے ہیں ضد بڑی بری چیز ہوتی ہے یوسف!" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا "باجی کچھ بھی ہے مجھے یقین ہے کہ اگر میں شاہ دین فارم پہنچ جاؤں تو وہ پکھیرو مجھے مل سکتا ہے۔"

میں نے کہا "دیکھ یوسف میں تجھے یہ مشورہ ہرگز نہیں دے سکتی اس کام میں بہت خطرہ ہے۔"

وہ غیرجذباتی لہجے میں بولا "خطرے کی بات چھوڑیں جی یہ تو ایک سودا ہے آپ نے مجھے پینتیس ہزار روپیہ دینا ہے اور میں نے آپ کو پکھیرو۔"

"یوسف پینتیس ہزار جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتے۔"

"باجی آپ سمجھنے کی کوشش کریں اچھا ایسا کریں آپ مجھ پر بھروسہ کریں میں آپ کو پکھیرو لے کر دوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے قسمت آزمانا چاہتے ہو تو آزما لو۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں میں آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"بس باجی آپ سیانی ہیں آپ نے دنیا دیکھی ہے۔ میں تو کبھی جھنگ سے آگے نہیں گیا آپ ساتھ ہوں گی تو مجھے بڑا حوصلہ رہے گا۔ میں نے سب سوچ لیا ہے میں آپ کو اپنی بہن بنا کر ساتھ لے جاؤں گا۔ عابدہ بی بی آپ کو دیکھ کر بڑا خوش ہوں گی اس نے ان کی دیکھی ہوئی ہے میری بہن۔"

میں نے پوچھا "یہ عابدہ بی بی کون ہے؟"

وہ بولا "وہی شاہ دین کی بیوی اس کا نام عابدہ ہے" مجھے حیرانی ہوئی کہ یوسف اس عورت کا نام ایسی لاپرواہی سے لے رہا ہے۔ میں ساتھ جانے کے سلسلے میں باآسانی یوسف سے انکار کر سکتی تھی مگر پتہ نہیں کیوں میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی سی پیدا ہو گئی تھی وہ کسی حد تک ڈھیٹ اور ضدی لڑکا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ اب بھکر جا کر رہے گا

شاہ دین ٹوانہ کے بارے میں میں نے جو کچھ اب تک سنا تھا اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ اچھا شخص نہیں اس کے غنڈے بابری کا ذکر بھی میں سن چکی تھی آدھی شب کے وقت کشتی میں میواتی گاؤں کی طرف آتے ہوئے کشتی والے جو باتیں کر رہے تھے ان میں بھی بابری کا نام آیا تھا۔ کشتی والوں کے خیال میں وہ ایک خطرناک اور نڈر غنڈہ تھا میں صاف طور پر اندازہ لگا سکتی تھی کہ شاہ دین فارم میں جا کر یوسف اپنے لئے خطرات مول لے گا دوسری طرف اس کا اعتماد بھی مجھے شک میں ڈال رہا تھا نہ جانے اس کے ذہن میں کیا بات تھی جو وہ باز کے حصول کے بارے اتنا پُرامید تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اسے اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے یوسف میں تیرے ساتھ چلوں گی کب چلنا ہے تجھے؟" وہ بولا "میرا تو خیال ہے کل منہ اندھیرے نکل چلیں ایک دفعہ پہلے بھی میں جا چکا ہوں کم از کم پانچ چھ گھنٹے لگیں گے فارم تک پہنچتے پہنچتے۔"

میں نے کہا "اگر صبح سویرے جانا ہے تو پھر ایسا کر وہ پرس کھیت سے نکال لا کتنا فاصلہ ہے یہاں سے کھیت کا۔"

"باجی فاصلہ تو تین چار میل ہے نہر تیر کر پار کر جاؤں تو اس سے بھی کم ہے مگر میرا خیال ہے رقم وہاں بالکل محفوظ ہے ابھی اسے ادھر رہنے دیں۔ خرچ کے لئے میرے پاس پیسے ہیں چار سو روپیہ ہم دونوں کے لئے کافی نہیں ہوگا کیا؟"

میں نے غور سے یوسف کی طرف دیکھا شاید وہ رقم کے سلسلے میں مجھ پر بھروسہ نہیں کر رہا تھا۔

اگلے روز بذریعہ بس ہم بھکر کی طرف روانہ ہوئے۔ بھکر کے مضافات میں شاہ دین ٹوانہ کا وسیع و عریض ڈیری فارم تھا۔ شاہ دین کی رہائش بھی اس فارم کے ایک حصے میں تھی یوسف کی معلومات کے مطابق شاہ دین کی تین بیویاں تھیں جنہیں اس نے علیحدہ علیحدہ مکانوں میں بسا رکھا تھا جیسا کہ میں نے بتایا ہے یوسف ایک دفعہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا وہ مجھے کسی خاص دشواری کے بغیر شاہ دین فارم پر لے آیا۔ بیرونی گیٹ پر ہمیں مسلح چوکیدار نے روک لیا یوسف نے بتایا کہ ہم عابدہ بی بی کے مہمان ہیں چوکیدار باز پرس کرنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرے شخص نے یوسف کو پہچان لیا اور چوکیدار کو

کہ یہ لڑکا پہلے بھی عابدہ بی بی سے ملنے آ چکا ہے ہمیں فارم کے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ فارم جتنا وسیع تھا اتنا ہی صاف ستھرا تھا کہیں گوبر یا کوڑے کی آلائش تک نہیں تھی ایک حصے میں بہت سے فوارے لگے تھے اور کالی سیاہ بھینسیں قطار در قطار ان کے نیچے کھڑی نہا رہی تھیں۔ سفید لباس والے پڑھے لکھے ملازم مویشیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھے فارم کے ایک شیڈ تلے دودھ کی ترسیل میں کام آنے والی گاڑیاں کھڑی تھیں ڈیری فارم کا ہر شعبہ جدید خطوط پر استوار نظر آتا تھا۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے ایک کارندے کو آواز دے کر کہا ہم دونوں کو شیر محمد کے سپرد کر دیا جائے۔ کارندے نے اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں ایک طویل برآمدے میں پہنچا کر ایک ادھیڑ عمر باریش شخص کے حوالے کر دیا یہی شیر محمد تھا اس کے کندھے سے پستول لٹک رہا تھا وہ ہمیں لے کر سرو کے بلند و بالا درختوں کی ایک قطار سے گزرا اور فارم کے رہائشی حصے میں لے آیا۔ وہ بڑا نرم خو شخص تھا بہت دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ "آپ کو بڑی بی بی جی سے ملنا ہے سائیں!" اس نے پوچھا۔ یوسف نے ہاں میں جواب دیا وہ بولا آپ ایک دفعہ شاید اس سے پہلے بھی آئے تھے گوپور سے آئے ہیں نا آپ؟ یوسف نے اس دفعہ بھی اثبات میں سر ہلایا وہ بولا سائیں سنا ہے دو تین روز پہلے آپ کے علاقے میں بڑا نقصان ہوا ہے میواتیوں کے کسی گاؤں میں آگ شاگ لگ گئی ہے؟

یوسف نے کہا "ہاں جی ہم نے بھی سنا ہے چار بندے بھی مر گئے ہیں۔"

"بات کیا ہوئی تھی!" شیر محمد نے پوچھا اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ٹوہ لینے کی فکر میں ہے۔ میں نے یوسف کو کہنی ماری وہ کچھ کہتے کہتے بات بدل گیا۔ اس دوران ہم ایک ڈرائنگ روم نما کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ شیر محمد ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ بڑا لق و دق ڈرائنگ روم تھا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ہم ایک مضافاتی علاقے میں کھڑے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں جو چیز کثرت سے نظر آ رہی تھی وہ اسلحہ تھا۔ لگتا تھا یہاں کے باسیوں کو مختلف النوع اسلحہ جمع کرنے کا جنون ہے۔ مغلیہ دور کے خنجروں اور تلواروں سے لے کر جدید آٹومیٹک رائفلوں تک سب کچھ دیواروں پر آویزاں تھا۔ ہم صوفوں پر بیٹھ گئے ایک ملازمہ نے اندر جا کر ہمارے آنے کی اطلاع دی چند ہی لمحے بعد ایک عورت بھاگتی اندر داخل ہوئی۔ اپنے لباس سے وہ گھر کی مالکن نظر

آئی تھی اس کا آدھا سر سفید تھا شکل و صورت میں سادی دیہاتنوں جیسی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے یوسف کو دیکھا اور دونوں بازو پھیلا کر اس کی طرف بڑھی۔

"میرا پتر' میرا پتر آیا" اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور لپک کر یوسف سے لپٹ گئی بڑی وارفتگی سے وہ یوسف کا منہ سر چومنے لگی۔ "میرا پتر' کہاں تھا تو ماں کی خبر ہی نہ کی آ میرا لال میرے سامنے بیٹھ ماں صدقے یہ تیرے ہونٹ پر کیا ہے ہائے میں مر گئی کس نے مارا ہے تجھے؟"

"کچھ نہیں تھوڑی سی چوٹ لگ گئی تھی" یوسف نے کہا۔

عورت نے یوسف کو شانوں سے پکڑ کر سامنے بٹھا لیا اور مضطرب انداز سے اس کی چوٹ کو دیکھنے لگی۔ اس وقت مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ عورت کی ذہنی حالت درست نہیں اس کی آنکھوں میں ممتا دیوانگی بن کر جھلک رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ یوسف کی چوٹ کی طرف سے مطمئن ہو گئی۔ پٹی کی وجہ سے اسے زخم کی نوعیت کا پتہ نہیں چلا تھا مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی "بالکل میرا اسلم ہے وہی جسم وہی ناک نقشہ اور آنکھیں تو ہیں ہی اسلم کی" وہ یوسف کی آنکھوں کو چومنے لگی پھر جیسے اچانک اسے میری موجودگی کا احساس ہوا" پتر یہ کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ یوسف نے کہا "میری بہن ہے وہی جس کے بارے میں ماں نے تجھے بتایا تھا" اچھا اچھا رانی ہے" وہ لپک کر میری طرف آئی اور میرا سر چومنے لگی یوسف کی آمد نے اسے خوشی سے دیوانہ کر رکھا تھا۔ ایک ملازمہ نے خشک لہجے میں کہا "بس بی بی جی اب اندر چلیں ڈاکٹر نے آپ کو زیادہ بولنے سے منع کیا ہوا ہے۔"

عابدہ روہانسی آواز میں بولی "رشیداں کچھ تو خدا کا خوف کر دیکھ اتنے دن بعد میں نے اپنے پتر کی شکل دیکھی ہے مجھے کچھ دیر اس کے پاس تو بیٹھ لینے دے۔"

ملازمہ رشیداں نے کہا "بی بی عابدہ' شاہ جی آنے والے ہیں کیوں مجھے بھی جھاڑ پڑوانی ہے۔ چلیں اپنے کمرے میں۔ شاہ جی ہو کر چلے جائیں تو پھر بیٹھ رہنا یہاں۔" اس نے عابدہ کو کندھوں سے تھام کر اٹھایا اور اپنے ساتھ چلاتی ہوئی باہر لے گئی۔ عابدہ دکھ بھرے انداز میں مڑ مڑ کر یوسف کی طرف دیکھ رہی تھی اور کہہ رہی تھی "چپے نہ جانا یوسفے میں ابھی پھر آتی ہوں' ہاں ابھی آتی ہوں۔" تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہ پھر ہمارے پاس

آئی۔ پتہ چلا کہ شاہ صاحب آدھ پون گھنٹہ عابدہ بی بی کے ساتھ گزارنے کے بعد اپنی نئی بیوی کی طرف جا چکے ہیں جونہی عابدہ بی بی ہمارے پاس پہنچی ملازمہ نے پر تکلف کھانا سامنے سجا دیا بھوک ہم دونوں کو بہت لگی تھی عابدہ اپنے ہاتھ سے نوالے بنا بنا کر یوسف کو دینے لگی مجھے یہ منظر عجیب سا لگا مگر یوسف شاید پہلے بھی ایسے مرحلوں سے گزر چکا تھا وہ اطمینان سے نوالے لیتا رہا۔ میرے سر میں سفر کی وجہ سے سخت درد ہو رہا تھا میں کھانے کے بعد دوسرے کمرے میں جا کر سو رہی۔

رات کسی وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا ساتھ والی چارپائی پر پھولدار چادر بچھی تھی اور سنہری جھالر والا تکیہ رکھا تھا چارپائی پر عابدہ دونوں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اس کی گود میں یوسف کا سر تھا وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑے لاڈ سے باتیں کر رہی تھی۔ ان کی آوازیں مدھم تھیں اس لئے مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا یکایک یوسف نے اس کی گود سے سر نکالا اور بھڑک کر بولا۔

"ٹھیک ہے نہیں تو نہ سہی میں بھی تجھے شکل نہیں دکھاؤں گا بس ابھی جا رہا ہوں میں۔"

عابدہ کا رنگ زرد ہو گیا اس نے تڑپ کر یوسف کا بازو پکڑ لیا نہ "میرا پتر ایسی بات نہ کر اللہ دی قسمے نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

"تو پھر میری اتنی سی بات تو نہیں مان سکتی۔"

عابدہ جلدی سے بولی "ٹھیک ہے میرا پتر تو بیٹھ جا بیٹھ جا میں سویرے شاہ جی سے بات کرتی ہوں۔"

"بات نہیں کرتی" یوسف جھلا کر بولا "مجھے پھیرو لا کر دیتا ہے پھیرو۔"

عابدہ عاجزی سے بولی "مگر پتر میں نے کبھی چوری نہیں کی میں کیسے کروں گی یہ سب کچھ!"

یوسف اٹل لہجے میں بولا "تو اسے چوری سمجھتی ہے یہ تیرا اپنا گھر ہے۔"

"مگر یوسف ...."

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے تو کرتی رہ اگر مگر میں جا رہا ہوں غلطی سے آگیا تھا تیرے

116168

پاس۔"

یوسف جلدی سے میری طرف بڑھا جیسے مجھے جگانا چاہتا ہو۔ عابدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئی "نہ میرا پترا!" وہ سرگوشی میں بولی "مجھ پر ایسا ظلم نہ کر۔ میں وہی کروں گی جو تو کہے گا۔"

یوسف نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور بولا "میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کر" عابدہ نے اپنا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر رکھا "میں........ میں پوری کوشش کروں گی پر میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں ڈیرے پر جاؤں گی کس طرح؟ یہ رشیداں تو کسی وقت میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ پتہ نہیں مجھے پاگل سمجھتی ہے میں تجھے پاگل لگتی ہوں یوسفے! پاگلیں میری طرح کی ہوتی ہیں؟"

یوسف نے سوال نظر انداز کرتے ہوئے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ میں جاگ تو نہیں رہی پھر بولا "تو بیس سال سے یہاں رہ رہی ہے یہ بھی نہیں سوچ سکتی کہ ڈیرے پر کیسے پہنچنا ہے؟" عابدہ نے کہا "یوسفے اگر پھیرو وہاں نہ ہوا تو پھر!"

"وہیں ہے وہیں ہے" یوسف نے زور دے کر کہا "اور کہیں ہو ہی نہیں سکتا۔"

عابدہ بولی "میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے یوسفے! شاہ جی نے پرسوں صبح ایک تاریخ پر لاہور جانا ہے اگر وہ چلے گئے تو دو تین دن انہیں وہاں لگ ہی جائیں گے جب شاہ جی نہ ہوں تو ڈیرے پر رات کو صرف ایک بندے کا پہرہ ہوتا ہے میں کسی نہ کسی طرح اندر چلی ہی جاؤں گی پھر تو تو مجھ سے ناراض نہیں ہوگا نا؟"

"نہیں ہوں گا ناراض" یوسف جھلا کر بولا "مگر پرسوں تک یہاں کیسے رہوں گا۔ شاہ جی تو آج ہی مجھے کہہ رہے تھے کہ کاکے مل لیا ہے تو اب پھٹا کھا جا ڈاکٹر نے اسے زیادہ ملنے جلنے سے منع کیا ہوا ہے۔"

"نہیں کل کا دن میں تجھے کسی طرح رکھ ہی لوں گی مگر ایک بات کہوں گی یوسفے" کچھ کہتے کہتے عابدہ کی آواز بھرا سی گئی عجیب انداز سے کہنے لگی "یوسفے ان بگلو پکھیرو کے پیچھے نہ بھاگا کر دیکھ میرے پتر ہر پکھیرو کسی عابدہ کے اسلم کی طرح ہوتا ہے۔ جب کوئی اسے مار دیتا ہے یا پکڑ کر لے جاتا ہے تو دو آنکھیں بڑا روتی ہیں۔"

یک دم قدموں کی آواز آئی عابدہ نے ڈر کر کہا "ہائے اللہ وہ رشیداں آ گئی اچھا تو سو جا میں صبح آؤں گی" دروازہ کھلا اور کچی نیند سے جاگی ہوئی رشیداں کا سراپا نظر آیا وہ تحکم سے بولی "بی بی جی مجھے بڑے شاہ جی سے شکایت کرنا پڑے گی آپ کیوں آئیں ہیں اٹھ کر یہاں؟" عابدہ لرز کر بولی "نہیں نہیں میں تو یونہی" الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے پھر وہ تیز قدموں سے ملازمہ کے آگے آگے چلتی باہر نکل گئی۔

صبح یوسف نے مجھ سے کہا "باجی پکھیرو اس مکان میں تو نہیں میں نے سارے دیکھ لیا ہے فارم میں اور بھی کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی۔ میرے خیال میں وہ یا تو ڈیرے پر ہے یا پھر چھوٹی ٹوانی کے مکان میں" شاہ دین کی تیسری بیوی کو وہ چھوٹی ٹوانی کہہ رہا تھا۔ (بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ شاہ دین ٹوانہ کی منکوحہ بیوی نہیں تھی)

میں نے کہا "یوسف میں تجھے ایسا لڑکا نہیں سمجھتی تھی بڑا افسوس ہوا ہے مجھے۔ میں نے رات تیری اور عابدہ کی ساری باتیں سن لی ہیں" اس کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا میں نے کہا "بہت شرم کا مقام ہے یہ۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تو یہاں آکر ایسا کرے گا تو میں نہیں آتی۔ تجھے حیا نہیں آتی ایک بدنصیب ماں کو ستاتے اور رلاتے ہوئے؟"

"وہ باجی میں تو........"

"چپ کر" میں نے طیش میں کہا "خدا تجھے کبھی معاف نہیں کرے گا تو نے ایک ماں کی محبت سے غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ تو اس کی کمزوری پکڑ کر اسے کانٹوں پر گھسیٹ رہا ہے۔"

"باجی تم سمجھنے کی کوشش کرو وہ ایک پاگل عورت ہے اگر اس نے ہمارا کام کر دیا تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی اسے کچھ نہیں کہے گا کوئی نہیں پوچھے گا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کیوں کر رہی ہے نہ ہی کسی کو اس پر شک ہوگا۔"

"بہت گھٹیا ہو تم' مجھے نفرت ہے تم سے" میں نے غصے سے کہا "تمہیں معلوم ہی نہیں انسانیت کیا ہوتی ہے وہ بیچاری پاگل نہ ہوتی تو تجھ جیسے کو کیوں منہ لگاتی" میرا پر طیش روپ دیکھ کر یوسف ایک دم خاموش ہوگیا کچھ دیر سر جھکا کر ٹخنے کے زخم کو سہلاتا رہا آخر بولا "ٹھیک ہے باجی تم ناراض ہوتی ہو تو میں منع کر دوں گا اسے۔"

اتنے میں ملازمہ رشیداں ایک بڑے ٹرے میں ناشتہ لے کر آ گئی۔ عابدہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی انہیں دیکھ کر یوسف چپ ہوگیا........ وہ سارا دن یوسف

117168

نے خاموشی میں گزار دیا اس نے میری بات کا کافی اثر لیا تھا۔ میں نے ایک دو بار اسے بلانے کی کوشش کی مگر وہ مختصر جواب دے کر چپ ہوگیا عابدہ سارا دن ہمارے چاؤ چونچلوں میں مصروف رہی اس کی حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو روتا تھا ایک دکھی ماں کا درد دوسری دکھی ماں سے بڑھ کر اور کون جان سکتا ہے۔ عابدہ کے صرف دو بچے تھے ایک بیٹی ایک بیٹا اب اس کے پاس صرف ایک بیٹی تھی۔ بیٹا اس کی آنکھوں کو سمندر دے کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایک روز صبح سویرے وہ وضو کرکے اور ٹوپی پہن کر قریبی مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے نکلا تھا اس کے بعد ماں نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی تھی گیارہ سال گزر چکے تھے وہ آج بھی اس کی ننھی منی قمیضوں' چپلوں اور ٹوپیوں کو سینے سے لگائے ہوئے تھی اسے سترہ سالہ یوسف کی آنکھوں میں اپنے چھ سالہ اسلم کی آنکھیں جھانکتی نظر آتی تھیں۔ رات ہوگئی یوسف اور میں خاموشی سے اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ میں یہاں کا ماحول اچھی طرح دیکھ چکی تھی اگر وہ باز اس فارم میں کہیں تھا بھی تو ہم اسے حاصل کرنے کی امید نہیں لگا سکتے تھے۔ یہ لوگ میری توقعات سے کہیں زیادہ چوکنے تھے نظم و ضبط ایسا تھا کہ ڈیری فارم کی بجائے کسی ممنوعہ فوجی علاقے کا گمان ہوتا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ دین تقسیم ہندوستان سے پہلے خود بھی فوج میں رہا تھا اس نے پورے فارم کو خاردار باڑوں اور آہنی دروازوں سے محفوظ کر رکھا تھا۔ غالباً باز کی موجودگی کے سبب یہ لوگ اور بھی محتاط تھے۔ ہمارے لئے بہتر یہی تھا کہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جائیں۔ میں نے اس سلسلے میں بات کرنے کے لئے ایک دو بار یوسف کو آواز دی لیکن وہ سو چکا تھا یا جان بوجھ کر خاموش تھا۔ آخر میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں یکایک مجھے خیال آیا کہیں یوسف کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے وہ غصے میں تو تھا ہی اگر مردانگی دکھانے کے لئے خود ہی ڈیرے کی طرف نکل جاتا تو بے حد خطرناک تھا میں نے سوچا کہ زیرو کا بلب جلا چھوڑنا چاہئے۔ چارپائی سے اٹھ کر میں نے دیوار پر سوئچ بورڈ ٹٹولا اور لائٹ آن کر دی۔ یوسف کے لحاف پر نگاہ ڈالتے ہی ٹھٹھک گئی مجھے احساس ہوا لحاف کے نیچے کچھ نہیں ہے میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر لحاف اٹھایا بستر خالی تھا۔ دل دھک سے رہ گیا میرے اندیشے درست نکلے .... نہیں' نہیں وہ شاید کسی حاجت کے لیے باہر نکلا ہے میں نے لائٹ دوبارہ آف کر دی۔ بے آہستگی دروازہ کھول کر باہر نکلی

پیشاب خانہ تھا اس کا کھلا دروازہ میرا منہ چڑھا رہا تھا۔ کہاں چلا گیا ہے وہ۔ میں ننگے پاؤں بے آواز چلتی برآمدے کی طرف گئی پھر سوچا کہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر دیکھنا چاہیے ابھی نصف سیڑھیاں ہی چڑھی تھی کہ کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی میں نے زینے کے جالی دار دریچے سے باہر جھانکا ڈیرے یعنی مردانے کی طرف سے کوئی بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

یہ کوئی دبلا پتلا مرد تھا اس نے بے تابی سے دروازے پر دستک دی اس کے پیچھے قریباً نصف فرلانگ کی دوری پر ڈیرے کی طرف شور و غل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رشیداں نے دروازہ کھولا اور وہ دبلا پتلا مرد جلدی سے اندر آ گیا۔ دونوں ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں تھوڑے ہی فاصلے پر سیڑھیوں کی تاریکی میں موجود ہوں۔ ڈیوڑھی میں ان دونوں کی آواز گونج رہی تھی اور شب کے سناٹے کی وجہ سے باآسانی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ مرد کہہ رہا تھا۔

"تجھے پتہ ہے نا شیخ کا وہ باز پہلے ایک لڑکے کے ہاتھ آیا تھا!"

"ہاں......ہا.......... تو نے ہی تو بتایا تھا" ملازمہ رشیداں کی آواز آئی۔"

"پتہ ہے وہ لڑکا کون ہے؟" مرد نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"یوسفا جسے پتر پتر کہتی ہے تیری بی بی عابدہ۔"

"ہائے میں مرگئی........" رشیداں کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ مرد نے کہا "پکڑا گیا ہے وہ ڈیرے کے پاس گھوم رہا تھا۔ بابری نے دھر لیا۔ بڑا مارا ہے گوپور گاؤں کا ایک کامی آیا ہوا ہے ہمارے پاس اس نے پہچان لیا ہے۔ وہ کہتا ہے اس لڑکے نے باز اڑایا تھا۔"

رشیداں نے کہا "ہائے دل محمد اب کیا ہوگا!" رشیداں کا انداز تخاطب بتا رہا تھا کہ مرد اس کا شوہر ہے۔

وہ بولا "وہی ہوگا جو چوروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کوئی لمبا ہی چکر ہے شاہ جی اور ... اس طرف آ رہے ہیں۔ یوسفے کی بہن کدھر ہے؟"

تھا......... صاف ظاہر تھا کہ وہ جیل سے مفرور ہے۔ داڑھی اور خالصتاً دیہاتی لباس میں اسے پہچاننا خاصا دشوار تھا۔ اس کے ساتھ شاہ دین کھڑا تھا۔ کافی صحت مند شخص تھا۔ تقریباً 65 برس ہوگی مگر چہرے مہرے سے 50 کے آس پاس لگتا تھا۔ اس نے ایک چھوٹے سروالے سے کہا۔

"اوئے ملکی پہچان ذرا اس کو یہی ہے اس کی بہن!"

چھوٹے سروالے نے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے "توبہ کرو جی چٹا جھوٹ ہے یہ۔ اس کی بہن رانی کو میں جانتا ہوں اچھی طرح۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔" شاہ دین نے اپنے بھاری بھرکم چہرے کو اوپر نیچے ہلایا پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی بندوق کے کندے سے یوسف کو ٹھوکا دیا اور کہا "اوئے مچھرو کہتا تھا یہ بہن ہے تیری!"

یوسف کے چہرے پر سرخ رنگ کی لہر سی گزر گئی وہ اپنے غصے اور پشیمانی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاہ دین نے گالی دے کر کہا۔

"اوئے بتاتا نہیں یہ کیا لگتی ہے تیری؟"

اس کے ساتھ ہی اس نے یوسف پر ٹھوکروں اور دوہتھڑوں کی بارش کر دی۔ یوسف الٹ کر چارپائی سے نیچے گرا۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ایک شخص نے ڈانگ سے دھکیل کر مجھے ایک طرف کر دیا۔ اس دوران عابدہ روتی چیختی وہاں پہنچ گئی۔ وہ پہریداروں کے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہی تھی۔

"شاہ جی! میرے پتر کو کچھ نہ کہنا" وہ ہاتھ اٹھا کر دہائی دینے لگی اسے دیکھ کر شاہ دین کا پارہ کچھ اور چڑھ گیا۔ اس نے پھنکار کر کہا "لے جاؤ اس کو باہر......... جاؤ........." اس کا اشارہ عابدہ کی طرف تھا۔ پہریدار جو اب تک اسے ہاتھ لگانے سے گریز کر رہے تھے اس پر جھپٹے اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ شاہ دین کا لب و لہجہ اچانک ہی نہایت خطرناک ہو گیا تھا۔ اس نے ایک آدمی سے کہا۔

"لا اوئے شیدے رسی......... باندھ ان دونوں کو سامنے تھم (ستون) کے ساتھ"

شیدا رسی لینے کے لئے بھاگا شاہ دین کی آنکھوں سے غضب کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اس نے چند قدم چل کر دیوار سے ایک ہنٹر اتار لیا اس سے پہلے صرف ہنٹر کے

بارے میں سنا تھا یا فلموں میں دیکھا تھا۔ آج یہی ہنٹر ایک خودسر شخص کے ہاتھ میں تھا اور مجھ پر یا یوسف پر برسنے والا تھا۔ ہمارے اردگرد کھڑے تمام افراد کے چہرے پر ایک سفاک سی دلچسپی نظر آ رہی تھی۔ وہی دلچسپی جو ہر اس شخص کی آنکھ میں نظر آتی ہے جو باطنی طور پر ظالم ہوتا ہے مگر ظلم کی توفیق نہیں رکھتا۔ صرف ظلم ہوتے دیکھ سکتا ہے۔

شاہ دین نے ہنٹر ہاتھ میں لہرایا اور آتش باز نگاہوں سے گھورتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں غیرارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اگر ہنٹر میرے جسم پر پڑا تو کیا ہوگا مگر اتنا معلوم تھا یہ ایک نہایت تکلیف دہ عمل ہوگا۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کیا کرنا چاہئے؟ پھر اچانک میرا سارا خوف زائل ہو گیا میں جیسے ایک دم بے فکر ہو گئی اگر سلیم یہاں تھا تو پھر مجھے سوچنے کی کیا ضرورت تھی۔

میں نے ایک نظر سلیم کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ تیزی سے کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کی ذہانت اور حاضر دماغی پر مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو سنگین حالات میں درست فیصلہ کرنے کی خداداد صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے یاد تھا جب واصف کی موت کے بعد ہم بڑی حویلی سے نکلے تھے اور گیٹ پر مسلح چوکیداروں نے ہمیں روک لیا تھا۔ سلیم نے بڑی بے ساختگی سے انہیں شباب کے حملے کی خبر دی تھی اور انہیں الجھا کر ہم صاف بچ نکلے تھے۔ اسی طرح پندرہ بیس منٹ پہلے جب چھت پر اس نے مجھے پہچانا تھا اور اوپر سے شاہ دین آ گیا تو وہ کمال ہوشیاری سے میرے لئے اجنبی بن گیا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ شاہ دین کا کوڑا میرے جسم پر پڑنے سے پہلے وہ کوئی حل نکال لے گا اور پھر ایسے ہی ہوا۔ اس نے صورت حال بگڑتے ہوئے دیکھی تو جلدی سے شاہ دین کے پاس آیا۔ اس کے کان کی طرف جھک کر وہ کچھ کہنے لگا۔ شاہ دین کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ ہنٹر پر اس کی گرفت خودبخود ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر ایک گہری سانس لی پھر سلیم کے ساتھ باتیں کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد سلیم واپس آ گیا۔ آتے ہی اس نے یوسف کو ایک دو ٹھوکریں ماریں اور گالیاں بکتے ہوئے اپنے کارندوں سے بولا کہ ہم دونوں کو برآمدے والے کمرے میں بند کر دیا جائے۔ سلیم کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ شاہ دین کے آدمیوں نے ہمیں لاٹھیوں

سے دھکیل کر نیچی چھت والے ایک کمرے میں بند کر دیا یہ کمرہ غالباً اس سے پہلے سلیم کے اپنے استعمال میں تھا۔ ایک طرف کھونٹیوں پر اس کے چند جوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ شیشہ کنگھی منجن اور اسی طرح کی چند دوسری اشیاء ایک بوسیدہ سے ٹرنک پر پڑی تھیں۔ کمرے میں صرف ایک کھڑکی تھی جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ شاہ دین کے آدمیوں نے دروازہ باہر سے بند کرکے کنڈی لگا دی۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ ان کی نگاہیں مجھے اپنے جسم کو چھوتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں یہ سوچ کر کانپ گئی کہ اگر سلیم یہاں نہ ہوتا تو خدا جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ یہ سب کچھ یوسف کی جلدبازی اور ضد کی وجہ سے ہوا تھا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ترس بھی۔ میں نے کہا "اپنی مرضی کرکے دیکھ لیا نا!"

"یہ سب تمہارا قصور ہے" وہ لال پیلا ہو کر بولا۔

اسی دوران سلیم آ گیا۔ سلاخ دار کھڑکی کے سامنے اپنی چارپائی ڈالی اور ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی بالکل نئی ایم جی رائفل چارپائی کے ایک پائے کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ جیب سے سگریٹ نکال کر اس نے ہونٹوں سے لگایا۔ ایک کارندے نے جلدی سے آگے بڑھ کر تیلی دکھائی۔ ایک دوسرا شخص پائنتی کی طرف بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے لگا۔ وہ تینوں مدہم لہجے میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد سلیم کے ہاتھوں کے اشاروں سے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کو جانے کے لئے کہہ رہا ہے۔ وہ اٹھ کر اور سلام کرکے باہر نکل گئے۔ اب ڈیرے کے اس حصے میں سلیم' یوسف اور میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو فی الوقت نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ سلیم نے میدان صاف کر لیا ہے اور اب وہ کوئی بات کرے گا۔ مگر آدھ پون گھنٹہ گزر گیا اس کی طرف سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ کیا وہ اب بھی محتاط رہنے پر مجبور تھا۔ پھر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ یوسف کی وجہ سے احتیاط برت رہا تھا اور چاہتا تھا کہ پیش رفت میری طرف سے ہو۔ میں نے اسے سر کے اشارے سے پاس بلایا وہ جلدی سے سگریٹ بجھا کر کھڑکی پر آ گیا۔ اس کی سوالیہ نظریں یوسف سے تعارف چاہ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"سلیم! تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔ یوسف سے کوئی پردہ نہیں۔"

سلیم کے چہرے پر شناسائی پھوار کی طرح برسنے لگی۔ اس نے کہا "ثنا! مجھے آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ تم یہاں.......... میرا مطلب ہے......."

میری خشک آنکھوں میں جلن اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے کہا "سلیم یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔"

ایکاایکی سلیم کا چہرہ بھی غم میں ڈوب گیا۔ میری طرح اسے بھی فرحان کی موت یاد آئی تھی۔ وہ گلوگیر ہو کر بولا "ثناء فرحان کا بہت دکھ ہوا ہے۔ اتنے دن گزر گئے پھر بھی اس خبر پر یقین نہیں آ رہا۔ کاش یہ سب کچھ نہیں ہوا ہوتا.......... یہ سب کیسے ہوا؟"

میں نے کہا "تم نے اخباروں میں نہیں پڑھا"

"اخباروں کے لکھے پر کیسے یقین کر لوں۔ تمہارے سسرال والے تو کہتے ہیں کہ تم نے پاگل پن میں خود ہی اپنے بچے کو مار ڈالا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے..........؟"

"میرا کوئی خیال نہیں۔ مجھے حقیقت کا پتہ ہو تب ہے نا۔ چند دن پہلے چودھری شہاب کی ایک چھوٹی سی خبر اخبار میں آئی تھی۔ اس نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ تم نے نہیں تمہارے جیٹھ نے بچے کو مارا ہے۔ اس خبر میں تو بڑی دردناک بات لکھی تھی۔ چودھری شہاب نے کہا ہے کہ تمہارے جیٹھ وہاب نے بلیک میل کرنے کے لئے تمہیں فرحان کی کٹی ہوئی انگلیاں بھیجی تھیں" میری آنکھوں میں خنجر سے اتر رہے تھے۔ جی چاہتا تھا سلیم کے سامنے رو دوں۔ اتنا روؤں کہ دل بھی آنکھوں کے رستے بہہ جائے مگر آنسو؟ کہاں تھے میرے آنسو' میری گود خالی کرنے والا میری آنکھوں کو بھی خالی کر گیا تھا۔ میرے سارے آنسو اپنی مٹھی میں بند کرکے وہ قبر کی تیرگی میں اتر گیا تھا۔

"کیا یہ بات سچ ہے ثناء؟" سلیم نے پر درد لہجے میں پوچھا۔ میں بالکل خاموش تھی وہ میرے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا "مجھے معلوم ہے ثنا یہ سب کچھ سچ ہے۔ تم نہ بھی بتاؤ تو تمہارا چہرہ بتاتا ہے۔"

میں نے بات بدلتے ہوئے کہا "سلیم! تمہیں جیل سے نہیں بھاگنا چاہئے تھا۔ ایسا کیوں کیا تم نے؟"

وہ نیا سگریٹ سلگا کر بولا۔ "میرا خیال ہے اس کا جواب تم اپنے آپ سے پوچھو۔

ہمارے ہر سوال کا جواب ہمارے اپنے پاس ہی موجود ہے۔ ہم ایک دوسرے کی کہانی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ کچھ نہ پوچھیں۔ ہاں۔ مجھے صرف یہ بتا دو کہ اس جگہ تمہاری موجودگی کا کیا مطلب ہے اور شیخ کے باز کے ساتھ تمہارا نام کیوں لیا جا رہا ہے۔"

میں نے سلیم کو اشارے سے بتایا کہ یوسف کے سامنے یہ گفتگو مناسب نہیں ہے...... اس نے صفائی سے موضوع بدل دیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کیسے جیل سے چھوٹا اور کس طرح شاہ دین ٹوانہ تک پہنچا۔ اس کی روداد کافی طویل تھی۔ گو یہ روداد دلچسپ ہے مگر یہاں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتی۔ مختصراً یہ کہ چنگیزیوں کے ایماء پر پولیس کی حراست میں سلیم پر بہت تشدد کیا گیا۔ ایک روز جب اسے پولیس لاری میں بٹھا کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ کورٹ میں لے جایا جا رہا تھا۔ لاری کا ایکسیڈنٹ ہوگیا وہ الٹ گئی۔ کئی قیدی اور پولیس والے زخمی ہوئے۔ اسی افراتفری میں سلیم فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ وہ چھپتا چھپاتا مری جا پہنچا۔ یہاں ادھیڑ عمر شاہ دین اپنی ایک نوخیز ساتھی کے ساتھ تفریح کی غرض سے آیا ہوا تھا۔ اس لڑکی کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے نہیں تھا۔ لاہور سے لڑکی کے وارث اس کی ٹوہ لگاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ وہ شاہ دین سے اپنے کچھ واجبات وصول کرنا چاہتے تھے۔ اتفاقاً اس جھگڑے میں سلیم کو شاہ دین کی طرف سے اہم کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ شاہ دین سلیم کی جرأت اور دلیری سے متاثر ہوا اور اسے اپنے ساتھ بھکر لے آیا۔ سلیم کی باتوں سے پتہ چلا کہ شاہ دین سیروشکار کا بے حد شوقین ہے۔ اسلحہ جمع کرنے کے علاوہ سیروشکار واحد شوق ہے جس پر وہ بے دریغ پیسہ اور وقت خرچ کرسکتا ہے۔ شیخ کے گمشدہ باز کے بارے میں اسے بھی خبر تھی اور وہ اس کی ٹوہ میں تھا۔ آخر میواتیوں کے "اکھ" میں سلیم کے بل بوتے پر وہ یہ باز حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ سلیم نے بتایا کہ وہ باز اب بھی اسی فارم میں موجود ہے۔

اس موقع پر یوسف نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا "وہ باز کسی کا نہیں۔ صرف میرا ہے۔ میں نے اسے پکڑا ہے۔ میں دیکھوں گا کون اسے چھینتا ہے۔" وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔

سلیم نے کہا "بھائی میرے آہستہ بول شاہ دین کے بندے پاس ہی ہیں۔ کسی کو

مصیبت آ جائے گی۔ پہلے بڑی مشکل سے میں نے اسے ٹالا ہے" اس کا اشارہ شاہ دین کی طرف تھا۔

میں نے پوچھا "کیا کہا تھا تم نے اسے؟"

سلیم نے بتایا کہ دو تین دن پہلے پولیس آئی تھی، اسی میواتی گاؤں والے واقعے کے سلسلے میں۔ شاہ دین نے انہیں دو تنخواہ دار بندوں کی گرفتاری دے دی تھی اور کچھ لین دین بھی کرلیا تھا۔ وہ واپس چلے گئے تھے۔ مگر ابھی شاہ دین کو ان کی طرف سے کھٹکا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب شاہ دین ہمیں مرنے مارنے پر آمادہ ہوگیا تو سلیم نے اسے یہ کہہ کر شیشے میں ڈال دیا تھا کہ کہیں ہم دونوں میں سے کوئی پولیس کا مخبر نہ ہو...... یہ بات شاہ دین کے دل کو لگی تھی۔ یوسف کے بارے میں تو معاملہ قدرے صاف تھا مگر میرا کوئی اتہ پتہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ اسی وجہ سے شاہ دین کا ہنٹر والا ہاتھ لٹک گیا تھا۔ پولیس کی تعلق دار عورت کو مار کر وہ کسی مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتا تھا...... تاہم یہ بچاؤ عارضی تھا۔ شاہ دین کی سی آئی ڈی، پولیس کی سی آئی ڈی، سے دو ہاتھ آگے تھی۔ جلد یا بدیر اسے پتہ چل ہی جاتا تھا کہ پولیس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ شاہ دین کو یہاں ٹیلیفون کی سہولت حاصل تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے میں ہی اپنا یہ شک دور کرلیتا۔ سلیم اس معاملے میں قدرے پریشان تھا۔

وہ رات ہم نے قریباً آنکھوں میں ہی کاٹی۔ سلیم کبھی چارپائی پر جا کر بیٹھ جاتا اور کبھی کھڑکی کے پاس آکر باتیں کرنے لگتا۔ صبح فجر کے وقت وہ کچھ دیر کے لئے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو چہرے پر پریشانی کے سائے نہیں تھے۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر بولا۔

"شا! ایک اچھی خبر ہے۔ شاہ ایک تاریخ کے لئے لاہور چلا گیا ہے۔ اب پرسوں سے پہلے نہیں آئے گا"...... پھر اس نے ایک نظر میرے عقب میں دیکھا۔ ساری رات جاگنے کے بعد اب یوسف پر نیند غلبہ پا چکی تھی۔ اسے سویا دیکھ کر سلیم نے کہا کہ میں کھل کر اپنے بارے میں بتاؤں۔ سلیم سے بھلا مجھے کیا چھپانا تھا۔ حالات کے طوفان نے ہمیں ایک ہی لہر پر سوار کر دیا تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ بڑی حویلی کے ایک فارسٹ گارڈ نے مرتے مرتے چنگیزیوں کے بارے میں کیا انکشاف کیا تھا۔ اس دھماکے انکشاف کی وجہ سے میں کیونکر خان رحیمی کے ڈیرے پہنچی اور وہاں کس طرح

یوسف سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد صغراں' میواتی گاؤں اور اختر زمان کے بگڑے ہوئے ٹولے کے بارے بھی سب کچھ بتایا۔ سلیم میری باتیں پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

میری روداد ختم ہوئی تو اس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے کئی سال پہلے کا وہی لڑکا جھانک رہا تھا جس نے ہوٹل کے فیملی کیبن میں مجھ سے کہا تھا' شاء میں اگلی جمعرات کو تمہارا انتظار کروں گا...... وہ جمعرات کبھی نہیں آئی تھی اور شاید اسے کبھی نہیں آنا تھا۔ مگر سلیم کی آنکھوں میں وہ جمعرات ایک ادھ جلے انگارے کی طرح ہمیشہ دہکتی رہتی تھی...... وہ ایک عمیق سانس لے کر بولا "شاء! چنگیزیوں کو برباد کرنے کے اس سفر میں خود کو تنہا نہ سمجھنا۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں...... اس موقع میں تمہارا ساتھ دینے کے لئے مجھے سو بار بھی جیل سے بھاگنا پڑا تو بھاگوں گا۔"

میں خاموش رہی۔ محسوس ہوا کہ رو رہی ہوں مگر آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ خشک تھیں۔ شاید اب ساری زندگی مجھے ایسے ہی رونا تھا۔ سلیم نے کہا "ہاں...... اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔ اگر وہ باز یہاں سے لے جانا ہے تو اس سے سنہری موقع ہمیں پھر نہیں مل سکتا......"

میں نے پوچھا "کیا وہ تمہاری تحویل میں ہے؟"

اس نے کہا "نہیں تحویل میں تو نہیں مگر زیادہ دور بھی نہیں۔ اگر تم سے کل کسی وقت ملاقات ہو جاتی تو بہت بہتر تھا...... جس جگہ تم کھڑی ہو ٹھیک اسی جگہ باز کا پنجرہ پڑا تھا۔"

میں نے جلدی سے اپنے پیروں کی طرف دیکھا۔ اس پرندے کے بارے اتنا کچھ سن چکی تھی کہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہیں کہیں موجود ہے۔ سلیم نے کہا "رات والے واقعے کی وجہ سے کام خراب ہوا ہے۔ شاہ اسے یہاں سے اٹھوا کر گھر لے گیا ہے۔ خیر اب بھی کچھ بگڑا نہیں۔ میں آج ہی...... ملتا ہوں۔ عشرت سے۔"

"یہ عشرت کون ہے؟"

ایک لحظے کے لئے سلیم کے ہونٹ لرزے۔ جیسے اس کے منہ سے کوئی ان چاہی بات نکل گئی ہو۔ پھر سنبھل کر بولا "وہی لڑکی جو مری میں شاہ کے ساتھ تھی۔ اب ادھر ہی رہتی ہے۔ شاہ کی پہلی بیوی کے مکان کے پیچھے اس کا مکان ہے۔"

"تو کیا باز اب اس کے پاس ہے؟"

"ہاں۔ شاہ کا خیال تھا کہ وہ ادھر زیادہ محفوظ رہے گا۔ شاید اس نے لاہور جانا تھا اس وجہ سے بھی احتیاط کی ہو۔"

میں نے پوچھا "کیا تم وہاں جا سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے پہلے جاتے رہے ہو؟"

"نہیں۔ پہلے تو نہیں گیا۔ مگر آج کوشش کروں گا۔" مجھے اندازہ ہوا کہ سلیم کچھ چھپا رہا ہے۔ شاید......؟ ایک سوال سا ذہن میں چمکا اور ٹوٹتے ہوئے تارے کی طرح میرے مقدر کی اتھاہ تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

صبح کا ناشتہ سلیم نے بڑے اہتمام سے منگوایا۔ تاہم دکھاوے کے لئے کارندوں کے سامنے ہمیں دھمکیاں وغیرہ بھی دیں۔ دوپہر کے وقت جب ڈیرے کے اس حصے میں کوئی نہیں تھا وہ کمرے کی کنڈی کھول کر اندر آ گیا۔ اس کی مسہری کے نیچے پلاسٹک کی ایک ٹوٹی ہوئی بالٹی تھی۔ یہ بالٹی اس نے فرش پر الٹا دی۔ سگریٹ کی کچھ خالی ڈبیاں' جلی ہوئی تیلیاں مالٹوں اور گنڈیریوں کے چھلکے اور مڑے تڑے کاغذ بہت کچھ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے ایک گلابی رنگ کے کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا اور ایک طرف رکھ دیا۔ پھر ایک اور ٹکڑا اٹھا لیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کوڑے میں گلابی کاغذ کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ ان پر نیلی روشنائی سے کچھ لکھا بھی ہوا تھا کوئی خط قسم کی چیز تھی یہ۔ اس کے کہنے پر یوسف بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ جلد ہی وہ تمام ٹکڑے کوڑے سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ بیس پچیس ٹکڑے ہوں گے۔ سلیم انہیں ترتیب سے جوڑنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ ایک دقت طلب کام تھا۔ میں بھی سلیم کی مدد کرنے لگی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد فرش پر کاپی سائز کا ایک مکمل صفحہ بچھا ہوا تھا۔ اس کی تحریر کچھ یوں تھی۔

ڈیئر بابری!

"بہت مجبور ہو کر خط لکھنے کا رسک لے رہی ہوں۔ اس خط کو پڑھتے ہی پھاڑ دینا یا جلا دینا۔ پتہ نہیں تم نے مجھے کیا کر دیا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے تمہارا ہی خیال رہتا ہے۔ دل کو بڑا سمجھاتی ہوں لیکن یہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ ہائے اللہ کیا کروں کچھ تم ہی مجھے سمجھاؤ نا۔ پرسوں بھی سارا دن انتظار کرتی رہی لیکن تم تو پتہ نہیں راستہ بدل کر گذر جاتے ہو" اس کے بعد دو شعروں اور چند عشقیہ فقروں کے بعد لکھا تھا" ڈیئر' پرسوں ہفتے

کو شاہ جی تاریخ پر لاہور جا رہے ہیں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ چند بہت ضروری باتیں کرنی ہیں تم سے۔ دس اور ساڑھے دس بجے کے درمیان آ جانا۔ پچھلی ڈیوڑھی کی بتی بجھی ہوگی اور دروازہ بند ہوگا مگر کنڈی نہیں لگی ہوگی۔ کتا بھی میں باندھ چھوڑوں گی۔ دیکھو بھولنا نہیں دس اور ساڑھے دس کے درمیان۔ دیکھو' میرے بارے میں کوئی غلط خیال ذہن میں نہ لانا۔ میں ایسی عورت نہیں ہوں۔ پتہ نہیں تم نے کیا جادو کیا ہے جو یہ خط لکھنے کی حرکت کر بیٹھی ہوں۔

فقط تمہاری دید کی طالب۔

"دس اور ساڑھے دس کے درمیان" سلیم نے زیر لب دہرایا یوں لگتا تھا خط کے مندرجات اس کے ذہن سے اتر چکے تھے۔ "آج ہفتہ ہی ہے نا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے نگاہیں چراتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔ میری کیفیت کو محسوس کر کے وہ بولا۔

"میں جانتا ہوں یہ اچھی عورت نہیں ہے۔ اس لئے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں پرسوں اس نے یہ رقعہ اپنی ذاتی ملازمہ کے ہاتھ بھجوا دیا۔ میں نے سرسری نظر سے دیکھ کر پھاڑ دیا۔ مگر اب.......... ایک بار تو وہاں جانا ہی پڑے گا۔"

سلیم کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس نے یہ رقعہ واقعی سرسری نظر سے دیکھا ہوا تھا۔ غالباً اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ عشرت نے اسے ملنے کے لئے کیا ٹائم دیا ہوا ہے۔

رات کے دس بجے تھے۔ یوسف منہ پھلائے کروٹ بدلے لیٹا تھا۔ کمرے کی خاموشی گھمبیر ہوئی تو میں وقت گذاری کے لئے کوئی مصروفیات ڈھونڈنے لگی۔ سلیم کے ٹرنک کے نیچے چند پرانے تہہ شدہ اخبار نظر آئے۔ میں نے نکال لئے اور جلدی جلدی ورق گردانی کرنے لگی۔ آخر ایک اخبار میں مطلوبہ خبر نظر آ ہی گئی۔ یہ شہاب الدین کے بارے میں خبر تھی اس خبر کا ذکر سلیم نے کیا تھا.......... اس خبر کے مطابق چودھری شہاب الدین نے چنگیزیوں پر مجھے بلیک میل کرنے کا الزام لگایا تھا اور فرحان کی کٹی ہوئی پوروں کا ذکر کیا تھا۔ اس خبر میں نادرہ کا ذکر بھی موجود تھا۔ اخبار نے اپنے لاہور کے رپورٹر کے حوالے سے لکھا تھا کہ میڈم نادرہ کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی ہے اور اس کے انتڑیوں کے دو آپریشن ہو چکے ہیں۔ اس کے باوجود ابھی اس کی حالت تسلی بخش نہیں۔ رپورٹر

اس "قاتلانہ حملے" کی کڑیاں بھی چنگیزیوں اور پال پور کے چودھریوں کی انتخابی رنجش سے جا ملائیں تھیں۔ دور کی کوڑی لاتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ چودھری شہاب نے ثناء کو (یعنی مجھے) میڈم نادرہ کو قتل کرنے کی خصوصی مہم پر لاہور بھیجا تھا کیونکہ وہ وہاب چنگیزی کے سوشل ورک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ بیچاری فرخندہ کو بھی اس معاملے میں گھسیٹ لیا گیا تھا اس پر میری آلہ کار بننے کا الزام لگایا گیا تھا۔

اس پوری خبر کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ چنگیزیوں کے گھاگ وکیل نے چودھری شہاب کو اس معاملے میں بری طرح جکڑ لیا ہے۔ اس نے چودھری شہاب ہی کے دو کارندوں کو گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا تھا اور انہوں نے بیان دیا کہ واصف چنگیزی کو قتل کرنے کے بعد اس کی ملزمہ بیوی کئی روز شہاب الدین کی حویلی میں چھپی رہی ہے۔ ظاہر ہے چودھری شہاب کے ان کارندوں کو پیسے دے کر یا ڈرا دھمکا کر توڑ لیا گیا تھا.......... مجھے کبھی کبھی چودھری شہاب پر ترس بھی آنے لگتا تھا۔ وہ صرف میری وجہ سے اس دلدل میں پھنسا تھا۔ پہلے اس نے مجھے پناہ دینے کی غلطی کی اور پھر جب چنگیزیوں کے کارندے مجھے سنگسار کرنے کی فکر میں تھے وہ میری جان بچانے پہنچ گیا۔ کسی طاقتور کے خلاف کسی مجبور اور کمزور کی مدد کرنا آج کے دور میں غلطی نہیں تو اور کیا ہے۔ مجھے چودھری شہاب کی وہ خاموش آنکھیں یاد آئیں جو مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن کہہ نہیں سکتی تھیں۔ میں نے جب بھی ان آنکھوں میں دیکھا مجھے ان کی گہرائی سے خوف آیا۔

میں نے اپنے خیالوں سے چونک کر یوسف کی گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی دونوں سوئیاں گیارہ کے قریب پہنچ چکی تھیں۔ سلیم کی طرف سے ابھی کوئی اطلاع نہیں تھی دل و دماغ میں اندیشوں کی چاپ سنائی دینے لگی یونہی بات چھیڑنے کے لئے میں نے کہا۔

"یوسف کیا ٹائم ہو گیا ہے؟"

"گیارہ" اس نے مختصر ترین جواب دیا اور بازو دوبارہ آنکھوں پر رکھ لیا۔

یکایک ہم دونوں کو چونکنا پڑا۔ فارم کے رہائشی حصے کی طرف سے تڑتڑ کی خوفناک آواز آئی یقیناً یہ ایم جی کا فائر تھا میں اچھل کر بستر سے کھڑی ہو گئی اور کھڑکی میں سے جھانکا۔ برآمدے میں کسی متنفس کے آثار نہیں تھے۔ یوسف ڈری ہوئی نظروں سے میری

طرف دیکھنے لگا۔ یقیناً میری اپنی آنکھوں میں بھی خوف تھا۔ چند لمحے بعد کہیں قریب سے بھاگتے قدموں کی آواز آئی اور رہائشی حصے کی طرف جا کر معدوم ہو گئی۔ قریباً دو منٹ ہم نے سخت کشش و پنج میں گذارے پھر کوئی دھم کی آواز سے دیوار پر سے کودا اور برآمدے میں آیا۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ سلیم تھا۔ جب وہ بھاگتا ہوا ہمارے کمرے کی طرف آیا تو اس کی چادر چیل کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پنجرا نما چیز تھی۔ جلدی سے اس نے دروازہ کھولا۔

"آ جاؤ شاہ! وہ تیزی سے بولا برآمدے میں آ کر اس نے اپنے بستر کے نیچے سے چابیوں کا گچھا نکالا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کو وہ اندر سے کنڈی لگا کر گیا ہوا تھا۔ کنڈی کھول کر ہم باہر آ گئے اور قریباً بھاگتے ہوئے ایک ٹرک تک پہنچ گئے۔ اس ٹرک کے پیچھے ایک بڑا سا ٹینکر تھا یقیناً اس میں دودھ وغیرہ فارم سے منتقل کیا جاتا تھا۔ سلیم نے ٹرک کا دروازہ کھول کر پہلے پنجرہ اندر رکھا پھر مجھے اوپر چڑھنے کے لئے کہا۔ اس وقت بھاگتے قدموں کی آواز سے گردوپیش گونج اٹھے۔ میں نے دیکھا پانچ چھ آدمی بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے ہیں۔ ان میں سب سے آگے ادھیڑ عمر شیر محمد تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تین دن پہلے ہمیں بیرونی گیٹ سے عابدہ تک پہنچایا تھا۔ اس کے چہرے پر زبردست الجھن اور خدشوں کے سائے تھے۔

"کیا بات ہے بابری صاحب یہ ابھی فائرنگ کیسی ہوئی ہے؟"

سلیم جھلا کر بولا "ادھر جا کر دیکھو جدھر فائرنگ ہوئی ہے۔ ادھر آم لینے آئے ہو؟"

شیر محمد نے پوچھا "لیکن آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"سلیم بولا کہیں نہیں جا رہا جاؤ ادھر دیکھو کیا بات ہوئی ہے۔"

"شیر محمد چوکنا سا ہو گیا۔ "بابری صاحب گولی آپ کی رائفل کی تھی ابھی آپ نے اندر ٹرک میں کیا رکھا ہے۔"

سلیم غرایا۔ "تو تم مجھے روکو گے!" اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ تو شیر محمد کے کندھے سے آویزاں پستول کی طرف بڑھا اور اس کی خوفناک ٹکر شیر محمد کی ناک پر پڑی۔ وہ اچھل کر کئی فٹ دور جا گرا۔ باقی آدمی ہراساں ہو کر پیچھے پیچھے ہٹے۔ سلیم نے اپنی طاقتور رائفل ان کی طرف سیدھی کی اور بے حد سرد لہجے میں بولا۔

"مجھے جانتے ہو ناں! بھون کے رکھ دوں گا بھاگو یہاں سے۔" میں نے یہ ناقابل یقین منظر دیکھا کہ وہ چار پانچ ہٹے کٹے افراد بچ بچ بھاگ اٹھے۔ شیر محمد وہیں زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ شاید اس کی کوئی ہڈی وغیرہ ٹوٹ گئی تھی۔ سلیم نے مجھے سہارا دے کر ٹرک پر چڑھایا اس کے بعد یوسف چڑھا تب سلیم گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ٹرک اسٹارٹ ہو کر تیزی سے فارم کے بڑے گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ کو اندر سے بڑا سا تالا لگا ہوا تھا سلیم نے کھڑکی کے اندر سے منہ نکالا اور چوکیدار سے کہا کہ وہ تالا کھولے چوکیدار کو بھی گڑبڑ کا احساس ہو چکا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں ہراس نظر آ رہا تھا۔ جی کر اچھلتے ہوئے وہ ملحقہ کمرے کی طرف گیا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ واپس آئے گا۔ اور ایسا ہی ہوا غالباً کھڑکی سے نکل کر بھاگ گیا تھا۔ ٹرک کے لئے گیٹ کھولنا چنداں مشکل نہیں تھا سلیم نے پہلا گیئر لگا کر ٹرک آگے بڑھایا اور ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ گیٹ کا دائیں سمت والا ستون زمین بوس ہو گیا ٹرک کے پہیے گیٹ کی آہنی چادر کو توڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اب ہمارے پیچھے دھول تھی اور چیخ و پکار کی آوازیں تھیں۔

تقریباً دو میل نیم پختہ راستے پر چلنے کے بعد ہم پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ ایک ذیلی سڑک تھی جو آگے جا کر بھکر سے جھنگ جانے والی بڑی سڑک سے ملتی تھی۔ حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے غور سے سلیم کی طرف دیکھا۔ اس کی قمیض کا گریبان ادھڑا ہوا تھا اور چہرے پر بھی خراشیں تھیں۔ تاریکی کی وجہ سے ان خراشوں کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی اس کے ہاتھ کی پشت اور آستین پر خون کے دھبے تو میں ٹرک میں بیٹھتے ہی دیکھ چکی تھی۔ معلوم نہیں عشرت کے مکان میں کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ خدا جانے وہ کیسی عورت تھی لوگ اسے شاہ دین کی تیسری بیوی سمجھتے تھے۔ جبکہ وہ بیوی تو کجا عورت کہلانے کی حقدار بھی نہیں تھی۔ میرے قدموں میں وہ پنجرہ پڑا تھا جس کے لئے ایک خلقت دیوانی ہو رہی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھنے کی کوشش لیکن تاریکی میں صرف پرندے کا ہیولا نظر آیا۔ ایک مدہم سی حیوانی بو ٹرک کے کیبن میں پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک سلیم چونک گیا سامنے سے آنے والا ایک ٹرک اپنی ہیڈلائٹس کو مخصوص
انداز میں اوپر نیچے حرکت دے رہا تھا۔ سلیم نے ٹینکر کی رفتار کم کر دی سامنے والے ٹرک
نے پاس سے گزرتے ہوئے سلیم سے کچھ کہا۔ اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے۔
بولنے والا پشتو لہجے میں بولا تھا۔ سلیم نے بتایا کہ آگے ہائی وے پولیس چیکنگ کر رہی ہے۔
ٹرکوں اور بسوں والے ایک دوسرے کو ایسے اشارے عموماً دیتے رہتے ہیں۔ پٹھان
ڈرائیور کا دیا ہوا اشارہ ہمارے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوا تھا۔ اس وقت ہم اس پوزیشن میں
ہرگز نہیں تھے کہ پولیس کی ناکہ بندی کا سامنا کر سکتے۔ سلیم اشتہاری مجرم تھا اور میں
مفرور تھی۔ ہمارے پاس ایک انتہائی قیمتی پرندہ تھا اور یہ ٹرک بھی چوری کا تھا۔ اگر
سب کچھ چھپ بھی جاتا تو سلیم کے کپڑوں پر خون کے دھبے اور اس کے چہرے کی خراش
اور رگڑ نہیں چھپ سکتی تھیں لہٰذا کچھ آگے جا کر سلیم نے ٹرک سڑک سے نیچے اتارا
درختوں میں روک دیا۔ اس کی روشنیاں بجھا کر ہم نیچے اتر آئے۔ سلیم نے رائفل کندھے
سے لٹکا کر پنجرہ ہاتھ میں لے لیا۔ ہم تیزی سے کھیتوں میں چلتے آگے بڑھنے لگے۔
ٹرک سے بمشکل نصف فرلانگ دور ہی گئے ہوں گے کہ سڑک پر بریکوں کے چرچرانے
تیز آواز آئی۔ پھر دو گاڑیاں سڑک سے اتر کر کچے میں ہچکولے کھاتیں ٹرک کی
بڑھیں۔ یقیناً یہ شاہ دین کے آدمی تھے سلیم نے حالانکہ ٹرک سڑک سے ہٹا کر د
کے اندر روکا تھا مگر وہ تاڑنے والوں کی نظر سے چھپا نہیں رہا تھا۔ ہمارے کانوں
خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بج اٹھیں۔ ”تیز چلو‘ جلدی کرو۔“ سلیم نے تیز لہجے میں
دونوں حتی الامکان رفتار سے سلیم کا ساتھ دینے لگے۔ یوسف کا نخنہ ابھی پوری طرح

ہوا تھا اسے تیز چلنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس وقت ہماری اولین
پناہ تھی۔ چاروں طرف چارے کے کوتاہ قد کھیت تھے۔ کوئی درختوں کا جھنڈ بھی نظر
آتا تھا۔ ٹرک چھوڑ کر ہم فوری طور پر پکڑے جانے سے بچ گئے تھے مگر خطرات
بدستور تعاقب میں تھے کوئی تین چار فرلانگ آگے کسی بستی کے آثار نظر آ رہے تھے ہم
نے اپنے قدموں کی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔ جونہی ہم اس نامعلوم گاؤں میں داخل
ہوئے دور کھیتوں میں کسی گاڑی کی ہیڈلائٹ چمکنے لگیں۔ نوے فیصد امکان تھا کہ اس
گاڑی میں شاہ دین کے مسلح کارندے ہوں گے۔ سلیم آگے آگے جا رہا تھا میں نے کہا۔
”سلیم میرا خیال ہے کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔“
مگر وہ سنی ان سنی کرتا ہوا سیدھا نکلتا چلا گیا۔ گلی کے اختتام پر ایک جوہڑ نظر آ رہا
تھا۔ وہ جوہڑ کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا اس سخت سردی میں وہ
ٹھٹھرتے ہوئے جوہڑ میں سے گزرنا چاہتا تھا۔ جوہڑ کے عین کنارے پر پہنچ کر وہ رک
ہم سے کہنے لگا جوتیاں اتار لو۔ اس نے اپنی جوتی بھی اتار لی اب ہم تینوں کے جوتے
میں تھے.... وہ ہمیں لے کر واپس مڑ آیا۔ اچانک مجھے اس کی یہ حرکت سمجھ میں آ
گئی۔ وہ کافی دور اندیشی سے کام لے رہا تھا کچھ دور چل کر وہ ایک مکان کے دروازے پر
کھڑا ہو گیا۔ یہ اس گلی کا آخری مکان تھا۔ دو اطراف درخت تھے ایک طرف کوڑے کا
ڈھیر سا تھا۔ عام دیہاتی مکانوں کے برخلاف اس مکان کی بیرونی دیوار قدرے اونچی تھی۔
نے باز والا پنجرہ نیچے رکھا اور ذرا سا اچھل کر مکان کے صحن میں جھانکا پھر آگے بڑھ
دروازے کا جائزہ لیا وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے ہاتھوں پر تھوک کر آپس میں رگڑا....
ایک ہی جست میں دیوار پھاند کر اندر کود گیا۔ اندر جا کر اس نے دروازے کی کنڈی
لی اور ہم دونوں صحن میں چلے گئے۔ یکایک ایک اندرونی کمرے سے کھٹ پٹ کی
زیں آئیں یوں لگا جیسے کوئی لالٹین تھامے ادھر چلا آ رہا ہے۔ یہ نازک لمحے تھے۔ سلیم
نے یوسف کا بازو پکڑا اور جلدی سے ایک تاریک دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ میں نے بھی
کیا۔ ایک فربہ جسم کا شخص ہاتھ میں لالٹین لئے جھومتا ہوا برآمد ہوا اور بیرونی
کی طرف بڑھا۔ لالٹین نیچے رکھ کر اس نے اپنا ہاتھ کنڈی کی طرف بڑھایا۔ ایسے
شنی اس کے جسم پر پڑی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ کوئی پولیس والا

تھا۔ اس نے دروازے کی کنڈے گری ہوئی دیکھی تو سوچ میں پڑ گیا۔

"بانو" اس نے آواز دی۔ دروازے کو کنڈی نہیں لگائی تھی؟"

بانو جو اس کی بیوی تھی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پولیس والا بڑبڑاتا ہوا کمرے کی طرف گیا اور کوئی چیز لے کر دوبارہ دروازے کی طرف گیا۔ کھٹ پٹ کی آواز سے پتہ چلا کہ وہ دروازے کو تالا لگا رہا ہے۔ تالا لگا کر اور لالٹین اٹھا کر وہ دوبارہ اندر چلا گیا۔ یہ بڑی تشویش ناک صورت حال تھی۔ ہم نہ صرف ایک پولیس والے کے گھر میں گھس آئے تھے بلکہ بند بھی ہو گئے تھے۔

سلیم اور یوسف تو اس خطرناک پناہ گاہ سے نکل بھی سکتے تھے لیکن میرے لئے ممکن نہیں تھا پولیس سے ٹکر لینا ہمارے ذہن میں تھا اور نہ ہی ہم ایسا چاہتے تھے... اس وجہ سے ہمارے تینوں کے ذہن میں تھا کہ یہاں سے نکل چلیں۔ دفعتاً ایک بار پھر لالٹین کی روشنی چمکی اور قدموں کی چاپ سنائی دی وہی شخص نمودار ہوا اور لالٹین سر کے برابر لا کر ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ یقیناً اسے شبہ ہو چکا تھا تو اب بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور پھر یہی ہوا جونہی لالٹین کی روشنی اس تاریک کونے میں پہنچی جہاں ہم سمٹے کھڑے تھے پولیس والے کی آنکھیں پھیل گئیں ایک لمحے کے لئے شاید وہ خوفزدہ ہوا مگر دوسرے لمحے اس کے ہونٹ بھینچ گئے۔

"اوئے کون ہو تم....؟" اس نے گرج کر پوچھا اور اس سے پہلے کہ کوئی ہم سے جواب دیتا اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا غالباً وہ ابھی گھر آیا ہی تھا۔ نہ صرف اس کی وردی جسم پر تھی بلکہ ہولسٹر بھی کمر سے لگا ہوا تھا۔ "کون ہو تم؟" اس نے پھر کڑک کر پوچھا۔ ہم تینوں کا حلیہ اسے اور بھی شیر کر رہا تھا۔ میں اور یوسف بوسیدہ سے دیہاتی لباس میں تھے۔ سلیم کا لباس بھی ادھڑا پھٹا ہوا تھا جو واحد چیز اس پولیس والے کو متاثر کر سکتی تھی وہ سلیم کی رائفل تھی مگر وہ رائفل سلیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک تندور کے اندر رکھ دی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس رائفل کی وجہ سے ہمیں پناہ لینے میں دشواری ہو۔ اب وہ رائفل بھی ہماری دسترس میں نہیں تھی۔ سلیم نے اپنے لہجے میں دیہاتی پن سمیٹتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ کہیں تسلی سے بیٹھ کر ہماری بات سن لیں ہم چور ڈاکو نہیں ہیں۔"

"ہوں.... ایک چوری اوپر سے سینہ زوری۔" پولیس والے نے بڑے بڑے ... کھا کر کہا۔

سلیم نے کہا "ہماری بات تو سن لو جی۔" وہ بولا "بچو جی! بات تو میں تہاڈی ایسی سنوں گا کہ کچھ سنانے کو باقی نہیں چھوڑوں گا۔ چلو پیرپٹو ذرا آگے نکلو ہاں تینوں۔" اس نے بڑی لاپرواہی سے اپنے ریوالور کو حرکت دی۔ اس کا حکم ماننے کے سوا ہمارے پاس چارہ نہیں تھا۔ وہ ہم تینوں کو لے کر ایک نیچی چھت والے کوٹھے میں آ گیا یہ کوٹھا باقی مکان سے قدرے علیحدہ تھا۔ ایک طرف چند ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں پڑی تھیں ایک سائیکل کھڑی تھی اور جلانے والی خشک لکڑیوں کا ڈھیر سا لگا تھا۔ پولیس والے نے لالٹین نیچے رکھ دی اور ہمیں دیوار کے ساتھ ایک قطار میں کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ یوسف کافی ڈرا ہوا تھا اور کانپ رہا تھا۔ میں پولیس والے کے عہدے کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی مگر نیم تاریکی کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بول چال اور ڈیل ڈول سے تو وہ کوئی حوالدار یا ہیڈ کانسٹیبل لگتا تھا مگر میں جانتی تھی کہ اس عہدے کے پولیس والے کے پاس ریوالور نہیں ہوتا شاید وہ سب انسپکٹر یا انسپکٹر تھا۔ سلیم کے چہرے پر بھی الجھن نظر آ رہی تھی تاہم وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ کمرے کی مدھم روشنی میں پولیس والے نے پہلی مرتبہ سلیم کے ہاتھ میں پکڑا پنجرہ دیکھا اور غرا کر بولا۔

"یہ کیا اوئے.... اچھا تو غیرقانونی شکار بھی کھیلتے ہو.... کہاں سے پکڑ کے لائے ہو اسے کو؟"

سلیم نے کہا.... "یہ میرا نہیں ہے جی.... جھنگ کے ایک خان صاحب کا ہے۔ ان کا ملازم لے گیا تھا اس سے لے کر آ رہا ہوں۔ خان صاحب کے پاس لائسنس ہے جی"

"کون سا خان ہے اوئے۔ مجھے بھی پتہ چلے یہ لائسنس شائسنس تو ہمارے ہاتھوں سے بنتے ہیں۔ کیا نام ہے خان کا؟"

"اکبر خان۔" سلیم نے یونہی ایک نام لے دیا۔

"اچھا اچھا.... دیکھ لیں گے اس پائے خان کو بھی.... یہ عورت کون ہے؟ اور یہ کون ہے تیرے ساتھ؟"

ایک دم پولیس والے کی آنکھوں میں عجیب سے چمک نظر آئی اس نے غور سے باز
کو دیکھا اور ہونٹ سکوڑ کر بولا۔ ”اوئے.... کہیں.... کہیں یہ وہ باز تو نہیں جس کے بارے
میں اخباروں میں بھی آیا ہے.... اوئے ٹھیک بتاؤ.... کہیں یہ عربی شیخ والا باز تو نہیں۔“

سلیم نے کمال اعتماد سے کہا۔ ”نہیں جناب یہ تو سستا سا باز ہے۔ ہمارے شاہ
صاحب نے بچہ لے کر پالا تھا۔ اس طرح کے دو تین اور باز بھی ہیں ان کے پاس اگر آپ
کو چاہیے تو خاص رعایت کر دیں گے۔ ہزار بارہ سو میں پڑ جائے گا آپ کو؟“

”اوئے اوئے کسی بیوپاری کی اولاد تو مجھے کس لائن پر ڈال رہا ہے۔“ پولیس والے
نے گرج کر کہا۔ ”میں نے اچار ڈالنا ہے اس کو خرید کر.... تم ذرا مجھ کو یہ دسو کہ میرے
گھر میں کیسے گھسے ہو؟“

سلیم نے سادگی سے کہا۔ ”جی ہم جھنگ جا رہے تھے آٹھویں میل کے پاس ہماری
بس خراب ہو گئی سوچا کہ رکنا تو پڑ ہی گیا ہے۔ سائیں گلے شاہ کے مزار پر سلام کر لیں
وہاں رات بھی گزار لیں گے۔ مگر مزار سے تین چار غنڈے ہمارے پیچھے پڑ گئے۔ ہاتھا پائی
بھی کی ہم سے۔ یہ دیکھئے میری ساری قمیض پھاڑ دی ہے۔ ان سے بچتے بچتے آپ کے گھر
میں گھس آئے۔“

پولیس والے نے کہا۔ ”ایسی بڑی کہانیاں سنی ہیں میں نے.... دیکھ کاکا‘ معاملہ
ہے خراب۔ ایسے معاملوں میں کوئی خان شان اپنے کسی کارندے کی مدد نہیں کرتا۔ الٹا
چھتر پڑیں گے اپنے مالک سے۔ تم ایک پلس افسر کے گھر میں گھسے ہو کوئی چھوٹا موٹا کام
نہیں کیا تم نے۔ چنگا یہی ہے کہ خان شان کو اس معاملے میں نہ گھسیٹو اور ایتھوں
ایتھے ہی طے کر لو۔“ وہ ہمیں پکا الو سمجھ رہا تھا۔ اس کی فطرت کا اندازہ کر کے سلیم
اپنے چہرے پر کچھ اور سادہ لوحی طاری کر لی۔ ڈرے ہوئے انداز میں بولا۔

”غلطی ہو گئی ہے جی.... معاف کر دیں۔“

وہ بولا ”غلطی تو ہوندی ہی معاف کرنے کے لئے ہے اور معافی کی قیمت
تو ہوتی ہے.... کتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں؟“

سلیم نے کہا ”جی کرایہ نکال کر کوئی پندرہ بیس روپے ہوں گے۔“

”پندرہ وی سے کچھ نہیں بنے گا کوئی نیڑے تیڑے جاننے والا ہے تمہارا؟“

”نہیں جی.... بالکل پردیسی ہیں جی.... معاف کر دیں۔“

وہ کچھ اور شیر ہوا.... ”کاکا جی پلس والے کے گھر میں گھسنا اتنا بڑا جرم ہے کہ
تمہارے صمد خان کو پتا چل گیا تو چھتر مار مار کر نوکری سے نکال دے گا تمہیں۔ اس تک یہ
بات نہ ہی پہنچے تو اچھا ہے۔“

یوسف کا تو کچھ پتہ نہیں لیکن میں اور سلیم اس صورت حال سے لطف اندوز ہو
رہے تھے یہ شخص ہمارے حلیئے اور بول چال سے مکمل طور پر دھوکا کھا چکا تھا۔ اس کا دماغ
عرش پر پہنچا ہوا تھا اور وہ ہمیں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ میں نے
کہا۔ ”جناب! آپ خود ہی ہمیں کوئی راستہ بتائیے۔“ اس نے مونچھ کو بل دیا۔ ”مجھ سے
ول پچن لانے کی کوشش نہ کرو۔ بڑا زہریلا تھانیدار ہوں میں۔ پھیکیں کڈوا دیتا ہوں
بندے کی۔ زنانی ہو یا مرد سب پر ایک ہی ہاتھ رکھتا ہوں۔“

میں نے دیکھا سلیم کی نظریں پولیس والے کے ہاتھ پر جمی ہوئی ہیں غالباً وہ اس کے
ریوالور کے رخ کا اندازہ کر رہا تھا یکایک اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس شخص کو
دھکیل دیا۔ دونوں اوپر نیچے خشک لکڑی کے ڈھیر پر گرے۔ میں نے جلدی سے کوٹھے کا دروازہ
زور سے بند کر دیا سلیم کا ایک زوردار مکہ پولیس والے کے منہ پر پڑا تو اس کے منہ سے
بڑی ڈری چیخ نکل گئی ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اس کے زمین پر گرتے ہی مجھے
اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ نقلی ہے میں نے آگے بڑھ کر یہ کھلونا ریوالور اٹھا لیا پولیس والا اب
سلیم کے نیچے دہائی دے رہا تھا۔

”او بھا جی میری گل تے سنو.... او بھا جی ہتھ تے روکو۔“

سلیم نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور سیدھا کھڑا کر دیا اس کی آنکھ کے نیچے
نیل نمودار ہو رہا تھا اور جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ ”کون ہے تو؟“ سلیم نے غصیلی
سرگوشی کی۔ جواب میں اس شخص نے بھیک مانگنے والے لہجے میں جو کچھ بتایا اس سے پتا
چلا کہ اس کا نام حسن دین ہے وہ ذات کا میراثی اور پیشے کا بہروپیا ہے۔ اس نے ایک
شناختی کارڈ بھی دکھایا اور دعویٰ کیا کہ یہ اس کے ”بہروپیے پن“ کا اجازت نامہ
ہے۔ سلیم نے مجھے اشارہ کیا میں جلدی سے گئی اور صحن کے کونے میں واقع تندور کے
پاس سے سلیم کی وزنی رائفل نکال لائی۔ حسن دین بہروپیے کی بیوی خاصی گہری نیند سو

رہی تھی۔ اسے بالکل پتہ نہیں چلا تھا کہ گھر کے ایک حصے میں کیا کچھ ہوا ہے۔ میں نے کوٹھے میں جا کر رائفل سلیم کو تھمائی تو حسن دین کی خوف سے گھگھی بندھ گئی۔ وہ کبھی رائفل کی طرف دیکھتا اور کبھی ہمارے بدلے ہوئے چہروں کی طرف۔ سلیم نے رائفل کی سرنال اس کی گردن پر رکھی تو خوف سے اس کی آنکھیں باہر ابل پڑیں۔ "مم.... میرا قصور بادشاہو.... وہ گھگھیا کر بولا۔"

سلیم نے کہا۔ "تیرا قصور یہ ہے کہ تو بڑا زہریلا تھانیدار ہے۔ بندے کی چیکیں نکلوا دیتا ہے۔" وہ شرمندگی سے کھیں نکالنے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ سلیم نے غرا کر کہا۔ "دیکھو میری طرف.... میرا نام بابری ہے جانتا ہے بابری کو؟"

"نہیں.... نہیں...." حسن دین نے کہا۔ اس کا جواب اور اس کی آنکھوں میں چمکنے والا خوف گواہی دے گیا کہ اس نے بابری کا نام ضرور سنا ہے۔ سلیم نے کہا۔ "کچھ غنڈے ہمارے پیچھے ہیں ہو سکتا ہے وہ ابھی کچھ دیر میں تیرے دروازے تک بھی آئیں اگر انہیں ہمارے بارے میں پتہ چلا تو سب سے پہلے میں تجھے گولی مار دوں گا۔"

"نہ میرے بادشاہ۔" حسن دین نے لرز کر کہا۔ "میں آپ کا نوکر... آپ کے نوکروں کا نوکر۔ آپ کے نوکروں کے نوکروں کا نوکر۔"

سلیم نے کہا۔ "چل جا... اپنی بیوی کو جگا اور اسے طریقے سے سب کچھ بتا دے اور سمجھا بھی دے۔ میں بات دہرانے سے گولی چلانا بہتر سمجھتا ہوں اور ہاں.... اگر دودھ ہے تو گرم چائے کا انتظام بھی کر۔"

ہماری وہ رات خیریت سے گزر گئی تاہم خطرہ ابھی موجود تھا۔ حسن دین کی بیوی سلیم کی ہدایت پر آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب گھر سے باہر نکلی اور اس نے واپس آ کر بتایا کہ گاؤں کے نمبردار کے گھر کے سامنے ایک کار اور ایک جیپ کھڑی ہے لوگ کہتے ہیں کہ رات کچھ چور گاؤں میں آئے ہیں ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی تک یہیں کہیں چھپے ہوں۔ صبح دس بجے کے قریب سلیم نے حسن دین عرف دینو کی بیوی کو پھر باہر بھیجا۔ اس نے آ کر اطلاع دی کہ گاڑیاں واپس چلی گئی ہیں۔ یہ بڑی امید افزا خبر تھی۔ اس عورت کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارا کھرا اٹھانے والوں کو ناکامی ہوئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شاید وہ [illegible] پار کر کے آگے نکل گئے ہیں۔ (سلیم اس لئے ہمیں ننگے پاؤں چلا کر واپس لایا

عورت نے بتایا کہ کھرا اٹھانے کے لئے پاس والے گاؤں سے دو کھوجی بھی بلائے گئے تھے۔

شاہ دین ٹوانہ کے فارم سے نکلنے کے بعد ہم نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیا دینو بے اولاد تھا گھر میں اس کی بیوی ہاجرہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ دونوں سلیم کو پوری طرح یقین دلا چکے تھے کہ ہمارے موجودگی کی خبر کسی کو نہیں ہو گی باز کا پنجرا ابھی تک کوٹھے میں ہی تھا۔ میں نے وہاں جا کر پہلی بار غور سے باز کو دیکھا واقعی وہ ایک شاندار پرندہ تھا۔ اسے دیکھ کر دل پر عجیب طرح کی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ یقیناً ایسے پرندے کو پرندوں کا بادشاہ کہلانے کا حق حاصل تھا۔ سلیم نے بتایا کہ اسے مشرقی شہباز (ایسٹرن ہاک) کہا جاتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق پرند کی لمبائی کم و بیش 25 انچ تھی سر گردن اور پشت سنہری مائل سلیٹی رنگ کی تھی۔ سینہ اور بطن بالکل سفید تھا اور ان پر آرپار خوبصورت سیاہ دھاریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ ٹانگیں حیرت انگیز طور پر بڑی اور مضبوط تھیں۔ میں محویت سے قدرت کے اس انمول شاہکار کو دیکھتی چلی گئی۔ میں نے پوچھا۔ "سلیم اس کی کیا قیمت ہو گی؟"

سلیم نے کہا۔ "کافی زیادہ ہے؟"

میں نے اس پر انکشاف کیا کہ خان رحیمی کے مطابق اس باز کی قیمت آٹھ لاکھ ہے تو یہ کم نہیں سلیم حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا اس نے پوچھا۔

"یہ بات تم سے خان رحیمی نے کی تھی!" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ بولا۔ "پھر خان رحیمی نے جھوٹ بولا ہے یا اسے بازوں کے بارے میں کچھ پتہ ہی نہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"اس باز کی قیمت کم از کم چالیس لاکھ روپے ہے۔"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں یک ٹک سلیم کو دیکھنے لگی۔ میری نگاہوں میں سارے مناظر گھوم گئے جو خان رحیمی سے ملنے کے بعد اب تک پیش آ چکے تھے۔ ان پارٹیوں کی دیوانہ وار بھاگ دوڑ کا سبب اب اچھی طرح سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی ساتھ والے کمرے سے حسن دین کی آواز آئی اور ہم دونوں ہوشیار ہو گئے۔ حسن دین نے اندر آ کر سلیم سے کہا۔

"میرے سرکار! وہ منڈا آپ کا رو رہیا ہے۔ اس کو کیہ ہوا ہے؟" ویٹو کا اشارہ یوسف کی طرف تھا۔ میں نے غور کیا تو واقعی سامنے والے کمرے سے یوسف کی ہچکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر جلدی سے کمرے کی طرف گئی۔ دیکھا تو یوسف چارپائی پر پہلو کے بل پڑا تھا اور بازو آنکھوں پر رکھے رو رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے تجھے؟" میں نے پوچھا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پاس بیٹھ کر اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے ایک جھٹکے سے کندھا چھڑایا اور کچھ اور زور سے ہچکیاں لینے لگا۔ میں نے کہا "کیا بات ہے یوسف۔ کچھ بتاؤ بھی۔" وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ سخت ناراض ہے۔ میرے بار بار پوچھنے کے بعد آخر اس نے کہا۔

"جاؤ چلی جاؤ۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا۔"

"لیکن یوسف ہوا کیا ہے۔ میں نے یہی کہا تھا نا کہ اس عورت کو اس معاملے میں نہ گھسیٹو۔ کون سی ایسی بات بری بات کہہ دی تھی میں نے۔"

"تم نے مجھے گالی دی ہے۔ تم نے مجھے بے غیرت اور بزدل کہا ہے۔ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو تو مجھے بھی تم سے کم نفرت نہیں ہے۔" میں نے اسے پچکار کر اس کا … کم کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ روتے ہوئے بولا۔ "تمہارا خیال ہے کہ میں اپنے لالچ کے لئے تمہارے ساتھ آیا ہوں۔ مجھے کوئی لالچ نہیں ہے ایک پیسے کا فائدہ بھی میرے دماغ میں نہیں تھا۔ تمہارا وہ پرس بھی مجھے وہاں سے نہیں … تھا۔ پر میں نے سوچا کہ تمہیں بتایا تو تمہیں دکھ ہوگا۔ میں نے کہا کہ پرس مجھے مل … ہے۔ میں صرف تمہارے فائدے کے لئے یہاں آیا تھا۔ مگر تم نے جو باتیں کی ہیں … نے میرا کلیجہ ٹکڑے کر دیا ہے۔"

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ پرس کے معاملے میں یوسف نے جھوٹ بولا … اس بات سے اس کے خلوص کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر میں نے بھی کوئی ایسی ناجائز بات … کی تھی۔...وہ مجھ سے چھوٹا تھا اور ایک غلط طرز عمل پر اسے ٹوکنا میرا حق تھا اور … بھی۔ شاید میں نے الفاظ کچھ سخت استعمال کر دیئے تھے میں نے سوچا کہ اسے … چاہئے۔

میں نے کہا "دیکھو یوسف۔ ہر بات میں اللہ کی طرف سے کوئی بہتری ہوتی ہے۔

… کھا کر ڈیرے کی طرف نہ جاتے اور سلیم سے ہماری ملاقات نہ ہوتی تو کیا پتہ ابھی ہم وہیں ٹانک ٹوئیاں مار رہے ہوتے۔ قدرت نے ہمارا کام بھی کر دیا ہے اور تم ایک عورت کو دکھ پہنچانے کے گناہ گار بھی نہیں ہوئے۔ باقی اگر تمہیں میری کوئی بات …ی ہو تو میں معافی مانگ لیتی ہوں۔ چلو اٹھو اپنی باجی کو معاف کر دو۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھنے لگا۔ اتنے میں سلیم آ گیا۔ "……… بھائی یہ کیا رونا دھونا ہے؟" اس نے یوسف کی سرخ آنکھیں دیکھ کر پوچھا "نہیں یونہی سر میں درد ہو رہا تھا" یوسف نے ایک عام فہم بہانہ بتایا۔ سلیم نے ایک …ئی پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ "اب اس باز کے بارے میں کیا ارادے …"

میں نے کہا "باز کا مالک تمہارے سامنے بیٹھا ہے اس سے پوچھو۔" میرا اشارہ …ف کی طرف تھا۔ سلیم نے کہا۔

"ہاں……… میاں یوسف اب اس کا کیا کرنا ہے؟" یوسف پہلے تو خاموش رہا سلیم نے دوبارہ پوچھا تو بولا۔ "جس طرح باجی کہتی ہے ویسے کر لو۔"

سلیم کی یہ بات ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی کہ باز کی قیمت چالیس …ے لگ بھگ ہے۔ اس کا مطلب تھا اس پرندے کو جلد از جلد کسی محفوظ مقام تک …نا ہے۔ سوال اٹھتا تھا کہاں۔ جواب تھا۔ جہاں بھی یہ متلاشی نگاہوں سے بچ سکے۔ …ڈھونڈنے والے ہاتھوں سے دور رہ سکے۔ میں اپنے دل کی واردات ٹھیک بیان …تی ہوں۔ چالیس لاکھ روپیہ کوئی چھوٹی رقم نہیں تھی۔ یہ باز اس وقت ہم تینوں کی دولت تھا۔ ہم تینوں اسے اپنے پاس رکھنے کا سوچ سکتے تھے۔ سلیم کو اپنی زندگی سنوارنے … پیسے کی ضرورت تھی۔ یوسف کو اپنی محبت حاصل کرنے کے لئے پیسے کی … تھی اور مجھے بھی اپنے فرحان کا انتقام لینے کے لئے پیسے کی ضرورت پیش آ سکتی … دنیا میں پیسے کی ضرورت کسے نہیں ہوتی؟ جسے نہیں ہوتی وہ ولی اللہ ہوتا ہے یا … کا جھوٹا۔ ہمیں بھی پیسوں کی ضرورت تھی اور میں خود کو خان رحیمی سے … کسی وعدے کا پابند نہیں سمجھتی تھی۔ بات اس سے لئے ہوئے چالیس ہزار …ی تھی تو میں وہ اسے واپس بھی لوٹا سکتی تھی۔ یوں ہم اس بیش قیمت پرندے کو

اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔ مگر اصل مسئلہ یہ تھا کہ یہ پرندہ ہمارے پاس محفوظ نہیں تھا۔
اول تو ہم اس پنجرے کے ساتھ یہاں سے نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ اور اگر نکل بھی جاتے
تو ڈھونڈنے والے ہمیں پاتال سے بھی نکال لیتے پھر سب سے ٹیڑھی کھیر اسے "ڈیل"
کرنا تھا۔ چیز کی قیمت وہی ہوتی ہے جس پر وہ فروخت ہوسکے۔ اس پرندے کی
مارکیٹ میں یقیناً چالیس لاکھ کے ہندسے کو چھو رہی تھی مگر ہم اسے اس قیمت پر
نہیں بیچ سکتے تھے۔ تو پھر کیا بہتر تھا۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ موجودہ حالات میں اس پرندے
سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے۔ یعنی اسے پہلے سے طے شدہ پروگرام
مطابق خان رحیمی کے حوالے کر دیا جائے اور اس کے صلے میں اس کا قرب اور
حاصل کیا جائے۔ حالات کے تھپیڑوں نے مجھے بڑی تیزی سے ایک بدلی ہوئی عورت
تھا۔ واصف کی سختیوں اور عزت نفس کو خاک میں ملانے والی سزاؤں نے میرے
تبدیلی کی گنجائش پیدا کی تھی۔ اس کے بعد جب میرے رشتے ناطوں نے مجھ سے منہ
تھا اور مجھے میری جڑوں سے کاٹ کر لاوارثی کی زمین پر پھینک دیا گیا تھا تو میں غیر محسوس
طور پر اس نئی مٹی میں پیوست ہونے لگی تھی۔ یہ لاوارثی جو کل تک مجھے اندھیرے
بھٹکا رہی تھی اب میری رہنمائی کرنے لگی تھی۔ اس لاوارثی نے میری انگلی تھام لی
اور انتقام کے لئے مجھے جینا سکھا رہی تھی۔ میں صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ
اندر خود اعتمادی سے فیصلے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے۔ ایسے فیصلے جن کے
میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"سلیم! ہمیں یہ باز خان رحیمی تک پہنچانا ہے۔"

سلیم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن بات کئے بغیر بند کر لیا۔ ہونٹ کھلنے
بند ہونے کے وقفے میں وہ ایک بہت بڑا فیصلہ کر چکا تھا۔ ایسا فیصلہ جو ہزار گھنٹوں کی
کے بعد بھی نہ ہو پاتا۔ مگر میرے ساتھ اس کی غیر مشروط وابستگی نے پلک جھپکنے میں
فیصلہ کرا دیا تھا۔ اس نے کہا "ٹھیک ہے شا جیسے تمہاری مرضی.... مگر اس بارے میں
سمجھ لو کہ خان رحیمی تک پہنچنا کس طرح ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟" میں نے پوچھا

"مطلب یہ کہ ہمیں خان رحیمی کے ڈیرے پر پہنچنے سے پہلے وہاں کے

ہونا چاہئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے باز کے سلسلے میں شاہ دین سب سے پہلے خان
رحیمی پر شک کرے گا۔ تمہارے اور یوسف کے بارے میں شاہ دین کو یہی شبہ تھا کہ
تمہیں خان رحیمی نے بھیجا ہے۔ ممکن ہے خان رحیمی کا ڈیرہ شاہ دین کے آدمیوں کی نظر
میں ہو اور ہم وہاں پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ لئے جائیں۔"

"پھر تمہارا کیا خیال ہے؟"

سلیم نے کہا "ایسا کرتے ہیں۔ بلکہ ایسا ہی کرنا چاہئے۔ ہم دینو کو جھنگ بھیجتے ہیں
خان رحیمی کے ڈیرے کی طرف۔ وہ خان رحیمی کو ہمارا پیغام پہنچائے کہ باز ہم نے حاصل
کر لیا ہے اب یہاں سے نکلنے کا مسئلہ ہے۔ وہ اس کا کوئی حل نکالے۔"

سلیم کی تجویز خاصی معقول تھی۔ مگر دینو کو اس مشن پر بھیجنا خطرے سے خالی نہیں
تھا۔ سلیم میری الجھن بھانپ کر بولا۔ "دینو کے بارے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔
میں نے اس کی ایک ایسی رگ پکڑی ہے کہ مرتا مر جائے گا مگر ہمیں دھوکا نہیں دے
گا۔"

"کیا مطلب....؟" میں نے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ اس مکان میں چوری کا مال موجود ہے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ کل رات
دروازے کی کنڈی کھلی دیکھ کر دینو کتنا پریشان ہوا تھا۔ وہ فوراً اندر گیا تھا اور تالا لے کر
آیا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں یاد ہے۔"

سلیم بولا۔ "اور تم نے یہ بھی دیکھا ہو گا کہ اس مکان کی چار دیواری دوسرے
مکانوں سے کافی اونچی ہے!" میں نے پھر اثبات میں جواب دیا۔ سلیم نے کہا کہ "یہ سب
حفاظتی تدبیریں اس مال کے لئے ہیں جو دینو نے اس مکان میں چھپا رکھا ہے۔ تقریباً پچپن
ساٹھ ہزار کا سونا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

سلیم نے کہا "کل رات اس کاٹھ کے الو نے خود ہی بتا دیا ہے۔ وہ کافی ڈرا ہوا تھا۔
میں نے اسے کہا دینو پچھلے کمرے کی چابی نکال۔ دراصل میں وہاں باز والا پنجرہ رکھنا چاہتا
تھا۔ دینو پتہ نہیں کیا سمجھا۔ ہاتھ جوڑنے شروع کر دیئے کہنے لگا۔

"بادشاہو! آپ کو سب پتہ ہے۔ مجھ سے بلی چوہے کا کھیل کیوں کھیلتے ہو۔ یقین کرو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ خود ہی چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔"

"مجھے اس کی بات کی سمجھ نہیں آئی مگر اتنا ضرور پتہ چل گیا کہ وہ اپنا کوئی جرم چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے طریقے سے بات کی تو اس نے سب کچھ اگل دیا۔ کوئی دو ڈھائی مہینے پہلے ایک چاندنی رات میں وہ سائیکل پر شہر کی طرف سے آ رہا تھا کہ ایک جگہ اسے پیشاب آ گیا۔ اسے پیشاب کی بیماری ہے۔ جب حاجت ہوتی ہے ایک دم بھاگ اٹھتا ہے۔ سائیکل پھینک کر وہ کھیتوں کی طرف دوڑا کچھ دور ایک پگڈنڈی پر جاتے ہوئے دو اچکے اسے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ دینو بہروپئے کی وردی میں تھا۔ انہوں نے اسے پولیس والا سمجھا پہلے تو انہوں نے ایک کھیت میں چھپنے کی کوشش کی۔ پھر کوئی چیز پھینک کر مخالف سمت میں بھاگ اٹھے۔ دینو نے پاس جا کر دیکھا وہ ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی اس میں ایک ٹرانسسٹر ریڈیو' چند قیمتی کپڑے اور زیورات تھے۔ دینو یہ سامان گھر لے آیا۔ کپڑے تو اس نے جلا ڈالے۔ ٹرانسسٹر گندے نالے میں پھینک دیا اور زیورات کو ایک ڈبے میں بند کر کے زمین میں دبا دیا۔ یہ زیورات اب تک اس کے پاس تھے۔ وہ فطری طور پر ایک ڈرپوک شخص تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان زیورات کا کیا کرے۔"

کسی نے سچ کہا ہے دیکھنے والی آنکھ ہو تو ہر شخص ایک کہانی ہے۔ حسن دین ایک بہروپیا تھا وہ بہروپیا کیوں بنا اور اسے ایسا کرنے کی اجازت کس نے دی یہ ایک علیحدہ سوال ہے مگر اس بہروپئے کی ذات سے نجانے کتنی کہانیوں کو وجود ملا تھا۔ سلیم نے بتایا کہ دینو اب پوری طرح اس کے قابو میں ہے اور وہی کرے گا جو سلیم کہے گا۔ اسی روز سہ پہر کے وقت سلیم نے دینو کو ضروری ہدایات دے کر خان رحیمی کی طرف روانہ کر دیا۔

دینو کی واپسی اگلے روز شام کے وقت ہوئی۔ خان رحیمی کے دو کارندے بھی اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے باز کے متعلق پوچھا۔ میں نے کہا کہ باز میرے پاس ہے پہلے یہ بتاؤ کہ جانے کا کیا انتظام ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بھکر سے ایک ٹریکٹر ٹرالی ساتھ لائے ہیں اس میں کھاد کی بوریاں لدی ہوئی ہیں۔ بوریوں کے درمیان اتنی جگہ ہے کہ تین چار آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ میں نے سلیم سے کہا کہ وہ باہر جائے اور دیکھ کر آئے۔ سلیم ان دونوں کے ساتھ باہر نکل گیا کچھ دیر بعد واپس آ کر اس نے بتایا کہ

ٹرالی میں سفر کیا جا سکتا ہے۔ ہم جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ دینو نے بتایا کہ وہ بھی ساتھ جا رہا ہے۔ وہ خاصا خوش نظر آتا تھا پتہ چلا کہ خان رحیمی سے اس کی کافی گپ شپ ہوئی ہے اور خان رحیمی نے اسے ساتھ ہی آنے کو کہا ہے۔ غالباً خان رحیمی دینو کے ""بھانڈ پنے"" سے متاثر ہو چکا تھا۔ جونہی اندھیرا گہرا ہوا ہم دینو کے گھر سے نکلے اور پاس ہی کھڑی ہوئی ٹرالی میں چڑھ گئے۔ گھر چھوڑنے سے پہلے دینو نے اپنے گھر کے پچھلے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اطمینان کیا کہ کہیں اس کی غیر موجودگی میں سلیم نے زیورات کی صفائی تو نہیں کر دی... ٹرالی میں بوریاں بڑے طریقے سے لادی گئی تھیں۔ عین درمیان میں ایک خلا تھا۔ یہ خلا لمبائی کے رخ پر تھا اور ہمارے بیٹھنے کے بعد اس کے اوپر بھی بوریاں رکھی جا سکتی تھیں۔ ہم تینوں یعنی میں یوسف اور سلیم باری باری پنجرے سمیت اندر چلے گئے۔ دونوں آدمیوں نے دینو کے ساتھ مل کر اوپر بوریاں چن دیں۔ تاریکی میں یوریا کھاد کی بدبو سے دماغ پھٹنے لگا مگر یہ تاریکی اور بدبو تو اگلے دو تین گھنٹے تک برداشت کرنا ہی تھی۔

ایک طویل اور کٹھن سفر کے بعد براستہ جھنگ بالآخر ہم سمندری گاؤں کے نواح میں پہنچ گئے۔ ٹریکٹر ٹرالی اس کہنہ سال کوٹھی کے سامنے رکی جسے خان رحیمی کا ڈیرہ کہا جاتا تھا۔ جہاں بازوں کا معروف شکاری خان رحیمی رہتا تھا اور جس کی طویل راہداریوں اور تنگ و تاریک کمروں میں کہیں وہ راز بھی پوشیدہ تھا جو میرے بااثر دشمنوں کو قانون کی دسترس میں لا سکتا تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی کوٹھی کے وسیع لان میں پہنچ کر رکی۔ بوریاں اٹھا کر ہمیں باہر نکالا گیا۔ خان رحیمی نے بڑی بیتابی سے میرا استقبال کیا۔ اس کی نگاہیں باز کی دید کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ میں نے بوریوں کے اندرونی خلا سے پنجرہ نکال کر خان رحیمی کے سامنے رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں بچوں کی سی خوشی نمودار ہوئی۔ باچھیں کھل گئیں اور وہ کانپتے سر کے ساتھ پرندے کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

"ونڈر فل۔ ان بی لیوایبل۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا اور جوش سے بولا۔

"یو آر اے گریٹ گرل۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیا کہنا چاہئے۔ حیران کر دیا ہے تم نے۔"

میں نے دیکھا چند فٹ کی دوری پر شوقیہ کھڑی بڑی رقیبانہ نگاہوں سے مجھے گھور

رہی تھی۔ خان رحیمی نے باز کے نظارے سے چونک کر کہا۔ "چلو بھئی اندر چلو فوراً اندر چلو۔ یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔ اور پھر ہم نے تم سے پوری کہانی بھی تو سننی ہے۔"

ہم سب کوٹھی کے شاندار ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میں اچانک ہی خان رحیمی کے لئے وی آئی پی کا درجہ حاصل کر گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے برابر بٹھایا۔ سلیم اور یوسف کے ساتھ بھی وہ بڑی محبت سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے یوسف کو گھورتے ہوئے کہا "یہ لڑکا کہیں....؟ میرا مطلب ہے۔"

میں نے کہا "آپ درست سمجھ رہے ہیں۔ یہی یوسف ہے اس نے یہ باز یہاں تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے"

خان رحیمی نے کہا "یوں مزا نہیں آئے گا۔ میں بات شروع سے اور تفصیل سے سننا چاہوں گا۔ اس لئے پہلے چائے کا پروگرام ہو جائے۔ کہانی کا مزا چائے کے بغیر سفر کا مزا موسیقی کے بغیر اور ہنی مون کا مزا برفباری کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ کیوں ڈیٹو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

ڈیٹو نے کہا "مائی باپ' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ عالم لوک ہو۔ ویسے ہنی مون میں نے بھی ایک دفعہ کھادا تھا۔ کوئی خاص مزا نہیں آیا تھا۔ خالص ہنی مون تو اب کہیں ملتا ہی نہیں ہے۔" خان رحیمی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "اوئے میراثی کے بچے یہ ہنی مون کھایا نہیں منایا جاتا ہے۔" ڈیٹو نے بات بدلی "بس جی! آپ مناتے ہوں گے۔ ہم میراثی لوگ تو کھاتے ہیں۔ اپنا اپنا ٹے سٹ ہوتا ہے نا"

"وٹ ٹے سٹ۔ یہ ٹے سٹ کیا ہے؟"

میں نے وضاحت کی کہ "ٹیسٹ۔ ٹی اے ایس ٹی"

خان رحیمی نے ڈیٹو کو انگلش میں ایک دو بے ضرر گالیاں دیں اور پھر شوقیہ کو چائے کے لئے آوازیں دینے لگا۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ خان رحیمی اور ڈیٹو میں اتنی جلدی بے تکلفی پیدا ہو گئی ہے۔ در حقیقت مزاح خان رحیمی کی کمزوری تھا اور کوئی بھی مزاحیہ شخص اسے اپنا گرویدہ کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ چائے کے دوران میں نے خان رحیمی کو اپنی کتھا سنانی شروع کی.... میں اب اس سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ یوسف کے ساتھ اپنی اولین ملاقات سے لے کر شاہ دین ٹوانہ کے فارم تک

پہنچنے اور وہاں سے باز حاصل کرنے تک سب کچھ حرف بحرف میں نے خان رحیمی کو بتا دیا۔ اگر چھپایا تو صرف سلیم کا کردار۔ میں نے اسے بابری ہی کے نام سے متعارف کرایا اور خان کو بتایا کہ اس نے باز کو فارم سے نکالنے میں ہر طرح میری مدد کی ہے۔ ویسے میرے بتانے سے پہلے ہی خان رحیمی اور بابری ایک دوسرے کو پہچان چکے تھے۔ میواتی گاؤں کے اکھ میں وہ دونوں ہی موجود تھے۔ خان رحیمی یہ سن کر بے حد حیران ہوا کہ جس وقت میں اس سے پینتالیس ہزار روپیہ وصول کر رہی تھی۔ اس وقت یوسف اس کوٹھی کے ایک کمرے میں موجود تھا۔

مختصر یہ کہ خان رحیمی ہم تینوں کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوا' اور بات تھی بھی متاثر ہونے والی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ ہم نے وہ لاکھوں روپے کا باز بہ رضا و رغبت خان رحیمی کے حوالے کر دیا تھا (اپنی گفتگو کے دوران انگریزی کا سہارا لیتے ہوئے میں نے خان کو یہ بھی جتا دیا تھا کہ میں اور سلیم باز کی اصل قیمت سے آگاہ ہیں) خان رحیمی دیر تک ہم تینوں سے اس مہم کی تفصیلات دریافت کرتا رہا۔ تقریباً تمام شب یہ محفل جمی رہی۔ صبح چار بجے ہم آرام کرنے کے لئے اٹھے۔ خان رحیمی نے بتایا کہ اسے ایک ضروری کام سے جانا ہے' پرسوں اس کی واپسی ہوگی اور باز کی حصولیابی کے سلسلے میں ڈیرے پر جشن منایا جائے گا۔

اس روز دوپہر کے وقت میں بیدار ہوئی تو پتہ چلا کہ خان رحیمی کہیں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔ ڈرائنگ روم کے سامنے سے گزری تو خان رحیمی پر نظر پڑ گئی۔ وہ شیشے کے ایک چوکور ٹکڑے پر جھکا ہوا بغور کسی سفید سفید چیز کا معائنہ کر رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سن کر چونک گیا اور مجھے اندر بلا لیا۔

"یہ دیکھو گرل" اس نے بڑی اپنائیت سے کہا "پہچانو یہ کیا ہے" میں غور کیا تو کراہت سی آ گئی۔ شیشے کے ٹکڑے پر کسی پرندے کی بیٹ تھی۔ ایک بیٹ مکمل تھی جبکہ دوسری کو کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

"جانتی ہو یہ کس کی بیٹ ہے؟" خان رحیمی نے پوچھا۔

میں نے کہا "باز ہی کی لگتی ہے۔"

وہ بولا "کسی حد تک ٹھیک کہتی ہو مگر یہ ایسٹرن گوزہاک نہیں۔ میرا قیافہ ہے کہ

گولڈن ایگل ہے۔ ہمالین گولڈن ایگل.... اس بیٹ کے اندر تم یہ سیاہ داغ دیکھ رہی ہو' یہی اس کی نشانی ہے' یہ بھی کافی قیمتی پرندہ ہوتا ہے مگر جس پرندے کی یہ بیٹ ہے' یہ ابھی نوخیز ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے پر پہلی بار نکلے ہیں...."

بازوں' عقابوں اور شاہینوں کے متعلق خان رحیمی کی معلومات بہت وسیع تھیں....

وہ اپنی عینک کو ناک کی چونچ پر آگے پیچھے حرکت دے کر مختلف زاویوں سے بیٹ کو دیکھ رہا تھا جیسے یہ بیٹ نہ ہو کوئی قیمتی ہیرا ہو اور خان رحیمی کو اس کی شناخت کرنی ہو۔ کچھ دیر بعد اس نے عینک اتار کر مطمئن انداز میں سر ہلایا اور کسی ملازم کو آوازیں دینے لگا۔ کسی نے پوچھا۔

"جناب کہیں جا رہے ہیں؟"

وہ بولا "ہاں جانا ہی پڑے گا۔ یہ بیٹ کا نمونہ دریا پار کے جنگل سے مصطفیٰ نے بھیجا ہے۔ بڑا پرانا شکاری ہے مصطفیٰ۔ کبھی دھوکا نہیں کھاتا۔ یہ پرندہ یقیناً اس جنگل میں موجود ہے۔ ہم نہ پہنچیں گے تو کوئی اور لے جائے گا۔"

میں نے پوچھا "واپسی کب تک ہوگی؟"

"دو راتیں تو لگ ہی جائیں گی' پرسوں تھرس ڈے کو صبح سویرے پہنچ جاؤں گا۔ باقی گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تین چار رائفل مین یہاں موجود ہیں۔ میرا بھتیجا بھی ادھر موجود ہے۔ شاہ دین کوئی رسک لینے کی حماقت نہیں کرے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی آدمی کو بات چیت کے لئے بھیجے۔ ایسے میں جاوید اس سے ڈیل کرلے گا۔ یو ڈونٹ وری!"

خان رحیمی کے ساتھ پوری شکاری پارٹی جا رہی تھی۔ دو جیپیں تھیں ایک پک اپ میں سامان لادا جا رہا تھا۔ جال' لوہے کے ڈنڈے' بندوقیں وغیرہ۔ سہ پہر کے وقت یہ لوگ روانہ ہو گئے۔ سلیم نے شکار کے سلسلے میں اپنا اشتیاق ظاہر کیا تو خان رحیمی نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔

وہ تین بجے روانہ ہوئے۔ قریباً چار بجے شوقیہ میرے پاس آئی۔ میں اس وقت یوسف کے ساتھ اپنے سابقہ کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس نے بڑی نخوت سے اطلاع دی کہ کوئی عورت باہر مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

میں نے پوچھا "کون ہے؟"

بولی "ماتھے پر تو نام نہیں لکھا ہوا' خود ہی جا کر دیکھ لو۔"

میں نے کہا "میرا پوچھ رہی تھی!"

بولی "نہیں۔ کہتی تھی بابری سے ملنا ہے۔ بابری نہیں تو خان رحیمی سے ملوا دو۔ میں نے کہا وہ دونوں نہیں ہیں کہنے لگی پھر یوسف یا اس کی بہن سے ملوا دو۔"

میں شش و پنج میں پڑ گئی۔ مجھ سے ملنے یہاں کون آ سکتا تھا۔ میں نے ایک ملازمہ سے کہا کہ ملاقاتی عورت کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔

شوقیہ نے کہا "بڑا کہا تھا میں نے اسے' کہتی ہے یہیں بات کروں گی۔ گیٹ کے سامنے ٹیکسی میں بیٹھی ہوئی ہے۔"

میں الجھن کو جھٹک کر شوقیہ کے ساتھ ساتھ باہر آئی۔ طویل صحن طے کر کے گیٹ پر پہنچی تو سامنے ہی پیلی چھت والی کالی ٹیکسی نظر آئی۔ پچھلی نشست پر کوئی برقعہ پوش بیٹھی تھی۔ ڈرائیور گاڑی سے نکل کر درختوں میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے کھڑکی میں جھک کر کہا۔ "جی فرمایئے!"

عورت نے رخ میری طرف موڑا۔ اس کے چہرے پر دوہرا نقاب تھا۔ کھنک دار آواز میں بولی۔ "اندر آ جاؤ میں نے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"میں نے پوچھا۔ "لیکن آپ ہیں کون؟"

وہ بولی۔ "میرا نام عشرت ہے۔ شاہ دین فارم سے آئی ہوں۔"

اس کا یہ فقرہ مجھے ہلا کر رکھ گیا۔ اس عشرت کو سلیم غسل خانے میں بندھا چھوڑ آیا تھا۔ میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا اور اس کے برابر بیٹھ گئی۔ وہ نقاب کی اوٹ سے بولی۔

"تم وہی ہو نا جسے یوسف نے اپنی بہن بتایا تھا!"

"ہاں وہ مجھے اپنی بہن ہی کہتا ہے۔"

عورت نے ہاتھ بڑھا کر اپنا نقاب بائیں جانب الٹ دیا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور آنکھیں تھرا کر رہ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے تو یوں لگا جیسے میری بڑی بھائی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ ہو بہو وہی چہرہ' وہی ناک نقشہ۔ میں نے آنکھوں کو زور سے جھپکا اور

حواس بحال کئے۔ یہ لڑکی جو اپنا نام عشرت بتا رہی تھی 80 فیصد میری بھابی کی تصویر تھی۔ اگر اس کا چہرہ ذرا سا فربہ اور عمر چند سال زیادہ ہوتی تو شاید میرے لئے اسے پہچاننا مشکل ہو جاتا۔

"کیا بات ہے تم حیران ہو گئی ہو؟" عشرت نے پوچھا۔

"ن.......... نہیں تو.........." میں نے خود کو کمپوز کیا۔

وہ بولی۔ "بابری کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہ تھوڑی ہی دیر پہلے کسی کام سے گیا ہے۔"

"کب تک آ جائے گا؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میرا خیال ہے ایک دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

عرشت نے ہونٹ سکوڑے' اس کے چہرے پر الجھن تھی' آخر ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "سچ سچ بتاؤ' تمہارا اصل نام کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے میں نے اپنا غلط نام آپ کو کبھی نہیں بتایا۔ میرا نام شاہدہ ہے۔" (اسی نام سے میں نے خان رحیمی کے پاس ملازمت حاصل کی تھی)

معلوم نہیں عشرت کو میری بات کا یقین آیا یا نہیں بہرحال وہ مجھے اسی نام سے پکارنے پر تیار ہو گئی۔ بولی۔ "شاہدہ تم سلیم کی کیا لگتی ہو۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کچھ تو لگتی ہو گی جو تمہارے لئے اس نے شاہ جی کو اتنا بڑا دھوکا دیا۔" عشرت کے لہجے میں رقابت کی جھلک تھی۔

"دیکھیں عشرت صاحبہ! آپ اپنے کام کی بات کریں۔"

"ارے' تم تو برا مان رہی ہو۔ میں نے ایک رسمی بات کی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ایسی ہی رسمی بات میں بھی کر سکتی ہوں' آپ اس کی کیا لگتی ہیں؟"

عشرت کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل میں چور ہے گڑبڑا کر بولی۔ "دیکھو' میں اس وقت بحث میں پڑنا نہیں چاہتی' ایک بڑی ضروری اطلاع لے کر یہاں آئی ہوں۔"

"جی فرمایئے۔"

عشرت نے نقاب کو گھونگھٹ کی طرح تھام کر کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھا جیسے ڈر ہو کہ کوئی سن نہ لے۔ اس کی آنکھوں سے سراسیمگی جھلکنا شروع ہو گئی تھی۔ بولی۔ "کیا تم بتا سکتی ہو کہ خان رحیمی اور دوسرے لوگ کہاں گئے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔"

وہ بولی۔ "مگر مجھے پتہ ہے' وہ باز کے شکار پر گئے ہیں اور مصطفیٰ نامی شکاری نے انہیں اس باز کے بارے میں خبر دی ہے۔"

میں حیرت سے عشرت کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سو فیصد درست کہہ رہی تھی۔ عشرت نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "تم لوگوں کے ساتھ بڑا دھوکا ہوا ہے شاہدہ' بڑا زبردست نقصان ہونے والا ہے خان رحیمی کا۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"خان رحیمی کو جان بوجھ کر یہاں سے بھیجا گیا ہے۔ یہ ساری شاہ جی کی چال ہے۔ مجھے بتاؤ ان لوگوں کو یہاں سے گئے کتنی دیر ہوئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہی کوئی ایک گھنٹہ ہوا ہے۔"

وہ بولی۔ "تو انہیں فوراً واپس بلانے کا انتظام کرو۔ ورنہ شاہ جی اور ان کے آدمی اس کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

میں سن ہو کر رہ گئی۔ عشرت کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی وہ نایاب باز اس وقت کوٹھی میں تھا اور خان رحیمی شکار پر۔ ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ عشرت نے مزید بتایا کہ شاہ جی اور اس کے آدمی بھکر سے روانہ ہو چکے ہیں اور کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ شاہ دین پہلے اپنے صرف ایک آدمی کے ساتھ خان سے ملنے کے بہانے کوٹھی آئے گا۔ اگر حالات سازگار ہوئے یعنی خان رحیمی اور اس کے مسلح کارندے موجود نہ ہوئے تو وہ کوٹھی میں ہی رک جائے گا۔ آدھ پون گھنٹے بعد اس کے باقی ساتھی بھی کوٹھی پر آ دھمکیں گے۔ دوسری صورت میں وہ خان رحیمی سے دعا سلام کے بعد فوراً واپس جانے کی کوشش کرے گا.......... میں نے عشرت سے پوچھا کہ وہ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہے۔

وہ بولی۔ "دیکھو تم اب وقت ضائع نہ کرو۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے خان رحیمی اور

بابری کو واپس بلالو۔" پھر اپنی نیلی کلائیاں مجھے دکھا کر بولی۔ "یہ دیکھو' ظالم اتنی زور سے مجھے باندھ کر آیا تھا' کوئی اور ہوتی تو اس پر تھوکتی بھی نہ۔ یہ مرد ہوتے ہی ہرجائی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "عورتیں بھی ہوتی ہیں۔"

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا' پھر نقاب ڈال کر بولی۔ "ڈرائیور کو بلاؤ میں اب جاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "ایک بات میں بھی پوچھ سکتی ہوں؟"

وہ نقاب الٹ کر بولی۔ "پوچھو............ لیکن جلدی۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری شکل کی ایک عورت میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے' شاید لاہور میں کسی شادی پر' تمہاری کوئی بہن لاہور میں رہتی ہے؟"

میں نے صاف دیکھا عشرت کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ بولی۔ "نہیں تو میری تو کوئی بہن نہیں' ہو سکتا ہے مجھے ہی دیکھا ہو۔"

میں نے کہا۔ "نہیں' وہ تو اپنا نام شاید امینہ یا ثمینہ بتاتی تھی۔"

عشرت کے چہرے نے ایک بار پھر رنگ بدلا۔ بظاہر لاپرواہی سے بولی۔ "ہوگی کوئی............ ویسے تمہیں احساس نہیں کہ میں کس مشکل سے یہاں پہنچی ہوں اور نہ ہی یہ احساس ہے کہ تھوڑی دیر بعد یہاں کیا ہونے والا ہے' تم خان رحیمی کو بلانے میں ایک لمحے کی دیر نہ کرو' مجھے اجازت دو' میں چلتی ہوں۔" اس نے کھڑکی سے سر نکال کر ڈرائیور کو آواز دی۔ وہ جلدی سے ڈرائیونگ نشست کی طرف بڑھا میں باہر نکل آئی۔

اس نے برقعے کے اندر سے کہا۔ "شاہدہ' جلدی کرو۔" میں نے سر کے اشارے سے "اچھا" کہا۔ ٹیکسی فراٹے بھرتی ہوئی واپس روانہ ہو گئی۔

خوش قسمتی سے ایک گاڑی اس وقت کوٹھی میں موجود تھی۔ میں نے ایک رائفل مین سردار محمد سے مشورہ کیا اور اسے ساری صورت حال بتا کر ریٹو کے ساتھ شکار پارٹی کے پیچھے روانہ کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کوٹھی کے بیرونی گیٹ کو اندر سے تالا لگوا دیا اور باقی تمام دروازے بھی بند کرا دیئے۔ اس کی بعد خان رحیمی کے تینوں سینٹ برنارڈ کتے لان میں کھلے چھوڑ دیئے۔ یہ کتے اتنے جسیم تھے کہ اندھیرے میں دیکھنے والا کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کتے ہیں۔ سینٹ برنارڈ نسل کے عام کتوں کی طرح ان

کے جسم بالوں سے بھرے ہوئے تھے............ شیخ والا باز اس وقت خان رحیمی کے خاص کمرے میں تھا اور ایک آدمی اس کی نگرانی پر مقرر تھا۔ میں نے رنگو نامی شخص کو ساری صورت حال بتائی اور اسے کہا کہ وہ باز لے کر تہہ خانے میں چلا جائے۔ کوٹھی میں رائفل مینوں کے علاوہ اس وقت گیارہ ملازم اور تھے ان میں ایک خانساماں' ایک باورچن' ایک ہیلپر' دو مالی' تین صفائی ستھرائی والی عورتیں' دو خدمت گار اور ایک شوقیہ تھی' مگر میرے سمیت ان میں کوئی بھی رائفل کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ ہم سب کوٹھی کی بالائی منزل پر آ گئے اور خان رحیمی کی واپس کا انتظار کرنے لگے۔ سورج دور مغربی جنگل میں ڈوب گیا تھا۔ خنکی کا ہاتھ تھام کر تاریکی کی سبک گام پرچھائیاں ہر طرف پھیلتی جا رہی تھیں۔ پرندوں کی چہچہاہٹ دھیرے دھیرے پرسکون خاموشی میں بدلنے لگی۔ یہ خاموشی اپنے دامن میں خطرے سمیٹے ہوئے تھی۔ مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ خان رحیمی جیسے جہاندیدہ شخص کو ایسی غلطی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ شاید حد سے بڑھی ہوئی خوداعتمادی نے اسے اس جال میں پھنسایا تھا۔ یا پھر شکار کا انتہا کو چھوتا ہوا شوق اس کوتاہی کا سبب تھا۔ بہرحال کچھ بھی تھا' اب میری دعا تھی کہ کوئی سانحہ رونما ہونے سے پہلے وہ لوگ لوٹ آئیں............

ہر پل گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتا رہا تقریباً ساڑھے آٹھ بجے دور درختوں میں گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں۔ ہم سب کے دل شدت سے دھڑکنے لگے' ان روشنیوں کے عقب میں کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ شاہ دین ٹوانہ بھی اور خان رحیمی بھی' اہل خانہ بھی اور دشمن خانہ بھی۔ کوٹھی میں موجود دونوں رائفل مین اور چوکیدار سبحان خان تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ گاڑیاں ہچکولے کھاتی قریب پہنچیں تو پھر کسی نے خان رحیمی کی چوکور بتی والی جیپ پہچان لی۔ سینے سے شکر کا سانس نکلا۔ خان رحیمی' سلیم اور دوسرے لوگ گاڑیوں سے نکل کر تیز قدموں سے کوٹھی کے اندر آئے۔ ریٹو اور سردار محمد کی زبانی انھیں کافی کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ باقی کی تفصیل انھیں میں نے بتا دی۔ سلیم میری باتوں سے سمجھ گیا کہ یہ اطلاع پہنچانے والی لڑکی وہی عشرت ہے۔

خان رحیمی کے چہرے پر ہلکی سی خجالت تھی۔ وہ ایک گھاگ شخص تھا۔ ایسی غلطی اس سے شاذ ہی ہوئی ہو گی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"دیکھا گریٹ گرل' ہم جیسے بوڑھوں کو بھی یہ دنیا چکر دینے سے باز نہیں آتی۔ بہرحال......... ویل ڈن' تم نے بروقت فیصلہ کیا ہے' مگر یہ لڑکی کون ہے؟"

میں نے سلیم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہو گی کوئی آپ کی ہمدرد۔"

سلیم نے کہا۔ "خان جی' کیوں نہ یہ گاڑیاں پچھلے صحن میں کھڑی کر دیں!"

خان رحیمی بولا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے۔ انہیں پیچھے لے جاؤ اور وہاں کی لائٹس بھی آف کر دو۔"

اس کے بعد خان رحیمی نے اپنے مسلح گارڈوں کو کوٹھی کی چھت پر بھیج دیا۔ ان کی تعداد پندرہ سے کم ہرگز نہیں تھی۔ سب کے پاس طاقتور رائفلیں' موزر اور پستول تھے۔ میں سمجھ گئی کہ راستے میں خان رحیمی اور اس کے ساتھی شاہ دین کے سلسلے میں کوئی پلاننگ کر چکے ہیں۔

اس وقت نو بجے تھے جب کوٹھی کے گیٹ پر ایک جیپ آ کر رکی۔ خان رحیمی' سلیم' سردار محمد' یوسف اور میں دوسری منزل پر سامنے والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ کھڑکیوں سے گیٹ کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ جیپ سے شاہ دین ٹوانہ اپنے ذاتی محافظ شیر محمد کے ساتھ اترا۔ شیر محمد کے سر پر بڑی سی پٹی تھی یہ پٹی اس ٹکر کی مرہون منت تھی جو سلیم نے فارم سے نکلتے وقت شیر محمد کے ماتھے پر ماری تھی۔ شیر محمد جیسا مضبوط اور کڑیل شخص اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا مگر سلیم کی اس ٹکر نے اس کے سارے کس بل ایک پل میں نکال دیئے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی سلیم کے سر میں' میں نے جس کسی کو بھی اس کی ضرب کھاتے دیکھا تھا وہ پھر اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہا تھا......... ہم نے دیکھا شاہ دین ٹوانہ چوکیدار سے کوئی بات کر رہا ہے۔ پھر چوکیدار نے ایک ملازم کو بلا کر کچھ کہا اور وہ تیز قدموں سے کوٹھی کی طرف بڑھ آیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ آ کر ہمیں اطلاع دے رہا تھا کہ مہمان پہنچ گئے ہیں۔ خان رحیمی نے رائفل مین سردار محمد اور دینو کو بھیجا کہ وہ ڈرائنگ روم میں جا کر شاہ دین سے بات کریں۔ اس کے بعد اس نے مجھے کہا میں ان کی باتیں سنوں۔ سردار محمد اور دینو چلے گئے تو چند منٹ بعد میں بھی زینے اتر کر ڈرائنگ روم کی طرف آ گئی۔ ایک دروازے کی درز سے میں نے اندر جھانکنا شروع کیا۔ شاہ دین ٹوانہ اور شیر محمد صوفوں پر بیٹھے تھے۔

سامنے ہی خان رحیمی کا رائفل مین سردار محمد ایک کرسی پر موجود تھا اور اس کے ساتھ دینو مودب کھڑا تھا۔ سردار محمد کہہ رہا تھا۔

"کچھ بتا کر نہیں گئے جناب لیکن آج رات تو نہیں آئیں گے۔"

شاہ دین نے کہا۔ "کوئی شکار وکار کا چکر تو نہیں!" سردار محمد نے اثبات میں جواب دیا۔ شاہ دین بولا۔ "پھر تو پوری پارٹی گئی ہو گی!"

سردار محمد نے کہا۔ "ہاں جناب' پندرہ بیس بندے گئے ہیں۔"

میں نے دیکھا شاہ دین کی گھنی مونچھوں کے نیچے ایک مطمئن مسکراہٹ کھیل گئی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ جما کر بولا۔ "پہلے پتہ ہوتا تو اتنا لمبا چکر نہ پڑتا۔"

سردار محمد بولا۔ "خان صاحب نہیں تو کیا ہوا' ہم آپ کے خادم تو ہیں آپ رات یہیں رہیے۔ کیا پتہ کل وہ آ ہی جائیں۔"

شاہ دین نے کہا۔ "ہاں' تھکاوٹ بھی بہت ہو گئی ہے' یہ جنگل کا راستہ تو دن بدن خراب ہی ہوتا جا رہا ہے' پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں......... ویسے بھی دو دن سے بھاگے پھر رہے ہیں۔"

"کیوں جناب' خیر ہے؟" سردار محمد نے پوچھا۔

"وہی......... وہ شیخ والا باز گم ہو گیا ہے۔" شاہ دین نے جواب دیا۔

سردار محمد نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "شیخ والا باز' آپ کے پاس تھا؟"

"ہاں تھا تو ہمارے پاس ہی۔"

سردار محمد نے کہا۔ "ہم تو سمجھتے رہے وہ چودھری شہاب کے بندے لے اڑے تھے یا پھر ان شہری منڈوں میں سے کوئی ہاتھ دکھا گیا ہے۔"

شاہ دین نے گہری سانس بھری۔ "سمجھنے کو تو کچھ بھی سمجھا جا سکتا ہے...... خان رحیمی یہاں ہوتا تو اس سے دل کے دکھڑے پھولتے۔ خیر اب جیسے تیسے رات تو گزارنی ہی پڑے گی۔"

سردار محمد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے لئے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرتا ہوں۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ دینو جدی پشتی خادموں کی طرح ہاتھ ناف پر باندھے خاموش کھڑا تھا۔ شیر محمد نے کہا۔ "او کدو' ادھر آ۔"

"جی جناب!" ڈیٹو نے جھک کر جواب دیا۔

"اوئے اور کتنے بندے ہیں کوٹھی میں؟؟"

ڈیٹو نے کہا۔ "جی مجھ سمیت کوئی دس جانے ہیں۔"

"شاہ دین بولا۔ "اوئے گندی ہانڈی کے چمچے تو بھی بندوں میں شمار ہے؟"

ڈیٹو نے کہا۔ "سارے میرے جیسے ہی ہیں۔ جو میرے جیسے نہیں تھے وہ شکار کھیڈن چلے گئے ہیں۔"

شاہ دین نے پوچھا۔ "کیا مطلب' بندوقوں شندوقوں والے سارے چلے گئے!"

"بس جی ایک دو تین ہی ہوں گے۔"

شاہ دین نے کہا "اوئے ایک دو تین کیا بات ہوئی۔ ٹھیک بتا ایک دو ہیں یا تین ہیں؟"

اس وقت بغلی دروازہ کھلا اور خان رحیمی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ شاہ دین کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ "مجھ سے پوچھو شاہ دین اس بے چارے کو کیا معلوم ہو گا۔"

شاہ دین کا رنگ زرد ہو گیا۔ تاہم اس نے خود کو بڑی تیزی سے سنبھالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے گرمجوشی نمودار ہوئی۔ "اوہ خان صاحب! آپ کہاں سے آ نکلے۔" دونوں نے آگے بڑھ کر معانقہ کیا۔ خان رحیمی دیر تک شاہ دین کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ شاہ دین نے کہا۔ "میں تو مایوس ہو کر جانے ہی والا تھا آپ کے بندے نے بتایا آپ شکار پر گئے ہوئے ہیں۔"

خان رحیمی نے کہا۔ "ہاں گیا تو شکار پر ہی تھا پھر پتہ چلا کہ اور بھی کئی "پارٹیاں" نکلی ہوئی ہیں۔ سوچا اگلے ویک اینڈ کو سہی۔"

"تو کیا راستے ہی سے واپس آ گئے؟"

"ہاں......... بس آپ سے ملاقات ہونی تھی......... اور سنائیں کیسے آنا ہوا۔ میواتی گاؤں سے تو آپ ایسے غائب ہوئے کہ پھر شکل ہی نہیں دکھائی۔ اس باز کا بھی کوئی پتہ نہیں چلا۔ مارا ماری میں معلوم نہیں کون لے گیا۔ چلو......... میواتیوں کے ہاتھ تو نہ آیا۔"

شاہ دین نے کہا۔ "میرے تین چار بندوں کو پولیس لے گئی تھی۔ اسی چکر میں پڑا رہا ورنہ آپ سے تو ضرور ملنا تھا۔"

"کیوں......... خیرت تو تھی نا؟"

شاہ دین نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "دراصل خان صاحب! وہ باز میرے ہی ایک بندے نے پکڑا تھا۔ وہی بابری جس نے چودھری صلو کی چارپائی اٹھائی تھی۔"

خان رحیمی نے اس اطلاع پر حیرت کا اظہار کیا پھر بولا۔ "یہ بابری وہی ہے نا لمبا سا' مریل سا!" شاہ دین نے اثبات میں جواب دیا۔ خان رحیمی نے کہا۔ "میرے ایک بندے کو بھی مار دیا تھا اس نے......... خیر اندھیرے میں پتہ نہیں کون کس سے لڑ رہا تھا۔"

شاہ دین ہنس کر بولا۔ "ویسے تو آپ کے ڈرائیور نے بھی میری گاڑی اٹھانے کی کوشش کی تھی۔"

خان رحیمی نے قہقہہ لگایا۔ "اور آپ کے بندے نے گولی مار کر اس کا ٹائر برسٹ کر دیا تھا۔" شاہ دین کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ خان رحیمی بولا۔ "ہاں......... تو کیا کہہ رہے تھے آپ بابری کے بارے میں؟"

شاہ دین توانہ نے بابری کو ایک گالی دے کر کہا۔ "وہ غداری کر گیا ہے۔ پرسوں باز ساتھ کہیں نکل گیا ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا ہوا ہے۔ میرا خیال تھا۔ معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو سارے شکاری بھائیوں کو بلاؤں اور ہم مل جل کر اس پرندے کا معاملہ طے کر لیں......... دو تین دن سے وائلڈ لائف والے بھی گھومتے پھر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کے پاس بھی آئیں گے۔"

خان رحیمی نے کہا۔ "آپس کی انڈر سٹینڈنگ بڑی چیز ہے شاہ دین! مگر ہم لوگوں کو وقت اس کا خیال نہیں آتا۔"

اسی دوران چائے اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ آ چکی تھی۔ چائے کے ساتھ ساتھ خان رحیمی اور شاہ دین کی باتیں بھی جاری تھیں۔ یہ بڑی پہلودار اور ذومعنی باتیں تھیں۔ دونوں موجودہ صورت حال سے انجان بنے ہوئے تھے اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چائے ختم ہوتے ہی شاہ دین جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

کہنے لگا۔ "خان صاحب! بہت پریشان ہوں۔ جب تک وہ بدبخت بابری مل نہیں

جائے گا چین نہیں آئے گا مجھے۔ بس اب اجازت دیجئے۔"

خان رحیمی نے حیران ہو کر کہا "ابھی تو آپ فرما رہے تھے کہ بہت تھکے ہوئے ہیں اور رات یہیں رہیں گے۔" شاہ دین گڑبڑا گیا۔ خان رحیمی نے کہا "کیوں سردار محمد یہی کہا تھا نا ٹوانہ صاحب نے!"

سردار محمد نے کھیسیں نکال کر کہا "درست فرما رہے ہیں آپ۔"

خان رحیمی بولا "میری غیر موجودگی میں آپ یہاں رات گزار رہے تھے اور میں آگیا ہوں تو جانے کی فکر میں ہیں۔"

شاہ دین نے "میں نے عرض کیا ہے نا کہ طبیعت کچھ پریشان سی ہے۔ انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔"

خان رحیمی نے خوشدلی سے کہا "اگر میری موجودگی سے طبیعت پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے تو بتادیں۔ آپ نے آنا ہو گا تو میں موقع سے ادھرادھر ہو جاؤں گا۔"

شاہ دین نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا۔ اس کی پیشانی پر اب پسینہ چمک رہا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا تاکہ پروگرام کے مطابق اس کے مسلح آدمی دندناتے ہوئے نہ پہنچ جائیں جبکہ خان رحیمی "میزبانی" کا ہر تقاضہ پورا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ شاہ دین کو پکڑ پکڑ کر بٹھا رہا تھا۔

"نہ شاہ صاحب! کھانے کے بغیر تو اب آپ کو نہیں جانے دوں گا۔ ناممکن! اب تو پندرہ بیس منٹ کی بات ہے۔ ابھی دسترخوان لگ جاتا ہے۔ لیجئے یہ سوپ کی خوشبو تو آنے بھی لگی۔ جتنی دیر کھانا لگے ہم سوپ سے نبٹ لیتے ہیں۔ سوپ سے ایک بڑا اچھا لطیفہ یاد آگیا ہے.........."

خان رحیمی نے کسی نہ کسی طرح شاہ دین کو کھانے پر روک ہی لیا۔ کھانے کے دوران شاہ دین کی بے چینی دیکھنے کے لائق تھی۔ کبھی کبھی وہ جھلا سا جاتا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ دفعتاً گیٹ کی طرف گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ ذرا دیر بعد رائفل مین سردار محمد بھاگتا ہوا آیا۔

"خان صاحب! دو گاڑیوں پر کوئی ایک درجن بندے گیٹ پر پہنچے ہیں۔ سب کے پاس رائفلیں اور بندوقیں ہیں۔ چوکیدار سبحان خان کو دھمکیاں دے رہے ہیں کہ گیٹ

کھولو ورنہ توڑ دیں گے۔"

خان رحیمی نے مصنوعی حیرت سے کہا "کون باشرڈ ہیں؟"

سردار محمد بولا "ان میں شاہ صاحب کا چھوٹا بھائی عتیق بھی ہے۔"

"اوہو.......... تو یوں کہو نا کہ مہمان آئے ہیں۔ چوکیدار نے ان سے کوئی بدتمیزی کی ہوگی۔ بلاؤ ان کو اندر۔ گو اینڈ ہری اپ"

میں دروازے کی اوٹ سے یہ عجیب و غریب تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ہر شخص ہر بات سمجھ رہا تھا پھر بھی درمیان میں ایک مہین پردہ سا تھا۔ ماحول میں زبردست کھچاؤ تھا اور یہ کھچاؤ ہر لحظہ بڑھ رہا تھا۔ میں نے خانوں' وڈیروں اور سرداروں کے بارے میں جو کچھ سن رکھا تھا اس کی ایک جھلک اس تازے کی کھینچاتانی میں بھی نظر آرہی تھی۔ خان رحیمی نے اٹھتے ہوئے کہا "آؤ.......... مسٹر شاہ دین نئے مہمانوں کا استقبال کریں۔"

وہ سب اٹھے اور آگے پیچھے چلتے باہر پورچ میں آگئے۔ خان رحیمی کے پیچھے کم از کم اٹھارہ مسلح افراد تھے۔ خود رحیمی کے کندھے سے بھی ریوالور جھول رہا تھا۔ اپنی جگہ ہر شخص پر سکون نظر آنے کی کوشش میں تھا۔ پورچ میں خان رحیمی کے تین تنو مند رکھوالے تین خوفناک کتوں کی زنجیریں تھامے کھڑے تھے۔ نہ جانے کیا بات تھی ان کتوں کو دیکھتے ہی جسم میں سردی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ میں برآمدے کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑی تھی۔ میرے سامنے کوٹھی کا بیرونی گیٹ کھلا اور شاہ دین کے دس گیارہ مسلح آدمی دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ ظاہر ہے اندر کا منظر ان کی توقعات کے برخلاف تھا۔ وہ اپنی جگہوں پر ٹھٹک کر رہ گئے۔ اب شاہ دین کے لئے کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں تھا۔ صورت حال پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ شاہ دین نے بدلتے ہوئے لہجے میں کہا:

"خان صاحب! بابری کہاں ہے؟ مجھے بابری چاہئیے۔"

خان رحیمی نے سگار سلگا کر ایک کش لیا اور اطمینان سے بولا "تو بابری کے لئے آئے ہو؟"

"بے شک.......... وہ میرا مجرم ہے۔"

خان رحیمی نے کہا "اس وقت وہ مجرم نہیں تھا جب میواتیوں کے گاؤں سے باز لے کر نکل گیا تھا۔"

"خان صاحب میں بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مہربانی کر کے آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔"

خان رحیمی نے کہا "شاہ دین اس پرندے کے لئے کھلا میدان تم نے خود لگایا تھا۔ اب تم کسی کو مجرم یا ڈاکو نہیں کہہ سکتے۔ تم میرے گھر میں ہو اور میرے مہمان ہو۔ مہمانوں کی عزت ہماری روایت ہے ورنہ میں تمہاری بات کا جوب تمہارے ہی انداز میں دیتا۔"

شاہ دین کا چھوٹا بھائی جو کچھ زیادہ ہی گرمی خورا تھا اچھل کر آگے آیا اور بھڑکیلے لہجے میں بولا "زیادہ گٹ مٹ نہ کر خان! اس کتے کو ہمارے حوالے کر دے ورنہ آج تماشہ ہو جائے گا یہاں۔"

اس کے گستاخ لہجے کو خان رحیمی کا ذاتی محافظ سردار محمد برداشت نہ کر سکا۔ کڑک کر بولا "زبان کو لگام دے سور" یکایک جیسے کوئی تنی ہوئی نادیدہ ڈور بیچ سے ٹوٹ گئی۔ شاہ دین کا بھائی بجلی کی طرح حرکت کر کے سردار محمد پر جھپٹا۔ میں نے پورچ کی روشنی میں ایک ساعت کے لئے دونوں کو گتھم گتھا دیکھا۔ خان رحیمی کی گرجدار آواز آئی ٹھہرو.......... ٹھہرو.......... مگر یہ ایک آواز ایک سینٹ برنارڈ کتے کی خوفناک غراہٹ میں دب کر رہ گئی۔ جیسے تیر کمان سے چھوٹتا ہے یا گولی بندوق کی نالی سے نکلتی ہے سینٹ برنارڈ اپنی زنجیر چھڑا کر بھاگا اور شاہ دین کے بھائی پر جا پڑا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ سردار محمد دھکا لگنے سے دور جا گرا ہے اور کتا شاہ دین کے بھائی عتیق سے گتھم گتھا ہو گیا ہے۔ دوسرے کتوں کی پرشور آوازیں بھی کانوں کو پھاڑ رہی تھیں۔ موقع پر موجود افراد پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ ایک دو بندوقیں سیدھی بھی ہوئیں لیکن کتا اور انسان اس طرح دست و گریباں ہو چکے تھے کہ گولی چلانا ناممکن تھا۔ یہ سارا ایک یا دو ساعتوں کا کھیل تھا پھر میں نے کتے کے رکھوالے کو دیکھا وہ چلاتا ہوا کتے کی طرف بڑھا مگر ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ کتے کے منہ میں عتیق کے گوشت کا سرخ لوتھڑا تھا اور اس کی خونخواری انتہا کو چھو رہی تھی۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا۔ دو تین سیکنڈ کے لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دوبارہ کھولیں تو ایک ناقابل گمان منظر دیکھا۔ بوڑھا خان رحیمی دیو ہیکل کتے سے لپٹا ہوا اسے شاہد دین کے بھائی سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کشمکش میں وہ تینوں بری طرح

پلٹیاں کھا رہے تھے۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ان لمحوں میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ موذی جانور خان رحیمی اور عتیق ٹوانہ میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ معاً اوپر تلے تین فائر ہوئے۔ دھماکوں سے درودیوار لرز اٹھے۔ یہ ہوائی فائر تھے اور کسی نے کتے کو ڈرانے کے لئے کئے تھے۔ غالباً سردار محمد کی رائفل سے ہوئے تھے۔ پھر کسی نے آگے بڑھ کر بڑی دلیری سے کتے پر بندوق کا کندا آزمایا۔ میں نے پہچان لیا یہ سلیم تھا۔ وہ تاک تاک کر کتے کے سر کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی شاہ دین کا ایک کارندہ بھی کتے پر لاٹھیاں برسانے لگا۔ ایکا ایکی کتے نے خان رحیمی اور عتیق کو چھوڑا اور بھاگتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ ہم سب دونوں زخمیوں کی طرف بڑھے۔ عتیق کی حالت دیکھ کر تو لگتا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس کی گردن سے گوشت کا ایک بڑا لوتھڑا غائب تھا۔ سینے اور بازوؤں پر بھی زخم تھے۔ وہ بالکل بے سدھ تھا۔ خان رحیمی کے پیٹ اور دائیں ران پر بھی گہرے زخم تھے۔ اس کی سرخ قمیض تار تار ہو چکی تھی۔ دونوں کو طبی امداد کی فوری ضرورت تھی۔ پانچ چھ آدمیوں نے مل کر انہیں اٹھایا اور بھاگتے ہوئے گاڑیوں کی طرف لپکے۔ ذرا سی دیر بعد کئی گاڑیوں کے انجن جاگ اٹھے اور ان کی ہیڈ لائٹس تاریکی میں گردش کرنے لگیں۔ وہ افراد جو تھوڑی دیر پہلے مرنے مارنے پر آمادہ تھے اب وہ شدید زخمیوں کو بچانے کی جدوجہد میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

اس رات خان رحیمی کی کوٹھی پر پیش آنے والے اس واقعے نے حالات کو بالکل نیا رخ دے دیا۔ شاہ دین کے بھائی کو بچانے کے لئے خان رحیمی نے جس طرح اپنا آپ داؤ پر لگا دیا تھا وہ قابل ستائش تھا اور ناقابل فراموش بھی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر ان لمحوں میں خان رحیمی یہ جرات نہ کرتا تو عتیق ٹوانہ کی جان نہ بچائی جا سکتی۔ اس وقت ایک سے بڑھ کر ایک جوان اور شہ زور موقع پر تھا۔ اس کا سگا بھائی بھی تھا لیکن عتیق ٹوانہ کے کام کوئی آیا تھا تو وہ خان رحیمی تھا۔

شاہ دین ٹوانہ نے بھی اس واقعے سے بہت اثر قبول کیا۔ خان رحیمی کو خون دینے کا موقع آیا تو شاہ دین نے نہ صرف خون دیا بلکہ اپنے آدمیوں سے بھی خون دلوایا۔ خان رحیمی کے پیٹ پر کتے کے بھنبھوڑنے سے گہرا زخم آیا تھا۔ تاہم آنتوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ایک آپریشن کے بعد اس کے پیٹ پر ٹانکے لگا دیئے گئے' ران کے زخم کو

بھی کسی حد تک سنبھال لیا گیا۔ عتیق کا بھی ایک پر خطر آپریشن ہوا اس کا بازو ٹوٹ چکا تھا۔ خان رحیمی تقریباً ایک ماہ ہسپتال میں رہا۔ یہ اس کی زندہ دلی اور جواں دلی تھی کہ ایک ماہ بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا ورنہ اس کی عمر کے پیش نظر ڈاکٹرز کا خیال تھا کہ اسے "ہیل اپ" ہونے میں دو تین ماہ لگ جائیں گے۔

شاہ دین اور خان رحیمی کے درمیان باز کا تنازعہ گفت و شنید کے ذریعے طے کر لیا گیا۔ مجھے ٹھیک طرح معلوم نہیں۔ اتنا پتہ ہے کہ خان رحیمی نے چند ایکڑ بارانی زمین فوری طور پر شاہ دین کے نام کر دی اور باز کی فروخت کے بعد کچھ نقد رقم دینا بھی قبول کی (جو زمین شاہ دین کو دی گئی اس کے بارے ان کے درمیان پہلے بھی کوئی تنازعہ چل رہا تھا۔ اس طرح نئے تنازعے کے طفیل یہ پہلا تنازعہ بھی ختم ہو گیا)۔ صلح صفائی ہو گئی تو شاہ دین کے دل میں سلیم' یوسف اور میرے بارے میں جو رنجش تھی وہ بھی دور ہو گئی اور اگر دور نہ ہوئی تو کم ضرور ہو گئی۔ شاہ دین نے سلیم کو خان رحیمی کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔

☆---------------☆---------------☆

اب خان رحیمی گھر آ چکا تھا۔ میری ذمے داری تھی کہ روز سویرے اس کے لئے چوزے کا سوپ تیار کرواؤں اور ناشتے کے ہمراہ اس کے کمرے میں پہنچاؤں۔ وہ مجھ پر خاصا اعتماد کرنے لگا تھا۔ اسی اعتماد کے سبب مجھے بعض اوقات "ہیڈ باورچن" کی ذمے داریاں بھی نبھانا پڑتی تھیں۔ شوقیہ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر جل رہی تھی۔ عملی طور پر کسی نے اس کی جگہ لے لی تھی اور اس کی ذمے داریاں مختصر ہو کر رہ گئی تھیں۔ تاہم اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ ذمے داریاں سونپنا خان رحیمی کا کام تھا۔ ایک دن میں باورچن سلطانہ سے خان رحیمی کے لئے ناشتہ تیار کروا رہی تھی کہ شوقیہ کے کمرے سے چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ میں اور سلطانہ بھاگ وہاں پہنچیں وہ ایک صندوق کھولے بیٹھی تھی۔ کپڑے اور دیگر اشیاء ادھر، ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ شوقیہ اونچی آواز سے رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا شوقیہ؟"

وہ بولی۔ "ہائے لٹ گئی۔ میری دونوں انگوٹھیاں اور جھمکے غائب ہیں۔" میں نے دیکھا قریب ہی زیور کا ایک خالی ڈبہ پڑا تھا۔ اتنے میں خانساماں اور ایک دو دوسرے ملازم

بھی آ گئے۔ شوقیہ رو رو کر بتانے لگی کہ یہ ڈبہ صندوق میں کپڑوں کے نیچے پڑا تھا۔ ابھی اس نے صندوق کھولا ہے تو ڈبہ خالی ملا ہے۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر پوری کوٹھی میں پھیل گئی۔ سب حیران تھے کہ ایسا کیونکر ہوا۔ انگوٹھیوں اور جھمکوں کی قیمت شوقیہ کے مطابق چھ سات ہزار سے کم نہیں تھی۔

میں خان رحیمی کی طرف گئی تو پتہ چلا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ صبح ہی صبح ڈرائیور کے ساتھ کہیں گیا ہے۔ اتنے میں باورچن سلطانہ بھی وہاں آ گئی۔ چپکے سے میرے کان میں کہنے لگی کہ وہ لومڑی یوسف پر شک کر رہی ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ یہ سب شوقیہ کی سازش ہے۔ یوسف ہفتے میں ایک آدھ بار مجھ سے ملنے گوپور سے کوٹھی چلا آتا تھا۔ کل سے وہ آیا ہوا تھا۔ یقیناً شوقیہ نے کوئی ڈرامہ کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ یوسف سے بھی بہت خار کھاتی تھی۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا۔ "یوسف کدھر ہے؟"

اس نے بتایا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے باہر نکلا ہے۔ مسواک کر رہا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ اب کیا کیا جائے۔ خان رحیمی بھی یہاں موجود نہیں تھا۔ ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ابھی میں کچھ سوچ رہی تھی کہ پڑوس کی طرف سے تیز تیز باتوں کی آواز آئی۔ باہر نکل کر دیکھا تو خان رحیمی کا بھتیجا باقر غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ شوقیہ بھی اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"کہاں ہے وہ الو کا پٹھا!" باقر نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ اس کا اشارہ واضح طور پر یوسف کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں ادھر ہی کہیں ہو گا' ابھی آ جاتا ہے۔"

باقر شوقیہ کی بہت سائیڈ لیتا تھا۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی......... چلا کر بولا۔ "وہ اب نہیں آئے گا چور بھی کبھی واپس آتا ہے۔ اس نے چوری کی ہے۔"

میں نے کہا۔ "باقر صاحب! اس طرح بغیر سوچے سمجھے الزام مت لگائیں وہ چور نہیں ہے۔"

شوقیہ روتے ہوئے بولی۔ "میں نے کل خود اسے اپنے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگا کہ باجی کو دیکھنے آیا تھا۔"

باقر نے پورے وثوق سے کہا۔ "یہ سو فیصد اسی کا کام ہے۔"

اتنے میں گیٹ کی طرف سے شور سنائی دیا میں نے دیکھا اور غصے کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ باقر کے دو آدمی یوسف کو بازوؤں سے گھسیٹتے ہوئے اندر لا رہے تھے۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور وہ لانے والوں سے الجھ رہا تھا۔ میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے باقر صاحب! کچھ شرم کرنی چاہئے آپ کو۔ آپ جانتے نہیں کہ خان صاحب کتنا ناراض ہوں گے اس بات پر!"

باقر نے کہا۔ "اگر وہ چور پکڑنے سے ناراض ہوں گے تو بے شک ہوا کریں۔"

مجھے باقر کی عقل پر افسوس آ رہا تھا۔ وہ شوقیہ کے بھڑکانے پر یوسف کو چند ہزار کے شبے میں گھسیٹ رہا تھا اور یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکے کے ہاتھوں سے انہیں لاکھوں کا فائدہ ہو چکا ہے۔ مجھے خان رحیمی کی بے حسی پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ از خود یوسف کے بارے میں کچھ سوچے گا۔ لاکھوں کا باز یوسف کی وجہ سے خان رحیمی کے قبضے میں آیا تھا۔ ان لاکھوں روپے میں سے چند ہزار پر تو یوسف کا حق بنتا تھا۔ مگر خان رحیمی جیسے یوسف کو بھول ہی چکا تھا۔ ایک ماہ گزرنے کے باوجود اس نے یوسف کے لئے کچھ نہیں کیا تھا اور اب اس کا بھتیجا اسے چوری کے شبے میں بے عزت کر رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ خان رحیمی نے باز کے سلسلے میں پینتالیس ہزار روپے دیئے تھے لیکن اس میں سے تو ایک پیسہ بھی یوسف کو نہیں مل سکا تھا۔

باقر نے یوسف کو تھپڑ مارے تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے چھڑانے کی کوشش کی۔ اتنے میں سلیم بھی آ گیا۔ سلیم کو دیکھ کر باقر کچھ ٹھنڈا پڑ گیا ورنہ ہو سکتا تھا وہ مجھ سے بھی زور آزمائی کرنے لگتا۔ سلیم نے باقر کو سمجھایا کہ وہ تحمل سے کام لے۔ چور جو کوئی بھی ہے کوٹھی کے اندر سے ہے۔ وہ بچ کر نہیں جائے گا۔

کوٹھی میں مسلح محافظوں سمیت کم و بیش پینتیس افراد اس وقت بھی موجود تھے۔ ان میں دس بارہ عورتیں اور باقی مرد تھے۔ اب معلوم نہیں یہ کس کا کام تھا اور یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ واقعی چوری ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ سلیم اور باقر نے یو۔ ن سے پوچھ گچھ کی۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے صاف انکار کیا کہ اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے۔ رائفل مین سردار محمد نے بھی اس کی طرف سے صفائی پیش کی۔ اس نے بتایا جس وقت یوسف

شوقیہ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ نین۔ کے چھپر تلے بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ یوسف زیادہ سے زیادہ آدھ منٹ کمرے میں رہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ صفائی کرنے والی نئی ملازمہ گلزار پرسوں سے غائب ہے۔ گلزار کا سن کر مجھے بھی شبہ ہوا۔ یہی لڑکی شوقیہ کے کمرے میں بھی صفائی کرتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہی ہاتھ دکھا گئی ہو۔ باورچن سلطانہ نے باقر سے کہا۔ "مالک! مجھے بھی گلزار پر شک ہو رہا ہے۔ اسے پیسوں کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ پرسوں مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اسے تین چار ہزار روپیہ کہیں سے ادھار لے دوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کہاں کی رہنے والی ہے وہ؟" سلطانہ نے بتایا کہ سندری گاؤں کی۔

باقر نے گرج کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ "بلا کر لاؤ اس کتیا کو بھی۔"

دو رائفل بردار تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ میں نے شوقیہ سے پوچھا۔ "صندوق کا تالہ بند تھا؟" اس نے ہاں میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ "آج سے پہلے تم نے ڈبیہ کب دیکھا تھا؟"

اس نے کہا۔ "دو تین ہفتے ہو گئے۔ چھوٹی عید پر جھمکے پہنے تھے۔"

میں نے کہا۔ "کوئی ضروری تو نہیں کہ چوری آج کل ہی ہوئی ہو۔"

میری اس بات پر سردار محمد گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔ "بی بی جی! آپ کی بات غور کرنے کے لائق ہے۔ کیا معلوم چوری ہوئے دو تین ہفتے ہو چکے ہوں اور شوقیہ بی بی کو اب پتا چلا ہو۔"

شوقیہ کی آنکھیں بھی سوچ میں ڈوب گئیں۔ شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ عید کے بعد وہ تین چار روز بیمار رہی تھی۔ قریباً سارے ہی ملازم اس کی خیریت دریافت کرنے کے لئے کمرے میں آتے جاتے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ واردات انہی دنوں میں ہوئی ہو۔ خانساماں بولا۔ "مالک میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔ پتہ نہیں صحیح ہے یا غلط' وہ جو روشن لڑکا ہے نا کئی دنوں سے بڑا بن ٹھن کر رہتا ہے۔ کھلے دل سے پیسے خرچ کر رہا ہے سگریٹ بھی گولڈ لیف کے پیتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس کے پاس کہیں سے فالتو پیسے آئے ہیں۔"

روشن بیس اکیس سالہ نوجوان تھا۔ میں نے کئی بار اسے کوٹھی کے باغ میں کام

کرتے دیکھا تھا۔ اگر وہ بن ٹھن کر رہتا تھا اور اعلیٰ سگریٹ پیتا تھا تو پھر ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔ باقر نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ وہ روشن کو بھی لے کر آئیں۔

اسی دوران باقر کے بھیجے ہوئے آدمی ملازم گلزار کو لے کر آ گئے۔ وہ بائیس تیئس سال کی ایک جوان اور قبول صورت لڑکی تھی۔ اگر اس لڑکی نے بوسیدہ کپڑوں کی جگہ جدید تراش کا سوٹ پہنا ہوتا' بال شیمپو سے دھلے ہوتے' رخساروں پر سیر شکمی کی چمک ہوتی اور وہ کسی بیوٹی پارلر سے نکل کر اپنی ٹویوٹا کار کی طرف بڑھتی نظر آتی تو دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ اور لب گنگ ہو جاتے۔ باقر نے گلزار کو سر سے پاؤں تک گھورا اور تیکھے لہجے میں سوال جواب کرنے لگا۔ اس کا انداز بالکل پولیس والوں کا تھا اور وہ بیچاری حوالاتیوں کی طرح لرزہ براندام تھی۔ پھر یکایک نہ جانے کیا ہوا کہ باقر نے اسے شہتوت کی چھڑی سے بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ یہ ایک تکلیف دہ نظارہ تھا۔ ایک جوان عورت کو ایک جوان مرد بے دردی سے پیٹ رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی اور منتیں کر رہی تھی۔ اس عورت کے لئے بھی پردے کے احکامات تھے۔ محرم و نامحرم کے شرعی قوانین یہاں بھی لاگو ہوتے تھے۔ یہ عورت جو خاک میں لوٹ رہی تھی' کسی کے لئے قابل احترام ہستی تھی' کسی کی پیاری بیوی' کسی کی محترم بہن اور کسی کی معزز ماں تھی۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا اور میں یوسف کو لے کر وہاں سے چلی آئی۔

موسم صبح سے ہی ابر آلود تھا' اب ہلکی ہلکی بارش بھی شروع ہو گئی۔ سردی انتہا کو پہنچ گئی۔ میں نے کمرے میں انگیٹھی دہکائی اور یوسف کو پاس بٹھا کر اسے دلاسہ دینے لگی۔ باقر کے تھپڑوں سے اس کا ایک کان سرخ ہو رہا تھا اور وہ مسلسل روتا جا رہا تھا۔ وہ کوٹھی آنا نہیں چاہتا تھا مگر میرے بے حد اصرار پر اس نے ہفتے میں ایک بار آنے کی حامی بھری تھی۔ اس واقعے کے بعد مجھے امید نہیں تھی کہ اب وہ پھر آسکے گا۔ اس چھوٹی سے عمر میں ہی دکھوں اور پریشانیوں نے اس کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ ایک طرف دال روٹی کا چکر تھا اور دوسری طرف اس کی محبت لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہو رہی تھی۔ صغراں ابدی جدائی کے گرداب میں تھی اور ڈوبنے سے پہلے اس کا ہاتھ بار بار یوسف کو مدد کے لئے بلا رہا تھا......... کیا ان دونوں کو بھی اس انجام کا شکار ہونا تھا جو ازل سے محبت کرنے والوں کا مقدر رہا ہے؟ یہ سوال میرے ذہن کو کچوکے لگاتا رہتا تھا۔

کچھ دیر یوسف کی ڈھارس بندھانے کے بعد میں ٹیرس کی طرف گئی۔ بارش اب تیز ہو چکی تھی۔ سردی سے ہڈیوں میں گودا جم رہا تھا۔ میں نے دیکھا باقر برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا ہے۔ کوٹھی کے پانچ چھ مشکوک افراد اس کے سامنے تھے۔ ان میں گلزار اور اس کا خاوند بھی تھا۔ یہ سب لوگ ایک قطار میں کھڑے تھے اور کھلے آسمان تلے بارش میں بھیگ رہے تھے۔ ان کے جسموں پر لرزہ اور چہروں پر منتیں سماجتیں تھیں۔ اتنے میں اندرونی برآمدے کی جانب سے خان رحیمی آتا دکھائی دیا۔ اس کے لباس سے ظاہر تھا کہ وہ بھی ابھی لوٹا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ صحن میں ملازمان کی لرزتی کانپتی قطار دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے چونکا۔

"وٹ از دس!" اس نے پوچھا۔

باقر نے کہا۔ "مس شوقیہ کی چوری ہوئی ہے انکل......... اس شبے میں پکڑا ہے۔"

"اچھا......... اچھا۔" خان رحیمی نے عام سے انداز میں کہا۔ جیسے یہ واقعہ اس کے لئے کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا ہو۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تب اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ تیز قدموں سے میری طرف بڑھ آیا۔

"ہیلو گریٹ گرل! وہ یوسف کدھر ہے۔" اس نے ہانک لگائی۔

میں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اندر ہے۔"

خان رحیمی چہکا۔ "آئی ہیو اے سرپرائز فار ہم' میں اسے حیران کر دوں گا کہاں ہے .... یہ دیکھو میں کیا لایا ہوں اس کے لئے۔"

خان رحیمی نے اوور کوٹ کی جیب سے کچھ کاغذ نکال کر میرے سامنے لہرائے۔

"یہ کیا ہے جناب؟" میں نے پوچھا۔

"اس زمین کے کاغذات' جو اس کے باپ نے گروی رکھی ہوئی تھی۔"

میں ششدر رہ گئی۔ خان رحیمی نے کہا۔ "میں دو تین دن سے اسی چکر میں تھا۔ ابھی گوپور سے آ رہا ہوں۔ کہاں ہے وہ چغد اسے میرے سامنے تو لاؤ......... اور ہاں اس کے لئے ایک اور خوشخبری بھی ہے......... میں نے ایک آدمی بھیجا ہے اس کے گاؤں۔ وہ آج ہی اسے لے کر یہاں آ جائے گا۔ میں اس کے ماموں سے خود رشتے کی بات کروں گا۔ آئی تھنک اٹ ول بی آل رائٹ۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "لیکن.......... لیکن جناب! آپ یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟"

خان رحیمی نے کہا۔ "مس شاہدہ! یہ ایک غلط سوال ہے.......... کیا یوسف نے ہمارے لئے کچھ نہیں کیا.......... مجھے تو افسوس ہے کہ میں ہسپتال چلا گیا اور اس سارے معاملے میں اتنی تاخیر ہوئی۔ بہرحال دیر آید درست آید۔"

شوقیہ اور باقر کو چپ لگ چکی تھی۔ وہ یوسف کو خان رحیمی کے سامنے ملزم بنا کر پیش کرنے والے تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی اور ہو گیا تھا۔ اچانک گلزار ملزموں کی قطار سے نکل کر دوڑتی ہوئی آئی اور خان رحیمی کے پاؤں میں گر پڑی۔

"خان جی! میں بے قصور ہوں۔ مجھے اپنے اکلوتے بچے کی قسم میں نے چوری نہیں کی۔"

خان رحیمی نے باقر سے پوچھا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟"

باقر نے بتایا کہ مس شوقیہ کے کمرے سے طلائی انگوٹھیاں اور جھمکے چوری ہو گئے ہیں۔ سب سے پوچھ گچھ کی ہے لیکن کوئی نہیں مان رہا۔

میں نے دیکھا خان رحیمی کی گاڑی کے ڈرائیور چاچے شفیع کا رنگ بدلا۔ اس نے شوقیہ سے کہا۔ "بیٹی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ زیور تو تم نے خود دیا تھا۔"

"کسے؟" شوقیہ نے پوچھا۔

"اپنی ماں کو۔"

"کب؟"

چاچے شفیع نے کہا۔ "حیرت ہے تمہیں کچھ یاد نہیں۔" پھر اس نے بتایا کہ شوقیہ جب زیادہ بیمار تھی تو فیصل آباد سے اس کی والدہ خبر لینے آئی ہوئی تھی۔ بخار کی بے ہوشی میں شوقیہ نے اپنی والدہ سے کہا تھا کہ صندوق سے انگوٹھیاں اور جھمکے نکال کر اپنے پاس رکھ لو۔ چاچا شفیع بھی اس وقت پاس ہی موجود تھا۔"

چاچے شفیع کی بات سن کر شوقیہ کے چہرے پر پہلے تو الجھن نظر آئی پھر وہ شرمندہ سی دکھائی دینے لگی۔ اس کے چہرے سے صاف پتہ چلا کہ اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہے۔ مگر اتنی جلدی وہ اپنی غلطی تسلیم کرنا نہیں چاہتی تھی.......... آئیں بائیں شائیں کرنے لگی کہ اگر اس کی والدہ زیور ساتھ لے جاتیں تو اسے بتا کر جاتیں' یا خط میں ہی ذکر کرتیں' وغیرہ وغیرہ۔ اس کا پریشان چہرہ اس کے جھوٹ کی نشاندہی کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب! اپنے غلط شک کی وجہ سے مس شوقیہ نے یوسف کو ذلیل کرایا ہے۔ سب کے سامنے اسے تھپڑ مارے گئے ہیں اور گالیاں نکالی گئیں ہیں۔"

خان رحیمی کے چہرے پر شدید برہمی دکھائی دی۔ وہ گرج کر بولا۔ "کس نے کیا ہے ایسا؟"

شوقیہ اور باقر کی گردنیں جھک گئیں۔ خان رحیمی کی نظریں باقر پر جم گئیں۔ وہ باقر سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میرا خیال ہے تمہارے ہوتے ہوئے کسی اور کے لئے بیوقوفی کی گنجائش نہیں رہتی۔"

باقر نے کہا۔ "انکل! میری اس سے کوئی دشمنی نہیں' اس پر شبہ کیا جا رہا تھا۔"

خان رحیمی نے کہا۔ "بہت خوب انسپکٹر صاحب! اچھی تفتیش فرما لیتے ہیں آپ' کبھی اپنے بارے میں بھی کھوج لگایئے کہ کس مقصد کے لئے پیدا فرمایا گیا ہے آپ کو۔"

خان رحیمی نے یہ فقرہ انگریزی میں کہا تھا' پھر بھی باقر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ منمنا کر بولا۔

"انکل! آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں۔"

خان رحیمی بولا۔ "میں انسلٹ نہیں کر رہا' انسلٹ کی شروعات کر رہا ہوں۔ مگر اتنی عقل ہے مجھ میں' سب کے سامنے تمہیں بے عزت نہیں کروں گا۔ جاؤ اپنے کمرے میں' میں وہیں تم سے بات کروں گا.......... جاؤ۔" باقر نے احتجاجی انداز میں کچھ چاہا مگر خان رحیمی نے دانت پیس کر "آئی سے گیٹ لوسٹ۔" کہا تو وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

باقر نے مالی کے لڑکے روشن کو نیم کے درخت کے نیچے مرغا بنا رکھا تھا۔ وہ سردی اور خوف سے بری طرح لرز رہا تھا۔ خان رحیمی نے پوچھا۔ "اس نے کیا کیا ہے؟"

رانقل مین سردار محمد نے کہا۔ "خان جی! اس نے ابھی ایک چوری کی ہے' کہتا ہے پچھلے مہینے اسے عاشق ارائیں کے کھیتوں سے ایک زنانہ بٹوہ ملا تھا اس میں بہت سے پیسے تھے۔"

بٹوے کا ذکر سن کر میں اور خان رحیمی دونوں بری طرح چونک گئے۔ اس گمشدہ

پرس کی بابت صرف ہم دونوں کو ہی معلوم تھا۔ خان رحیمی نے کہا۔ "جاؤ اسے ادھر لے کر آؤ۔" سردار محمد روشن کو ہمارے پاس لے آیا۔ اس کے چہرے پر انگلیوں کے نشان تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے بوسکی کی ڈیزائن دار قمیض کے نیچے رنگین لاچہ پہن رکھا تھا۔ یہ لباس اس کی آمدن اور شکل و صورت سے ہرگز لگا نہیں کھاتا تھا۔ خان رحیمی نے اس سے پرس کے بارے میں پوچھ گچھ کی تو اس نے اقرار کیا کہ کوئی ایک مہینہ پہلے صبح سویرے وہ سندری گاؤں میں اپنے گھر سے نکل کر کھیتوں میں گیا تو سرخ رنگ کا ایک بٹوہ اس کے ہاتھ لگا۔ اس میں بہت سے نیلے رنگ کے نوٹ تھے۔ وہ بے حد حیران ہوا۔ اس نے ان میں سے ایک نوٹ نکالا اور ساتھ والے گاؤں سے ریزگاری لینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پھر وہ تین نوٹ لے کر جھنگ چلا گیا اور وہاں سے کپڑے اور دوسری چیزیں لے کر آیا۔ نوٹوں سے بھرا ہوا وہ پرس ابھی تک اس کے گھر میں تھا۔

سردار محمد نے بتایا کہ باقر صاحب نے دو بندے گاؤں میں بٹوا لانے کے لئے بھیجے ہوئے ہیں وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔ خان رحیمی کے چہرے پر دلچسپی کے آثار نمودار ہوئے۔ بولا "دیکھ رہی ہو مس شاہدہ! زندگی کتنی خوبصورت ہے۔ بری سے بری چیز میں بھی ایک حسن ہوتا ہے۔ بیوقوفی، کم عقلی، بزدلی، بدصورتی یہ ناپسندیدہ اوصاف ہیں مگر زندگی ان کے بغیر مکمل نہیں۔ اس کی جیتی جاگتی مثال میرا بھتیجا ہے۔ اس سے بڑھ کر "بے کار" اس چاردیواری میں اور کون ہے مگر دیکھو اس کے ہاتھ سے بھی ایک اچھا کام ہو گیا۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ خان رحیمی کے دو کارندے صحن میں پہنچے اور جھک کر سلام کرنے کے بعد سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے گرم چادر کے اندر سے اپنا ہاتھ نکالا۔ اس میں میرا سرخ پرس تھا۔

اگلے روز صبح سویرے چکن سوپ ڈبل روٹی اور مکھن پر مشتمل ناشتہ لے کر خان رحیمی کے بیڈروم کی طرف گئی تو اندر سے بہت تیز تیز باتوں کی آواز آئی۔ خان رحیمی کسی شخص کو بری طرح ڈانٹ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا۔ ڈانٹ کھانے والا یوسف کا ماموں تھا۔ وہ کل رات گئے یہاں پہنچا تھا اور آج صبح صبح خان کے سامنے اس کی پیشی ہو گئی تھی۔ میں اندر پہنچی تو خان رحیمی غصے میں چیختے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"کاٹھ کے الو ہو تم، شی از یور وائف ناٹ یور ہسبنڈ۔ عجیب چغد مرد ہو تم، بیوی کی کیا مجال ہے کہ خاوند کا حکم نہ مانے۔"

یوسف کا ماموں بولا۔ "خان جی میرا مطلب ہے تھوڑا سا وقت۔"

خان رحیمی چنگھاڑا۔ "وقت........ کیا وقت، کوئی پنج سالہ پلان پاس کرنا ہے اس نے۔ یہی اعتراض تھا نا اسے کہ لڑکے کے پاس اپنی زمین نہیں۔ اب زمین ہے اس کے پاس اور نقد پیسہ بھی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمہاری زمین بھی خرید سکتا ہے۔ اب وہ کیوں نہیں دے گی رشتہ۔ میں اسے سوچنے کے لئے ایک دن بھی نہیں دے سکتا۔ اگر زیادہ چوں چرا کرے گی تو ٹانگیں تڑوا کر پھینک دوں گا نہر میں، کیا سمجھتی ہے وہ باسٹرڈ اپنے آپ کو!"

میں سمجھ گئی کہ خان رحیمی "رشتے" کی بات کر رہا ہے۔ مجھے پتہ تھا وہ جب بات کرے گا ایسے ہی کرے گا۔ اس کی طبیعت میں ایک جوشیلی سی کج روی ہر وقت موجود رہتی تھی۔ یوسف کا ماموں بیچارا سخت خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس تند و تیز گفتگو میں مداخلت کی اور اشاروں کنایوں میں خان رحیمی کو سمجھایا کہ وہ رشتے کی بات کر رہا ہے۔ رشتوں کے بندھن میں بندھی ہوئی لڑکی کا معاملہ ہے کوئی گولڈن ایگل کا شکار نہیں۔ بمشکل خان رحیمی کے پارے نے نیچے کی طرف سفر شروع کیا۔ میں نے یوسف کے ماموں سے کہا کہ وہ بیوی کو لے کر گوپور آئے اور اگر یوسف کی والدہ سے اس کا کوئی جھگڑا ہے تو اسے سمیٹنے کی کوشش کرے۔ یوسف کے ماموں نے میری تجویز پر رضامندی کا اظہار کیا۔ کچھ دیر بعد وہ رخصت ہونے لگا تو خان رحیمی نے کہا۔

"لک مسٹر، جس کسی کو بھی سمجھانا بجھانا ہے دو دن میں سمجھا لو پرسوں اس وقت مجھے رپورٹ چاہئے۔ تمہیں آ کر بتانا ہو گا کہ ہمیں رشتہ قبول ہے........ انڈرسٹینڈ؟ اور ہاں........ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسی ویک اینڈ پر یوسف کی انگیج منٹ کر دی جائے۔ انگیج منٹ سمجھتے ہو نا یعنی منگنی۔ منگنی کا یہ فنکشن گاؤں میں نہیں اسی کوٹھی میں ہو گا۔ میں خود سارا انتظام کراؤں گا۔ تم چاہو تو چالیس پچاس آدمی لا سکتے ہو منگنی پر لیکن ایک شرط ہے ان میں سے کوئی شلوار قمیض یا پینٹ شینٹ پہننے کی کوشش نہ کرے۔ بس اپنے اصلی لباس دھوتی کرتے میں آئیں۔ جب تم لوگ خواہ مخواہ شہری بننے کی کوشش کرتے ہو تو

مجھے بہت برے لگتے ہو۔"

یوسف کے ماموں نے زور زور سے اقرار میں سر ہلایا۔ جیسے سب کچھ طے ہو چکا ہو اور مہمانوں کے لباس کا معاملہ ہی باقی رہ گیا ہو۔ وہ چلا گیا تو خان رحیمی نے کانپتے ہاتھ سے سوپ کا چمچہ پکڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں مس شاہدہ! میں نے ٹھیک کیا ہے نا' میرا مطلب ہے زندگی میں کچھ رنگ ہونا چاہئے۔ کچھ ہاؤ ہو کا ماحول' ویسے ایک فنکشن تو ہمارا ڈیو ہی تھا نا' کچھ یاد ہے کہ نہیں تمہیں؟" میں سوچ میں پڑ گئی وہ بولا۔ "تم نوجوانوں سے تو ہم بوڑھوں کی یادداشت اچھی ہے تیرے جیسی ہنستی دوشیزہ کے بارے میں ایک لطیفہ ہے.........." وہ کچھ دیر ذہن پر زور ڈال کر لطیفہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا۔ "چلو حساب برابر ہو گیا' تمہیں فنکشن بھولا' مجھے لطیفہ بھول گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن.......... جناب مجھے تو فنکشن یاد آ گیا ہے۔"

"ہاں بتاؤ۔"

"آپ نے کہا تھا کہ شیخ کا باز ملنے کی خوشی میں ایک تقریب کا اہتمام کریں گے مگر اس کے بعد آپ کو ہسپتال ایڈمٹ ہونا پڑ گیا۔"

"کوریکٹ۔" خان رحیمی نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس فنکشن اور اس فنکشن کو آپس میں مکس اپ کر لیا جائے۔ ذرا انجوائے منٹ ہو جائے گی تم شوقیہ کو بلاؤ۔ وہ کارڈ وغیرہ چھپوانے میں ماہر ہے۔ اگر فنکشن ہونا ہی ہے تو پھر ذرا طریقے سے ہو۔ میرا خیال ہے ڈھائی تین سو کارڈ کافی رہیں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

میں نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب! میرا خیال یہ ہے کہ اب سوپ والا پیالہ اوندھا ہونے ہی والا ہے۔" اس نے چونک کر پیالے کی طرف دیکھا اور کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ ان لمحوں میں مجھے یقین نہیں آیا کہ یہی شخص ہے جسے چند ماہ پہلے فارسٹ گارڈ جان محمد نے واصف چنگیزی سے گفتگو کرتے سنا تھا اور جو چنگیزیوں کے ساتھ کسی پراسرار راز میں شریک ہے۔

بالآخر خان رحیمی نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اسی ویک اینڈ پر کوٹھی میں یوسف اور صغراں کی منگنی کی تقریب دھوم دھام سے برپا ہوئی۔ اس منگنی کے پس منظر میں "باز

فنکشن" بھی موجود تھا۔ شہر سے اور اردگرد کے علاقے سے تقریباً چھ سو مہمان کوٹھی میں جمع تھے۔ ان میں اعلیٰ افسران بھی تھے۔ نواحی زمیندار اور چودھری بھی تھے اور گاؤں کے عام دیہاتی بھی۔ بڑا عجیب و غریب اجتماع تھا۔ اونچ نیچ کا فرق کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کم از کم اس تقریب کی حد تک طبقاتی فاصلے مٹ گئے تھے۔ عام دیہاتیوں کے حقوں' ان کی رنگین پگڑیوں اور لاٹھیوں کو شہری حضرات نے دیسی کلچر کا حصہ سمجھ کر قبول کیا ہوا تھا۔ کھانے پینے کا لمبا چوڑا انتظام تھا۔ کوٹھی کے پچھلے باغ میں میں نے بیسیوں ہی دیگیں پڑی دیکھی تھیں۔ سامنے والے وسیع و عریض تراشیدہ لان میں پانچ چھ سو کرسیاں اور میز وغیرہ رکھے تھے۔ اس اوپن ائر میں ایک ورائٹی شو کا اہتمام بھی تھا۔ لاہور سے معروف گلوکار اور مزاحیہ فنکار مدعو تھے۔ شام کے آٹھ بجے تک یہ فنکشن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ہر طرف چمکیلی مسکراہٹوں اور رنگ برنگے لباسوں کی بہار تھی۔ آج کتنے ہی عرصے بعد میں نے رنگ دار لباس پہنا تھا اور ہلکا سا میک اپ کیا تھا۔ مجبوری تھی ورنہ زندگی تو رنگ و بو سے کوسوں دور ہو چکی تھی۔ زندہ رہنے کے لئے میرے سینے میں دل ہی کہاں تھا۔ وہاں تو ایک پتھریلی تختی تھی جس پر کوئی معصوم اپنی انگلی خون میں ڈبو کر لکھ گیا تھا۔ میری ماں! میرے لہو کا حساب لینا۔ میری اذیت کو بھول نہ جانا۔ میری بے بسی کو فراموش نہ کر دینا۔ وہ توتلی زبان میں مجھے امی دان کہنے والا' میرے رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھنے والا اور دروازے کے پیچھے چھپ کر مجھے پکارنے والا' میرا سب کچھ ہی تو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے شب کی تاریکیوں میں بارہا سوچا تھا۔ وہاب چنگیزی تو نے ایسا کیوں کیا؟ قیامت کا اختیار تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ پھر ایک ماں پر یہ قیامت تو نے کیسے ڈھائی؟ میں تجھے کس نام سے پکاروں وہاب چنگیزی کاش انسانی لغت میں کوئی ذلیل نام تیرے "شایان شان" ہوتا۔

رنگ و روشنی کے اس سیلاب میں مہمانوں کے درمیان گھومتے ہوئے دو نگاہیں ہر لحظہ میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ یہ سلیم کی نگاہیں تھیں۔ عجیب سی کسک تھی ان نگاہوں میں اور دھیمی دھیمی تپش تھی۔ یہ نگاہیں میرے جسم کے گرد ایک نادیدہ جال بن رہی تھیں۔ میں چھپنا چاہتی تھی مگر چھپ نہیں سکتی تھی۔ آخر وہ کیوں ایسے دیکھ رہا ہے مجھے؟ یہ سوال مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔ اب یہ کیا چاہ رہا تھا مجھ سے؟ یہ جانتے بوجھتے بھی

کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے.......... اس کی ان دزدیدہ نگاہوں سے گھبرا کر میں بالآخر چھت پر چلی گئی۔ یہاں تاریکی تھی اور خاموشی بھی۔ ہوا تھمی ہوئی تھی اور خنکی اشجار پر تاریک دھند کی طرح اتری ہوئی تھی۔ لائٹنگ کے لئے چھت پر بہت سی تاریں بچھی ہوئی تھیں ان سے پاؤں بچا کر چلتی میں ایک تاریک منڈیر تک پہنچی اور دونوں کہنیاں ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ میں سلیم کی دزدیدہ نگاہوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ مجھ سے اپنی خاموش محبتوں کا صلہ مانگ رہا تھا جب کہ میرے پاس تہی دامنی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اپنی بیچارگی کا احساس آنسو بن کر میری آنکھوں سے چھلکنے لگا۔ میں وہیں کھڑے کھڑے رونے لگی۔ دفعتاً عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کسی نے دھیمی آواز میں مجھے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے چودھری شباب کھڑا تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھتی چلی گئی۔

"تم.......... تم کب آئے ہو؟"

وہ بولا۔ "جیل سے تو پچھلے بدھ کو آیا تھا' یہاں آج ہی آیا ہوں۔ میری ضمانت ہو گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم نیچے مہمانوں میں تھے؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔"

اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہم جیسے چھوٹے لوگ آپ جیسے بڑے لوگوں کو کہاں نظر آتے ہیں۔"

نہ جانے کیوں چودھری شباب کی موجودگی سے میری ڈھارس سی بندھ جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تیز بارش اور ژالہ باری میں کسی گھنے پیڑ کا سایہ مل گیا ہو۔ اس کے مزاج میں دھیمے پن کے علاوہ گہرائی اور ہمدردی کا عنصر بھی بہت نمایاں تھا۔ وہ بولا۔ "آپ رو رہی تھیں' خیریت تو ہے۔" میں نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ کہنے لگا۔ "اتنی سردی میں اکیلی اوپر چلی آئی ہیں کیوں اپنی جان کی دشمن بنی رہتی ہیں۔" میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ سیڑھیوں کے دروازے میں کوئی کھڑا تھا۔ وہ سلیم کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹارچ نے ہم دونوں کو روشنی میں نہا دیا۔

"شاہدہ تم یہاں!" اس نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا۔ "بابری ان سے ملو یہ چودھری شباب ہیں۔" سلیم نے آگے بڑھ کر چودھری شباب سے مصافحہ کیا اور تیکھے لہجے میں بولا۔

"بڑی تعریفیں سن رکھی ہیں آپ کی' آج ملاقات بھی ہو گئی.......... اگر آپ پسند کریں تو یہیں چھت پر آپ کے لئے دو کرسیوں کا انتظام کر دیا جائے؟"

چودھری شباب نے کہا۔ "بڑی مہربانی بابری صاحب! بس ہم نیچے ہی آ رہے ہیں۔"

سلیم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "نیچے بھی کیا رکھا ہے جی' بس شور شرابہ ہی ہے۔ بڑا سکون ہے یہاں چھت پر۔" پھر اس نے جلتی نظروں سے مجھے دیکھا اور رخ پھیر کر نیچے اتر گیا۔

چودھری شباب نے کہا۔ "بڑا تیکھا جوان ہے یہ' سنا ہے تیس چالیس بندوں کے اندر سے باز لے کر نکل گیا تھا۔" میں نے اثبات میں جوب دیا۔ چودھری نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "آپ کو یہاں آنے کا کچھ فائدہ ہوا ہے یا نہیں.......... میرا مطلب ہے کوئی کھوج کھرا.........."

میں نے کہا۔ "چودھری! یہ بات تسلی سے کرنے والی ہے۔ اس جگہ پر گفتگو مناسب نہیں۔"

سیڑھیوں کی طرف سے پھر چاپ سنائی دی۔ میں نے سمجھا شاید سلیم سچ مچ کرسیاں لے آیا مگر چاپ نزدیک آئی تو پتہ چلا کہ یہ ایک سے زیادہ آدمی ہیں اور انہوں نے کوئی وزنی شے بھی اٹھا رکھی ہے۔ پھر یہ لوگ چھت پر پہنچ گئے۔ یہ چار آدمی تھے۔ انہوں نے کوئی سفید سی لمبی سی شے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ ان کا پراسرار انداز دیکھ کر میں اور شباب غیرارادی طور پر ایک زیادہ تاریک کونے میں سمٹ گئے۔ سفید چیز نیچے فرش پر رکھنے کے بعد ایک آدمی سیڑھیوں کا دروازہ چھت کی طرف سے بند کرنے لگا اور باقی تین کونے والی کوٹھڑی کی طرف چلے گئے۔ یہ کہنہ سال کوٹھڑی شاید کبھی برساتی کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی مگر اب اس پر ایک زنگ آلود تالہ پڑا رہتا تھا۔ کوٹھڑی کی طرف جانے والے غالباً اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ہمت کر کے ایک قدم آگے بڑھی اور غور سے اس سفید چیز کی طرف دیکھا۔ جب میں اسے شے کو پہچاننے کے قابل ہوئی تو سرتاپا لرز گئی.......... وہ ایک کفنائی ہوئی لاش تھی۔ سفید کفن پر گلاب کی ایک

آدھی پی اٹکی رہ گئی تھی۔ کفن کے تینوں "بند" مضبوطی سے بند تھے۔ اس نیم تاریک ماحول میں یہ نظارہ اتنا خوفناک تھا کہ میرے ہونٹوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ شاید میں لڑکھڑائی بھی تھی۔ شباب نے کندھوں سے تھام کر مجھے سہارا دیا اور تاریک کونے میں کھینچ لیا۔ کوٹھڑی کا زنگ آلود دروازہ کھولنے کے بعد چاروں افراد واپس آئے۔ ان میں سے ایک خان رحیمی کا ذاتی محافظ سردار محمد اور باقی تینوں سندھی نظر آتے تھے۔ یہ محسوس کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ زمین پر پڑی لاش کے اندر پھڑپھڑاہٹ سی ہو رہی ہے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے گمان ہوا جیسے یہ کسی بہت بڑے پرندے کی لاش ہے۔ یہ بے تکی سوچ میرے دہشت زدہ ذہن کی پیداوار تھی۔ ایک شخص کی سرگوشی ابھری۔ "سائیں تم دونوں پاؤں کی طرف ہو جاؤ۔" پھر چاروں نے مل کر وہ لاش اٹھائی اور زنگ آلود تالے والی کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔

رات تقریباً دو بجے تک رقص و سرود اور راگ رنگ کا مظاہرہ زوروں پر رہا۔ پھر مہمان ڈگمگاتے ہوئے اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھے اور روانہ ہو گئے لیکن بہت سے ایسے تھے جنہیں رات کوٹھی ہی میں قیام کرنا تھا۔ ان کی شب بسری کا انتظام پہلے سے ہی کر دیا گیا تھا۔ ان رہ جانے والے مہمانوں میں شاہ دین ٹوانہ اور عشرت بھی تھے۔ عشرت کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا جب محفل برخاست ہو چکی تھی۔ وہ مجھے کن انکھیوں سے دیکھ کر مسکرائی لیکن جان پہچان ظاہر نہیں کی۔ گلابی رنگ کی چمکیلی تاروں والے سوٹ اور ہلکے میک اپ میں وہ بڑی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اپنی بڑی بھابی کا سراپا میری نظروں میں گھومنے لگا۔

جب سارے مہمان محو استراحت ہو گئے۔ کوٹھی کی زیادہ تر روشنیاں بجھ گئیں اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میرے ذہن میں ایک بار پھر وہ لاش ابھر آئی جو میں نے چھت پر اپنے قدموں سے چند گز دور پڑے دیکھی تھی اور جو اس وقت بالائی منزل کی کوٹھڑی میں موجود تھی۔ یہ منظر یاد کر کے مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ آخر اس کفن کے اندر کیا تھا؟ کوئی زندہ جسم تھا جو حرکت کر رہا تھا۔ اس جسم کو اس چاردیواری میں لانے والے کون تھے۔ وہ چوڑے شانوں والا کون تھا جو ورائٹی شو کے دوران خان رحیمی سے سرگوشیاں کر رہا تھا؟ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس وقت چھت پر جاؤں اور کسی طرح اس کوٹھڑی میں جھانکنے کی کوشش کروں مگر اس سوچ کو عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہیں تھا۔ میں تو عورت تھی میری جگہ کوئی عام مرد بھی ہوتا تو اس وقت یہ ہمت نہ کر سکتا۔

وہ ساری رات میں نے عجیب و غریب ڈراؤنے خواب دیکھتے ہوئے گزار دی۔ صبح

آنکھ کھلی تو سب سے پہلے لاش کا خیال آیا۔ اب رات کے اندھیرے میں اجالے کی آمیزش ہو چکی تھی۔ کوٹھی کے ملازمین جاگ چکے تھے اور ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ دل کڑا کر کے میں سیڑھیوں کی طرف بڑھی اور انہیں طے کر کے چھت پر آ گئی۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہے۔ دائیں بائیں دیکھ کر میں دروازے کے سامنے پہنچی۔ اندر اب کچھ بھی نہیں تھا۔ گرد آلود ٹوٹا پھوٹا فرنیچر تھا۔ چند خستہ حال چارپائیاں تھیں اور ایک زنگ آلود پیڈسٹل فین۔ ایک لمحے کے لئے مجھے گمان ہوا شاید رات میری آنکھوں نے دھوکا کھایا تھا۔ اگر لاش یہاں رکھی گئی تھی تو اب کہاں گئی۔ بغور دیکھنے سے مجھے گرد آلود فرش پر ایک لمبوترا نشان نظر آیا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہاں وہ لاش رکھی گئی تھی۔ اردگرد قدموں کے نشان بھی دکھائی دے رہے تھے.......... میں سب کچھ دیکھ کر نیچے آ گئی۔ چودھری شہاب بھی ابھی تک یہیں تھا۔ میں اس کے کمرے کے سامنے سے گزرنے لگی تو اس نے آواز دے کر مجھے اندر بلا لیا۔ اس کے سرہانے تپائی پر بجلی والا بڑا ریڈیو پڑا تھا۔ کہنے لگا۔ "میم صاحب! ذرا اس پر آزاد کشمیر تو لگا دیں۔ مجھے تو ٹیشن ہی نہیں مل رہا۔"

میں تپائی کے ایک سرے پر بیٹھ کر مطلوبہ سٹیشن تلاش کرنے لگی۔ میں جانتی تھی ریڈیو کا تو صرف بہانہ ہے دراصل وہ مجھے زینوں سے اترتے دیکھ چکا تھا اور اب جاننا چاہتا تھا کہ چھت پر مجھے کیا نظر آیا ہے۔ دبے لہجے میں بولا۔

"کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں.......... کوٹھڑی کا دروازہ تو کھلا پڑا ہے۔"

"اور.......... لاش؟"

"وہ وہاں نہیں ہے۔"

"حیرت ہے وہ کہاں گئی؟"

میں نے کہا۔ "کیا پتہ' وہ لاش تھی بھی یا نہیں۔"

چودھری شہاب بولا "میں تو یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ آج دوپہر تک واپس چلا جاؤں گا لیکن آپ کسی طرح اس چکر کا پتہ چلائیں۔ الیکشن میں اب ستائیس اٹھائیس روز رہ گئے ہیں۔ اگر اس سے پہلے چنگیزیوں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت مل جائے تو بڑا

اچھا ہو.........."

اچانک شہاب خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ دروازے پر سلیم کھڑا عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز سے گڑبڑا کر شہاب نے کہا۔

"بابری صاحب! اندر آ جاؤ کوئی پردہ نہیں ہے۔"

سلیم اندر آتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک کہتے ہو چودھری صاحب! بندے کو اندر باہر سے ایک جیسا ہونا چاہئے۔ پردہ تو وہ کرتے ہیں جو کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بابری! یہ آزاد کشمیر نہیں لگ رہا چودھری صاحب سننا چاہتے ہیں۔"

سلیم نے کہا۔ "آزاد کشمیر نہیں لگ رہا تو تم تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کر لو۔ چودھری صاحب کا مقصد تو وقت گزاری ہے۔ کیوں چودھری جی!؟"

چودھری شہاب ہنس کر رہ گیا۔ غالباً بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران دینو ایک بڑی ٹرے میں ناشتہ لے کر آ گیا۔ لگتا تھا اسے خود بھی خوب بھوک لگی ہوئی ہے۔ وہ ناشتے کو ہوسناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"لو جناب! ناشتہ کر لو ناشتے کے بعد خان صاحب نے سب کو وڈے کمرے میں سدیا ہے' ضروری گل کرنی ہے۔"

چودھری شہاب نے کہا۔ "یار تو کیوں لنگڑی اردو بولتا ہے کیا کسی کی بددعا ہے تجھے!"

دینو ہنس کر بولا۔ "میراثیوں اور بھانڈوں کو بددعا نہیں لگتی جی۔"

سلیم نے کہا۔ "ہاں انہیں بددعا لگنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔"

دینو نے کہا۔ "دراصل چودھری صاحب بہروپیا بننے سے پہلے میں جھنگ کے ایک میواتی سیٹھ کے گھر نوکر تھا۔ پورے بیس سال گزارے ہیں میں نے اوتھے۔ جب میں نوکر ہوا تھا وہ لوگ بڑی گاڑھی اردو بولتے تھے۔ میں بھی بڑی ٹھیٹ پنجابی بولتا تھا۔ پھر کچھ میں نے ان کی اردو خراب کی کچھ انہوں نے میری پنجابی کا بیڑا غرق کیا۔ ایک دن میری مالکن کا نانا انڈیا سے ان کے گھر مہمان آیا۔ اس نے جدوں گھر والوں کی زبان سنی تو غش کھاندے کھاندے بچا کہنے لگا۔ "اوہ تمہارا ستیاناس ہو۔ یہ کون سی بولی بول رہے ہو تم' یہ

کس نے کوبڑا کر دیا ہے تمہاری زبان کا' تم تو جدی پشتی اردو شپنگ ہو اور اردو بھی وہ جو لوہے توڑ ہوتی ہے۔"

میں نے دینو کی بات کاٹ کر کہا۔ "اردو شپنگ نہیں اردو سپیکنگ۔"

"ہاں ہاں وہی۔" دینو نے کہا۔ "اپنے نانے کی بات پر میری مالکن نے حیران ہو کر کہا کہ ہم تو اچھی بھلی اردو بولتے ہیں آپ کو پتہ نہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے۔ ان کے نانا نے گرج کر کہا۔ "تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں' کیا بہرا ہوں۔" میں پاس ہی تھا میں نے کہا۔ "جناب عالی! آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں اور بیگم صاحبہ بھی' دراصل علاقہ بدلنے سے تھوڑا بہتا فرق تو پے ہی جاندا ہے۔" مالکن کے نانا نے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ پھر چیخ کر بولا۔ "یہ کون ہے' یہ الو کا پٹھا کون ہے' یہ اس گھر میں کیسے گھسا۔" مالک نے بتایا کہ میں ان کا برسوں پرانا ملازم ہوں۔ بس جناب عالی پھر کیا تھا اس خبطی بڈھے نے اپنی لوہے کے دستے والی سوٹی اٹھائی اور مجھے مارنے کے لئے بھاگا۔ میں جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ وہ چیخ رہا تھا۔ "میں تینوں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بدبخت تو نے میری نسل خراب کر دی.........." بس جی کچھ نہ پچھیں اس روز کتنا ہنگامہ ہوا۔ مار تو مجھے پے گئی اور نوکری بھی چھٹ گئی پر میں نے بھی پچھلے چھ سالوں کی تنخواہ نقد و نقد اسی جگہ رکھوا لی۔"

میں نے کہا۔ "دینو! چلو تمہاری بات ہم نے مان لی مگر اب تم اردو پر یہ ظلم کیوں کر رہے ہو۔ نوکری تو تمہاری چھوٹ چکی اب سیدھی سادی پنجابی بولا کرو۔"

وہ کہنے لگا۔ "بس یہی تو بات ہے جی' اب میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ پکی پکی اردو سیکھ کے چھوڑنی ہے۔ پورا اردو دان بننا ہے۔ اب یا اردو رہے گی یا میں رہوں گا۔ آپ کو مزے کی بات بتاؤں میں نے بیوی بھی اردو شپنگ کی ہے.........."

دینو غالباً اس موضوع پر لمبی چوڑی بات کرنا چاہتا تھا مگر کسی قریبی کمرے سے اسے خان رحیمی کی آواز آئی اور وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

میں سخت پریشان تھی۔ دو تین روز سے میں سلیم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ کوئی موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے اطوار سے نظر آتا تھا کہ سخت ناراض ہے۔ معلوم نہیں اس ناراضگی کی کیا وجہ تھی۔ غالباً چودھری شہاب کے حوالے سے وہ کسی

شک میں جلتا تھا۔ میرے تصور سے وہ کفن پوش لاش چمٹ کر رہ گئی تھی۔ یقیناً رات کوٹھی میں کوئی انہونا واقعہ ہوا تھا۔ اس واقعے سے میرے اور شہاب کے علاوہ کوئی باخبر نہیں تھا۔ سلیم کو بھی خبر نہیں تھی۔ میں اس سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی مگر وہ کسی اڑیل بچے کی طرح منہ پھلائے پھرتا تھا۔ ایک روز پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اسے متوجہ کرنا چاہا مگر وہ ناک کی سیدھ میں نکلا چلا گیا۔ اسے مجھ سے بہت شکوے تھے۔ شہاب کی آمد نے ان شکووں میں ایک اور کا اضافہ کر دیا تھا۔ میں سلیم کی مسلسل ناراضگی کی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی' اس لئے نہیں کہ ایک عورت کی حیثیت سے میں اسے چاہتی تھی بلکہ اس لئے کہ ایک ماں کی حیثیت سے مجھے اپنے بچے کا انتقام لینا تھا اور اس سلسلے میں سلیم ہی میری مدد کر سکتا تھا۔ شاید میں خودغرض بھی تھی کہ صرف اپنے بچے کے لئے سوچ رہی تھی۔ اس سے آگے مجھے نہ کچھ نظر آتا تھا اور نہ سنائی دیتا تھا۔ میں صرف اتنا جانتی تھی کہ میری زندگی پر ایک قرض ہے اور وہ قرض مجھے اتارنا ہے اور اگر میں ایسا نہ کر سکی تو قیامت تک کے لئے ماں اور بچے کے رشتے سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

ایک رات میں بہت دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ سلیم دوسری منزل کے ایک کمرے میں سوتا تھا۔ پندرہ بیس زینے طے کر کے میں اس کمرے کے دروازے پر پہنچ سکتی تھی مگر یہ فاصلہ مختصر ہونے کے باوجود بہت طویل تھا۔ اس کوٹھی میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ سلیم اور میں بہت پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اگر کوئی ہمیں اکٹھے دیکھ لیتا تو بہت کچھ سوچ سکتا تھا۔ شوقیہ تو پہلے ہی شکوک بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہتی تھی۔ وہ کئی دفعہ پوچھ بھی چکی تھی کہ شاہ دین کے فارم میں بابری میری مدد پر کیسے آمادہ ہو گیا۔ جب سے اس نے یوسف پر چوری کا الزام لگایا تھا۔ میری اور اس کی بول چال تقریباً بند تھی.......... بہت دیر سوچنے اور کروٹیں بدلنے کے بعد آخر میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ بالوں کو لپیٹ کر جوڑے کی صورت میں باندھا۔ اوڑھنی لی اور چپل پہن کر بہ آہستگی کمرے سے نکل آئی۔ دھڑکتے دل سے سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن سلیم کے کمرے میں روشنی تھی۔ میں نے پہلے کھڑکیوں سے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر پردے تھے۔ دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ کھل گیا۔ سامنے ہی سلیم نظر آیا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی

تھی اور ہونٹوں میں سگریٹ دبا تھا۔ وہ بے حد چونکی نظروں سے دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اب پیچھے ہٹنا لاحاصل تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بھیڑ دیا۔ سلیم کی جاگی جاگی سرخ آنکھیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ میں نے دیکھا لحاف کے اوپر اس کی جھولی میں کھلا ہوا پستول اور ننھا سا برش پڑا تھا۔ یقیناً میرے یہاں پہنچنے سے پہلے وہ پستول صاف کر رہا تھا۔

میں اس کے سامنے لکڑی کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہے سلیم ناراض ہو؟"

وہ یکسر خاموش رہا۔ میں نے کہا۔ "اگر ناراض ہو تو اس کی کوئی وجہ بھی ہو گی۔"

اس نے پستول کو ایک جھٹکے سے بند کر کے ہولسٹر میں ڈال لیا۔ "کوئی وجہ نہیں ہے۔" وہ غرا کر بولا۔ "پاگل ہوں میں' پاگلوں کے کسی کام کی کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ میں تمہارے پیچھے چنگیزیوں کی حویلی میں گیا اس کی کیا وجہ تھی۔ تمہارے فریب کی وجہ سے خنجر کھایا اس کی کیا وجہ تھی۔ تمہیں شاہ دین کے فارم سے لے کر بھاگا اس کی کیا وجہ تھی۔ ساری دنیا کی دشمنی مول لی' عزیزوں رشتے داروں سے منہ موڑا' قانون کو پیچھے لگایا' اشتہاری ملزم بنا' ان تمام کاموں کی کیا وجوہات تھیں؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو شنا' چلی جاؤ چلی جاؤ' میں اپنی ذلیل نگاہیں ڈال کر تمہارے پاک پوتر چہرے کو گناہگار کرنا نہیں چاہتا.........."

اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ "سلیم' مجھے سمجھنے کی کوشش کرو' تم تو میرا سہارا ہو' تم بھی مجھے چھوڑ دو گے تو میں کیا کروں گی' تم تو سب کچھ جانتے ہو' پھر ایسی باتیں کیوں کرتے ہو۔"

وہ کراہ کر بولا۔ "کہا نا کہ میں پاگل ہوں' میری عقل خبط ہو گئی ہے۔ مجھے تمہارے دکھوں کا کوئی احساس نہیں رہا۔ میں ہوس کا بندہ بن گیا ہوں۔ تمہارے زخمی دل کی طرف نہیں تمہارے جسم کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

میں حیران ہو کر سلیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اندر سے یوں ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ میں نے کہا۔ "سلیم! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو' تم تو ایسے نہیں تھے۔"

اس نے کہا۔ "میں ایسا نہیں تھا لیکن اب ہو گیا ہوں۔ میں کب تک جھوٹ بولتا رہوں گا۔ تم پر جو سانحہ گزارا ہے' مجھے اس کا دکھ تم سے کچھ کم نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ وہ سب کچھ چاہتا ہوں جو ایک مرد ایک عورت سے چاہتا ہے۔ کیا تم مجھے وہ سب کچھ دے سکتی ہو؟ یا اچھے دنوں کا وعدہ ہی کر سکتی ہو؟ اگر نہیں تو پھر میں کس آس پر زندہ رہوں۔ کیوں ملوں تم سے اور کیوں تمہارے آس پاس بھٹکتا رہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ایک دو دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

میری آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جلنے لگیں۔ اس گھڑی سلیم مجھے بے حد بے رحم اور نامہرباں نظر آیا۔ ایک ایسا مرد جو میرے عورت ہونے کے گناہ کو کسی صورت معاف نہیں کر رہا تھا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر اس کے کمرے سے چلی آئی۔ وہ ساری رات میں نے جاگتے ہوئے گزار دی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں' میرے فرحان کی چیخیں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ مجھے آگے بڑھنے کے لئے کسی سہارے کی ضرورت تھی' مگر میرے سائے کے علاوہ کوئی میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ راز کہیں اس کوٹھی میں یا اس کے گرد و نواح میں دفن تھا جو چنگیزیوں کے لئے موت کا پھندا بن سکتا تھا۔ مگر وہ کہاں تھا؟ اس رات نظر آنے والی وہ پراسرار سرگرمی کیا تھی؟ میں سلیم سے اس بارے میں بات کرنے گئی تھی مگر وہاں ایک دوسرا ہی موضوع شروع ہو گیا تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم لیٹی رہی اور صبح ہو گئی۔ اتنے میں دیشو آ دھمکا۔ وہ مجھے جگانے آیا تھا۔ میں پہلے سے جاگ رہی تھی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ کہنے لگا۔

"اچھا ہوا آپ جاگ اٹھیں۔ کل خان صاحب کے لئے ناشتہ مجھے لے جانا پڑا تھا۔ کہنے لگے تم بھانڈ ہو۔ تمہارے لطیفوں میں پھکڑپن ہوتا ہے۔ میں صبح سویرے لیڈر ڈائجسٹ (ریڈرز ڈائجسٹ) کے لطیفے سنتا ہوں۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی ٹھیک تھا۔ پر اس توں بعد تے اوناں نے مجھ پر لطیفیاں کی بارش کر دی۔ لطیفے سنا سنا کر میرا برا حال کر دیا۔ قسم لے لو اب جو ایک سال تک میرے منہ پر ہاسا آئے تو ایسے دردناک لطیفے' توبہ توبہ۔ کہنے لگے یہ مسکرانے والے لطیفے ہیں۔ لو جی یہ بھی کوئی بات ہے۔ لطیفہ تو وہ ہوتا ہے جو سننے والے نوں پھیاں کر دے یا اس کی پسلی چڑھ جائے یا اس کی وکھی پاٹ جائے۔ اسی سے مجھے ایک بات یاد آ گئی ہے۔ ویسے پہلے آپ یہ بتائیں کہ وکھی یعنی دکھی کے لئے

اردو میں کوئی لفظ ہے کہ نہیں۔ میں نے تو بڑا سوچا ہے مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلا.........."

دینو عادت کے مطابق مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ میں چونک گئی۔ کہیں سے عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بالکل ویسی ہی خوشبو جو اس رات لاش کے کفن سے آئی تھی۔ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ یہ خوشبو دینو کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔ اچانک میری نظر دینو کی قمیض پر پڑی۔ اس نے سفید کھڑکھڑاتے لٹھے کی قمیض پہن رکھی تھی اور بالکل نئی تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

"یہ قمیض تم نے کہاں سے لی ہے؟؟"

وہ بولا۔ "جی کل ہی سلوائی ہے۔ وہ نورا گاڑی ہے نا' بھینسوں مجوں والا' اس نے کپڑا دیا تھا۔"

نورا گاڑی' خان رحیمی کی کوٹھی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک الگ تھلگ کچے مکان میں رہتا تھا۔ کوٹھی میں اس کا بہت آنا جانا تھا۔ خان رحیمی کے ساتھ بہت بے تکلفی سے بات کرتا تھا۔ لگتا تھا اس کے بچپن کا دوست ہے۔ میں نے دینو سے پوچھا نورے کے پاس یہ کپڑا کہاں سے آیا؟"

دینو بولا۔ "اس کی بیل گاڑی میں پڑا تھا۔ میں نے پچھا لے لوں۔ کہن لگا لے لو۔ میں نے ایک قمیض بنوا لی' دو کچھے سلوا لئے' اب بھی تھوڑا سا پڑا ہے۔ آپ کو لوڑ ہو تو آپ لے لیں۔"

میں نے غور سے کپڑے کو دیکھا۔ شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ اسی کفن کا کپڑا تھا۔ میں نے کہا۔ "دینو یہ نورا گاڑی اس وقت کہاں ہو گا؟؟"

دینو نے کہا۔ "جی اس ویلے تو وہ اپنی مجیں لے کر نہر کی طرف گیا ہو گا دوپہر کے وقت آئے گا' پر آپ..........؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "یوں ہی پوچھ رہی تھی' ویسے یہ کرتہ تم اتار دو' پتہ نہیں کیوں مجھے برا لگ رہا ہے۔"

دینو نے ناپسندیدگی کی وجہ پوچھی لیکن میں ٹال گئی۔ اتنے میں خان رحیمی کی خوابگاہ کے باہر سے گھنٹی کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کا مطلب تھا وہ ناشتے کے لئے بے چین ہو رہا ہے۔ میں جلدی سے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ناشتہ تیار کرتے ہوئے ذہن مسلسل

نورے گاڑی میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے یاد تھا جس رات لاش غائب ہوئی' صبح صبح نورا گاڑی کوٹھی آیا تھا اور خان رحیمی سے کچھ باتیں کرنے کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس رات میں صبح تک جاگتی رہی تھی۔ کوٹھی کی گاڑیوں میں سے کوئی بھی اسٹارٹ ہو کر نہیں گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر وہ لاش کوٹھی سے کہیں لے جائی گئی تھی تو اس کے لئے گاڑی نہیں بلکہ بیل گاڑی استعمال ہوئی تھی۔ دینو کے بیان کے مطابق کفن یا کفن کے کپڑے کا کچھ حصہ نورے کی بیل گاڑی میں پڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا؟

سوچ سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ نورے گاڑی سے ملنا چاہئے۔ نورے نے دو بھینسیں پال رکھی تھیں اور یہ کوئی معمولی بھینسیں نہیں تھیں۔ کسی بہت خاص نسل کی بھینسیں تھیں اور میں نے سنا تھا کہ ان میں سے ایک ضلع کی سطح کے مقابلے میں انعام بھی حاصل کر چکی ہے۔ میں نے ایک دن نورے سے کہا تھا کہ وہ اپنی بھینسیں دکھائے۔ وہ دکھانے کے لئے لایا تھا مگر میں یوسف کی منگنی کے سلسلے میں اس کے ماموں کے گاؤں گئی ہوئی تھی۔ نورے سے ملنے کا یہ ایک اچھا بہانہ تھا۔ سہ پہر کے وقت میں کوٹھی سے نکلی اور ڈھائی تین فرلانگ دور نورے کے مکان پر پہنچ گئی۔ شاندار سانڈوں والی اس کی بیل گاڑی باہر ہی کھڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ گھر میں ہے۔ صحن کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ نورا بھینسوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ "آؤ بی بی جی بڑی قسمت ہے میری آپ نے میرے گھر میں قدم رکھا۔ اس یوسفے کو بھی لے آنا تھا۔ بڑا خوش ہوتا ہے وہ بھینسوں کو دیکھ کر اور دیکھیں نا جی' چیزیں بھی تو دیکھنے والی ہیں۔"

واقعی بہت شاندار بھینسیں تھیں۔ وہ بولا۔ "میں نے ایک ایک مہینے کی وچھیاں پالی تھیں جناب! پچھلے سے پچھلے سال بیل گاڑیوں کی دوڑ ہوئی تھی چنیوٹ میں' ڈپٹی کمشنر صاحب نے اول انعام دیا تھا مجھے۔ دو ہزار روپیہ نقد تھا ایک پگڑی تھی اور یہ وچھیاں تھیں۔"

میں بھینسوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ درحقیقت میں کچھ دیر یہاں رکنا چاہتی تھی۔ ممکن تھا کہ نورے کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جس سے اس کے مسئلے پر روشنی پڑتی۔ میں نے باتوں باتوں میں یوسف کی منگنی کی رات کا ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا اس نے گلوکاروں اور مزاحیہ فنکاروں کا شور دیکھا تھا؟

152168

اس نے بتایا کہ شروع شروع میں دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "پھر کہاں چلے گئے تھے؟"

وہ گڑبڑا گیا' بولا۔ "بس جناب! نیند آگئی تھی۔"

میں اس سے بھینس کا دودھ دھونے کا طریقہ سیکھنے لگی۔ وہ بڑی توجہ اور دلچسپی سے سکھانے لگا۔ ادھیڑ عمر شخص تھا لیکن کافی ہنس مکھ اور باتونی۔ دوبارہ یہاں آنے کے لئے کوئی بہانہ تو چاہئے تھا لہٰذا میں نے دودھ دھونے میں بہت دلچسپی کا اظہار کیا اور کہا کہ کل میں پھر آؤں گی......... اگلے روز سہ پہر کے وقت میں پھر نورے کے مکان میں جا پہنچی۔ وہ بیل گاڑی کے اوپر بیٹھا جھاڑو پھیر رہا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے نورے؟" میں نے پوچھا۔

"بس جی صفائی کر رہا تھا۔ آپ اندر چلیں میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے غور سے دیکھا۔ بیل گاڑی میں وہ برادہ سا پڑا ہوا تھا جو غالباً مرغیوں کی خوراک تھی۔ شاید ابھی ابھی وہ خوراک کے تھیلے کہیں اتار کر آیا تھا۔ میں اندر چلی آئی۔ چند لمحے بعد نورا بھی آگیا۔ اس نے ڈبی دار دھوتی پر سفید شلوکا پہن رکھا تھا۔ چال ڈھال سے خالص دیہاتی آدمی نظر آتا تھا۔ میں باتوں باتوں میں اسے کریدنے کی کوشش کرنے لگی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کسی شک میں نہ پڑ جائے۔ لہٰذا بہت محتاط گفتگو کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ڈھب پر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے سفید شلوکے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"نورے! یہ شلوکا تو نے نیا سلوایا ہے؟ ایسا ہی کپڑا میں نے دینو کے پاس بھی دیکھا تھا۔"

"ہاں جناب! وہ میں نے ہی دیا تھا' بس ایک جگہ سے مل گیا تھا۔"

"میں نے پوچھا۔ "اور کپڑا مل سکتا ہے؟"

وہ بولا۔ "ایسی تو کوئی خاص بات نہیں اس کپڑے میں' آپ نے کیا کرنا ہے؟"

"بس تھی ضرورت۔" میں نے کہا ایسی ہی باتوں کے دوران وہ مجھے دودھ دھونے کے گر سکھاتا رہا۔ اتنے میں گرج چمک ہونے لگی۔ جب میں کوٹھی سے چلی تو ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور بادل بھی تھے لیکن اتنی جلدی موسم خراب ہو جائے گا پتہ نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارش ہونے لگی۔ نورے نے جلدی جلدی بھینسوں کو ایک چھپر تلے

باندھا۔ اس کام میں میں نے بھی اس کی مدد کی۔ اچانک بارش تیز ہو گئی۔ بیلوں کی جوڑی کو اندر باندھتے باندھتے ہم پانی میں شرابور ہو گئے۔ بھیگ تو میں گئی ہی تھی۔ سوچا کہ کوٹھی واپس چلی جاؤں مگر اس دوران ژالہ باری ہونے لگی۔ دیہات میں اور خاص طور پر کھلے علاقے میں جہاں کوئی سایہ وغیرہ نہ ہو ژالہ باری بڑی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ میں چاہنے کے باوجود جا نہ سکی۔ نورے نے برآمدے میں اپلوں کی آگ جلائی اور سادگی سے بولا۔ "جناب! آپ آ جایئے وہاں سردی لگے گی آپ کو۔" لیکن میں برآمدے کے در ہی میں کھڑی رہی۔ بالکل اچانک ہی مجھے اس چار دیواری سے خوف سا آنے لگا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا کہ نورا مجھے "جناب" سادگی یا احترام کی وجہ سے نہیں کہہ رہا بلکہ طنز سے کہہ رہا ہے۔ اس کی عام سی آنکھوں میں کبھی بڑی خاص سی چمک لہرا جاتی تھی۔ جونہی ژالہ باری بند ہوئی۔ میں نے کہا۔ "اچھا نورے میں چلتی ہوں۔"

وہ عجیب لہجے میں بولا۔ "اتنی جلدی جناب عالی' کوئی گپ شپ لگاؤ میرے ساتھ۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو ہی جائے۔" میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے نورے نے ہاتھ بڑھایا اور قریب رکھے اپلوں کے ڈھیر میں سے ایک طاقتور رائفل نکال لی۔ رائفل کو گود میں رکھ کر وہ کسی پالتو جانور کی طرح تھپکنے لگا۔ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بادشاہو! دودھ دھونا تو آپ نے سیکھ لیا' اب جاسوسیاں شاسوسیاں بھی سیکھ لو' سیکھے بغیر کوئی کام نہیں آتا!"

میں نے کہا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

وہ بولا۔ "کہنا تو کچھ نہیں چاہتا' سننا چاہتا ہوں اور خان صاحب بھی سننا چاہیں گے۔"

"کیا سننا چاہیں گے؟"

"یہی کہ تم ہو کون' تمہارا اصل نام اور پتہ ٹھکانہ کیا ہے۔ تمہیں کس نے بھیجا ہے اور کس لئے.........؟" آخری الفاظ کہتے کہتے نورے کا لہجہ جنونی ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کسی درندے کی طرح روشن تھیں۔ میں نے صحن میں نکلنے کے لئے قدم بڑھایا تو وہ لپک کر میرے سر پر پہنچ گیا۔ بازو سے پکڑ کر اس نے اتنا شدید جھٹکا دیا کہ میں لڑکھڑاتی

ہوئی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس نے لپک کر کمرے کی کنڈی اندر سے بند کر دی۔ پہلی مرتبہ مجھے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ وہ غرا کر بولا۔

"میں بڑا برا آدمی ہوں میم صاحب! مجھ سے جھوٹ بولے گی تو بڑا پچھتائے گی۔ مجھے تجھ پر اسی وقت شک ہو گیا تھا جب تو نے یہاں نوکری کی تھی۔ بتا کس چکر میں آئی ہے یہاں؟"

میں نے کہا۔ "نورے تجھے غلط فہمی ہو رہی ہے' اور اپنی زبان سنبھال کر بات کر' میں ایسا لہجہ سننے کی عادی نہیں ہوں۔"

نورے نے بھنا کر رائفل کی سرد نال میری گردن سے لگا دی۔ دانت پیس کر بولا۔

"اپنے آپ پر رحم کھا بیوقوف! میں تجھے بتا چکا ہوں کہ اچھا آدمی نہیں ہوں۔ سچ بتا دے ورنہ پچھتائے گی۔ میں نچوڑ دیتا ہوں جھوٹ بولنے والے کو۔"

میں خود کو چوہے دان میں محسوس کر رہی تھی۔ نورے کے بارے میں میرے اندازے غلط نکلے تھے۔ وہ میری توقع سے کہیں ہوشیار اور خطرناک شخص تھا۔ وہ ایک ایسے معمولی چہرے کا مالک تھا جو کسی بھی شخص کو دھوکا دے سکتا ہے.......... یہی وہ وقت تھا جب مجھے بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس دستک نے نورے کو بری طرح ٹھٹھکا دیا۔ وہ بجلی کی طرح تڑپ کر چارپائی پر گرا اور میرے منہ کو اپنے مضبوط ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ "کون ہے؟" وہ اندر سے ہی پکار کر بولا۔

"نورے! یہ میں ہوں بابری۔" صحن سے سلیم کی آواز آئی۔ "شاہدہ بی بی تو ادھر نہیں آئی!"

میں اپنی جگہ پر پڑی کسمسائی لیکن نورے کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ بولا۔ "کل آئی تھیں آج تو نہیں آئیں.......... ذرا کپڑے بدل رہا ہوں تم دو منٹ ٹھہرو میں آتا ہوں۔"

سلیم نے کہا۔ "نہیں جلدی ہے پھر آؤں گا پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے۔"

بارش کے پانی میں سلیم کے قدموں کی چاپ سنائی دی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ واپس جا رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر خود کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ سلیم غالباً بیرونی دروازے کو پار کر چکا تھا۔ بے بسی کا شدید احساس میرے رگ و پے میں دوڑ

گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا بایاں پاؤں کمرے کی بند کھڑکی بالکل پاس ہے۔ میں نے اس پاؤں کو ذرا سا آگے بڑھا کر زور زور سے کھڑکی پر مارا۔ نورے نے میری یہ ٹانگ کھینچنے کی کوشش کی تو میرے سر پر سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ایک جھٹکے سے میں نے اپنا منہ آزاد کرایا اور چیخ کر سلیم کو آواز دی۔ آواز ابھی پوری طرح بلند بھی نہیں ہوئی تھی کہ نورے نے بھرپوری قوت سے میرا منہ ڈھانپ لیا۔ تاہم یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ سلیم دوبارہ کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ "کیا بات ہے؟" سلیم نے باہر سے نورے کو مخاطب کیا اس نے میری ادھوری چیخ نہیں سنی تھی لیکن کھڑکی کے تختے بجنے کی آواز اس تک پہنچ گئی تھی۔ "کیا بات ہے نورے؟" اس نے ذرا بلند آواز میں پوچھا۔ "کچھ نہیں۔ میں نے تو نہیں بلایا۔" نورے نے جواب دیا۔ یہ محسوس کر کے میری امید بندھی کہ نورے کی آواز نارمل نہیں ہے۔ صاف طور پر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی سے زور آزمائی کرتے ہوئے بول رہا ہے۔

"دروازہ کھولو نورے۔" سلیم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ نورا خاموش رہا سلیم نے دو تین دفعہ اپنا فقرہ دہرایا۔ پھر اچانک زور کا دھماکہ ہوا اور دروازے کا ایک حصہ ٹوٹ کر دور جا گرا۔ میں نے سلیم کو تیزی سے اندر آتے دیکھا اس وقت تک نورا مجھے چھوڑ کر اپنی رائفل سنبھال چکا تھا۔ سلیم کی لپیٹ سے بچتے ہوئے وہ تیزی سے ایک طرف ہو گیا اور گولی چلا دی۔ دھماکے سے کمرہ لرز اٹھا۔ رائفل کی نال کے رخ سے مجھے اندازہ ہوا کہ نورے نے سلیم کو گولی نہیں ماری صرف اسے ڈرایا ہے۔ گولی کمرے کے کچے فرش میں پیوست ہوئی تھی۔ نورے نے سلیم کو گالی دی اور کڑک کر بولا۔

"خبردار بابری' ایک قدم بڑھایا تو کلیجہ پھاڑ دوں گا۔"

سلیم ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا مگر اس کا چہرہ مجھے بتا رہا تھا کہ وہ رکے گا نہیں اب تک میں اس چہرے کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔ اس چہرے کے دو روپ تھے۔ پہلا روپ ایک عام انسان کا تھا اور دوسرا ایک جنگجو درندے کا' جو ہر اندیشے کو بالائے طاق رکھ کر اپنے دشمن پر جھپٹ پڑتا ہے اور اس وقت سلیم نے یہی روپ دھار رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے برق سی لہرا گئی۔ سلیم نے تیزی سے نیچے جھک کر دو قدم اٹھائے اور نورے کو اپنے کندھے کی ضرب سے دھکیل کر دیوار پر دے مارا۔ سلیم کا

ایک ہاتھ نورے کی کمر سے لپٹا ہوا تھا اور دوسرا رائفل پر تھا۔ دوسرا دھماکہ ہوا اور اس مرتبہ گولی چھت پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔ کمرے میں بارود اور دھواں پھیل گیا اور چھت سے مٹی گرنے لگی۔ نورا اور سلیم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ نورا سلیم سے کمزور نہیں تھا۔ لڑائی بھڑائی میں وہ بھی ماہر نظر آتا تھا اس نے رائفل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی اور سلیم کو دھکیل کر دیوار سے لگا دیا تھا لیکن وہ ایک بات سے بالکل بے خبر تھا۔ سلیم اسے بتدریج اپنے ڈھب پر لا رہا تھا۔ اس کی خوفناک ٹکر کسی بھی وقت اس کے چہرے پر پڑنے والی تھی۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ دھم کی آواز سے نورے کے سر نے جھٹکا کھایا اور اس کے ناک منہ سے خون نکلنے لگا۔ وہ حیران سا ہو کر سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت سلیم کی دوسری ٹکر اس کے چہرے پر پڑی اور وہ اچھل کر دور جا گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اس کے بعد سلیم نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ٹھوکروں ٹکروں اور گھونسوں سے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ میں نے آگے بڑھ کر بمشکل اس کی جان بچائی۔ اب وہ چاروں شانے چت زمین پر پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے خون آلود چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار تھے۔ میں نے دیکھا اس کی بائیں ٹانگ دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ پاؤں اور گھٹنے کی پوزیشن دیکھ کر مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کی پنڈلی ٹوٹ چکی ہے۔ یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ بڑی خوفناک لگ رہی تھی۔ نورے نے اٹھنے کی کوشش کی تو چیخ مار کر پھر سید ھا لیٹ گیا۔ سلیم نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"شاہو باہر کا دروازہ بند کر آؤ۔"

میں نے جا کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ کمرے میں رائفل کے دو دھماکے ہو چکے تھے مگر خوش قسمتی سے یہ مکان الگ تھلگ تھا اور ویسے بھی گھن گرج کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ کسی کے باخبر ہونے کا امکان نہیں تھا۔ میں واپس برآمدے میں پہنچی تو کمرے سے نورے کی آواز آئی۔ وہ سلیم کو خوفناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ اسی طرح فرش پر پڑا تھا۔ چہرے پر تکلیف کے آثار کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ سلیم نے چارپائی کی رسی کے ساتھ اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اور میرے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

ناراضگی بھرے لہجے میں بولا۔ "تم یہاں کیا لینے آئی تھیں۔ میں نہ پہنچتا تو پتہ نہیں وہ کیا کر جاتا۔"

میں نے کہا۔ "جب تم نے میری بات نہیں سنی تو مجھے خود آنا پڑا۔"

"کیسی بات نہیں سنی میں نے؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی اہم بات ہو گئی اس لئے تو تمہارے پاس آئی تھی۔"

"شاہو پہیلیاں نہ بوجھواؤ۔ ہم جس چکر میں پھنسے ہوئے ہیں یہ بہت خطرناک ہے۔ اور یہ الو کا پٹھا نورا سب کچھ جان چکا ہے۔ مجھے کہہ رہا تھا تم دونوں غدار ہو اور یہاں جاسوسیاں کرنے کے لئے آئے ہو۔"

میں نے ضروری سمجھا کہ سلیم کو وہ سب کچھ بتا دوں جو اس رات چھت پر پیش آیا تھا۔ میں نے لاش نظر آنے کے واقعے سے لے کر دیبو کی منحوس قمیض تک سب کچھ اس کے گوش گزار دیا۔ وہ حیرانی سے سنتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد میری روداد ختم ہوئی تو سلیم کے چہرے پر کرختگی کچھ اور بڑھ چکی تھی.......... اندر سے نورے کے کراہنے کی آوازیں بدستور آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ گالیاں بھی بکنے لگتا تھا۔ سلیم کو سامنے ایک کھلی الماری میں تالا نظر آ گیا۔ یہ تالا لے کر وہ باہر گیا اور بیرونی دروازے کو باہر سے مقفل کرنے کے بعد چار دیواری پھلانگ کر اندر آ گیا۔ چولہے میں اپلوں کی آگ ابھی تک روشن تھی۔ سلیم نے مجھے کہا کہ میں یہ آگ بجھا دوں تاکہ دھوئیں کی وجہ سے کسی کو نورے کی موجودگی کا شک نہ ہو۔ اس کے بعد وہ کمرے میں چلا گیا۔ میں نے مٹکے سے پانی لے کر چولہے کی آگ بالکل سرد کر دی۔ اتنے میں کمرے کے اندر سے نورے کی بلند آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ چیخ رہا تھا میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ سلیم کے ہاتھ میں رائفل تھی اور نے اپنا ایک پاؤں نورے کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر رکھا ہوا تھا۔ سلیم کی آنکھوں میں سفاکی تھی اور نورے کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ "سلیم یہ کیا کر رہے ہو؟"

وہ بولا۔ "شاہدہ تم باہر بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مگر.......... یہ بات ٹھیک نہیں۔"

اس نے کہا۔ "تم اسے نہیں جانتی ہو یہ شخص کسی طرح رحم کے قابل نہیں۔ میں

تمہیں بتاؤں گا اس کے بارے میں تم باہر جاؤ۔"

میں ابھی ہوئی باہر آ گئی۔ بند کمرے کے اندر سے نورے کی خوفناک چیخیں سنائی دینے لگیں۔ سلیم اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ لاش کس کی تھی اور اس رات وہ اسے کہاں چھوڑ کر آیا تھا۔ جواب میں نورا واہیات بک رہا تھا اور سلیم کو دھمکیاں دے رہا تھا کہ خان رحیمی مجھے اور سلیم کو کتے کی موت مار دے گا۔ بہرحال کچھ دیر بعد اس کی اکڑفوں ختم ہو گئی اور وہ دھمکیاں دینے کی بجائے رونے اور چلانے لگا۔ مجھ سے یہ ساری آوازیں برداشت نہیں ہوئیں اور میں کانوں میں انگلیاں دے کر بھینسوں والے چھپر تلے جا بیٹھی۔ کوئی پانچ منٹ بعد سلیم باہر آیا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ میں نے کانوں سے انگلیاں نکالیں۔ نورے کی چیخ دھاڑ سنائی نہیں دی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"مر گیا کمبخت............ بتایا کچھ نہیں۔"

میں سر سے پاؤں تک ہل گئی۔ "کیا کہا مر گیا؟"

"مرا ہی نہیں سمجھ بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"میں نے کہا۔ "سلیم اب کیا ہو گا۔ یہ تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے خان رحیمی سے ہماری اصلیت چھپی نہیں رہے گی۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔" سلیم نے اعتماد سے کہا۔ "جب تک ہم یہاں سے فارغ نہیں ہو جاتے' نورے اور خان رحیمی کی ملاقات نہیں ہو گی۔ میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں اسے ٹھکانے لگا کر ابھی آتا ہوں۔"

"میں نے کہا۔ "سلیم کوئی غلط کام نہ کرنا میں تمہیں قاتل نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" سلیم نے کہا اور تیزی سے اندر چلا گیا کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا تو اس کے کندھے پر نورے کا بے ہوش جسم تھا وہ اسے کہیں لے جا رہا تھا۔

صرف آدھ گھنٹے بعد سلیم واپس آ گیا شام ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ بارش تھم گئی تھی۔ اب صرف بوندا بوندی ہو رہی تھی۔ میں نے سلیم سے پوچھا کہ وہ نورے کو

کہاں چھوڑ آیا ہے۔ اس نے کہا گھبراؤ نہیں وہ جہاں بھی ہے زندہ ہے اور محفوظ ہے ہمارا مقصد اسے چند دن کے لئے خان رحیمی سے دور رکھنا ہے۔ ہم دونوں نے مل کر نورے کے گھر کی مکمل تلاشی لی اس کے ایک صندوق میں سے دیسی شراب کی ایک پلاسٹک گیلن' بے ہودہ تصویروں والے تاش' چرس کی گولیاں اور دو خم دار چاقو برآمد ہوئے۔ ایک کمرے سے ہلکی ہلکی بو اٹھ رہی تھی ہم دروازہ کھول کر اندر پہنچے تو خون آلود سوتی تھیلا نظر آیا یہ تھیلا آٹے کے بڑے بورے جتنا تھا وہ تین چوتھائی کسی شے سے بھرا ہوا تھا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر تھیلے کا منہ کھولا اس میں گوشت تھا چھوٹی چھوٹی بوٹیاں تھیں۔

میں نے غور سے ان بوٹیوں کو دیکھا تو خوف آمیز حیرت کی ایک لہر جسم میں دوڑ گئی۔ یہ مختلف جانوروں اور پرندوں کا قیمہ سا تھا۔ کہیں چوہے کی دم نظر آ رہی ہے کہیں کوے کی چونچ' کہیں گلہری کا سر اور کہیں جنگلی خرگوش کا پنجہ۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نورے نے جنگل میں کہیں جال لگایا تھا اور اس میں جو جو کچھ پھنسا تھا وہ اٹھا کر لے آیا تھا اور اس کا قیمہ کر ڈالا تھا۔ قریب ہی قصائیوں کا ایک اوزار جسے غالباً "بگدا" کہا جاتا ہے رکھا تھا۔ درخت کے تنے کا وہ گول ٹکڑا بھی موجود تھا جس پر رکھ کر گوشت بنایا جاتا ہے۔ میں اور سلیم حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے یہ قیمہ نما گوشت جس تھیلے میں بند تھا اس پر مرغیوں کی خوراک بنانے والی ایک فرم کی مہر لگی تھی۔ میں نے سلیم کو بتایا کہ نورے کی بیل گاڑی میں بھی مرغیوں کی خوراک بکھری ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مرغی خانے میں اس کا آنا جانا ہے۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے بھی ایک دن خان رحیمی کی زبان سے کسی مرغی خانے کا ذکر سنا تھا۔

میں نے سلیم سے پوچھا۔ "یہاں اردگرد کوئی مرغی خانہ ہے؟"

"سلیم نے کہا۔ "سنا تو میں نے بھی ہے شاید باغاں والے گاؤں کے پاس ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس مرغی خانے سے کچھ نہ کچھ پتہ چل سکتا ہے وہاں ضرور جانا چاہئے۔" سلیم کچھ دیر خالی خالی نظروں سے خون آلود تھیلے کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے میں ابھی چکر لگاتا ہوں وہاں کا تم فوراً کوٹھی چلی جاؤ یہ نہ ہو ان لوگوں کو شک پڑ جائے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے تمہارے ساتھ چلنا چاہئے۔"

"کیوں؟"

"میں ڈاکٹر ماڑی کی طرف جانے کا بہانہ کر کے نکلی تھی۔ وہاں نہ جاؤں گی تو غلط ہو گا۔" ڈاکٹر ماڑی ایک ادھیڑ عمر مشکوک ڈاکٹر تھا۔ مشکوک اس لئے کہ کسی کو ٹھیک طرح معلوم نہیں تھا کہ اس نے ایم بی بی ایس کیا ہے یا نہیں۔ کوٹھی سے کوئی دو کلو میٹر دور اس کا چھوٹا سا کلینک تھا۔ یہ کلینک عین نہر کے پل پر گھنے درختوں میں واقع تھا۔ اردگرد کے لوگ اسے بہت مانتے تھے۔ خود میرے کندھے کے پرانے زخم میں درد شروع ہوا تھا تو خان رحیمی نے مجھے اس کی طرف جانے کی ہدایت کی تھی۔ ڈاکٹر ماڑی کے کلینک سے "باغاں والی" کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ سلیم کے ساتھ ہی چلی جاؤں ویسے بھی اب شام ہونے والی تھی اور میرا اکیلا جانا ٹھیک نہیں تھا۔ مکان چھوڑنے سے پہلے ہم نے وہاں اپنی موجودگی کے تمام شواہد مٹا دیئے۔ سلیم نورے کی رائفل ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ رائفل یہیں کہیں چھپا دے۔ اس نے رائفل کو ایک موٹی کاغذ میں لپیٹا اور گھر سے باہر جنتر کی جھاڑیوں کے نیچے دبا دیا۔ باہر وہ کھٹارہ ویو ہیکل موٹر سائیکل کھڑی تھی جو ان دنوں سلیم کے استعمال میں تھی۔ نورے کے مکان کو باہر سے تالا لگا کر ہم موٹر سائیکل پر آ بیٹھے اور نہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ پھسلن کی وجہ سے سلیم ست روی سے جا رہا تھا۔ مغرب کی اذان کے وقت ہم ماڑی کے کلینک پر پہنچے تو میں پردے کے پیچھے خواتین والے کیبن میں چلی گئی۔ سلیم مردانے حصے میں رہا۔ ڈاکٹر ماڑی ایک لمبے تڑنگے شخص سے مصروف گفتگو تھا۔ اس شخص نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور رعب دار نظر آتا تھا۔ ان کا موضوع گفتگو سن کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ شلوار قمیض والا پولیس کا آدمی تھی اور کسی ایسے شخص کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ جس کے بازو پر گولی لگی تھی۔ ڈاکٹر ماڑی بتا رہا تھا کہ پچھلے تین چار دنوں میں کوئی ایسا شخص اس کے پاس نہیں آیا۔ پولیس والا حسب عادت اسے کریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ گفتگو سنتے ہی میرے ذہن میں اس چوڑے شانوں والے کا خیال آیا جو منگنی کی شب لاش لے کر حویلی کی چھت پر پہنچا تھا اس کا ایک بازو صاف طور پر زخمی دکھائی دیتا تھا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ سلیم اشتہاری ملزم تھا اور پولیس والے کے سامنے تھا۔ کوئی بھی گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ میں ایسی جگہ بیٹھی تھی کہ ڈاکٹر اور پولیس والے کی گفتگو سن سکتی تھی۔ مگر سلیم دوسرے مریضوں کے ساتھ جس بنچ پر بیٹھا تھا۔ کافی دور تھا اس لئے یہ اندازہ کرنا

مشکل تھا کہ ڈاکٹر سے ہم کلام شخص پولیس آفیسر ہے۔

میں بے چین ہو گئی اگر میں یہاں سے اٹھ کر جاتی تو ڈاکٹر نے ضرور پوچھنا تھا بیٹی کیا ہوا کہاں جا رہی ہو۔ ایسی صورت میں مجھے جواب دینا پڑتا اور اپنا چہرہ بھی دکھانا پڑتا۔ اگر میں خود کو چھپا کر کیبن میں بیٹھی رہتی تو سلیم کسی مشکل میں پھنس سکتا تھا۔ اس مسئلے کا حل میں نے یہ نکالا کہ منہ پر چادر کا پلو رکھ کر تیز قدموں سے باہر نکلی انداز ایسا ہی تھا کہ جیسے شدید متلی ہو رہی ہے اور میں کلینک کے فرش کو آلودہ ہونے سے بچانا چاہتی ہوں۔ باہر نکل کر میں املی کے ایک پیڑ تلے اکڑوں بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں پر جھکا لیا۔ سلیم بھاگا ہوا آیا۔ "کیا ہوا شاہ؟" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر ماڑی کے پاس پولیس والا بیٹھا ہے۔ یہاں رکنا ٹھیک نہیں تم موٹر سائیکل دھکیل کر آگے لے جاؤ میں آتی ہوں۔" سلیم میری بات سمجھ گیا۔ میں کچھ دیر بیماروں کے انداز میں اسی جگہ بیٹھی رہی پھر اٹھی اور تیز قدموں سے درختوں کی طرف چل دی تقریباً پچاس گز آگے سلیم کھڑا مل گیا۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں ساری بات بتائی۔ اس نے پوچھا اب کیا ارادہ ہے۔ میں نے کہا۔ "رات ہو گئی ہے میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔" وہ بولا "اب یہاں تک آئے ہیں تو مرغی خانہ بھی دیکھ جائیں تھوڑی دور ہے۔" میں خاموشی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے نہر کے ساتھ ساتھ جنوبی سمت بڑھنے لگا کوئی دو فرلانگ آگے مرغی خانے کے آثار نظر آئے۔ میں دیکھ کر حیران ہوئی یہ ایک معمولی سی کلرزدہ عمارت تھی۔ ایک چار فٹ اونچی چاردیواری کے اندر تین لمبی کوٹھڑیاں تھیں۔ جن کی کھڑکیوں پر سوراخ دار جالی لگی تھی۔ چند میلے کچیلے بلب ان کوٹھڑیوں کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ کس ٹٹ پونجیئے دیہاتی کا مرغی خانہ تھا۔ جو سب سے حیران کن چیز یہاں نظر آئی وہ خان رحیمی کی ٹویوٹا جیپ تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ خان رحیمی بذات خود اس وقت مرغی خانے میں موجود ہے۔ اس چھوٹے سے خستہ حال مرغی خانے میں خان رحیمی کا کیا کام ہو سکتا ہے۔ یہ بات غور طلب تھی۔ خان رحیمی کی جیپ دیکھنے کے بعد ہمارا یہاں رکنا عقل مندی کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔ لہٰذا ہم خاموشی سے واپس چلے آئے۔ موٹر سائیکل چلاتے ہوئے سلیم بالکل خاموش تھا۔ اس کے اطوار سے ظاہر تھا کہ کوٹھی میں میری غیرموجودگی سے پریشان ہو کر وہ میرے پیچھے تو چلا آیا ہے مگر ابھی تک سخت ناراض ہے۔

میں نے ہی بات چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اس مرغی خانے میں ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔"

"ہوں۔" سلیم نے مختصر ترین جواب دیا۔

میں نے کہا۔ "پولیس والے کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ لاش کوٹھی تک لے جانے والے افراد پولیس کی نظر میں آچکے ہیں۔"

سلیم نے کہا۔ "کوٹھی کے پرانے مہمان خانے میں روزانہ تین چار آدمیوں کا کھانا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی لوگ ہیں۔"

"پھر اب کیا کرنا چاہئے؟"

"میں تو کہتا ہوں زیادہ چکروں میں نہ پڑو اس بڈھے خان رحیمی کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ میرے پاس ایک ٹھکانہ ہے۔ وہاں کسی کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ اگر یہ بڈھا سب کچھ نہ بتا دے تو میرا نام سلیم نہیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں سلیم اتنی جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ بعض کام زور آزمائی سے خراب بھی ہو جاتے ہیں۔"

وہ تلخی سے بولا۔ "تم نے کبھی کسی کی مانی ہے جو اب مانو گی۔"

میں نے کہا۔ "سلیم تم اتنا کام کرو دن کے وقت کسی بہانے اس مرغی خانے کا ایک اور چکر لگاؤ پتہ تو چلے یہاں ہے کیا۔ اگر خان رحیمی کا اس مرغی خانے سے اتنا گہرا تعلق ہے تو ہو سکتا ہے وہ کفن پوش جسم بھی یہاں لایا گیا ہو۔"

سلیم خاموش رہا اس سے اس کی نیم رضامندی کا اظہار ہوتا تھا۔ یکایک سلیم نے بریک لگائی اور موٹر سائیکل پھسلتے پھسلتے بچی۔ میں نے دیکھا ہیڈ لائٹ میں ایک سرخ مورس گاڑی نظر آ رہی تھی۔ پھسلن کی وجہ سے گاڑی کا اگلا پہیہ ایک گڑھے میں جا گرا تھا۔ اب گاڑی کی سواریاں اسے نکالنے کے لئے دھکا لگا رہی تھیں۔ دھکا لگانے والوں میں ایک مرد تھا اور ایک عورت تھی' عورت کو دیکھتے ہی میں چونک گئی وہ عشرت تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے یاد آیا کہ میں یہ سرخ موٹر کار شاہ دین ٹوانہ کے فارم میں دیکھ چکی ہوں۔ کار کی چھت پر بڑا اٹیچی کیس بندھا ہوا تھا۔ عشرت نے پتلون اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ دھکا لگانے کی وجہ سے وہ بری طرح ہانپی ہوئی تھی۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں سے خوشی

کی چیخ نکل گئی۔

"اوہ بابری تھینکس گاڈ بڑے وقت پر آئے ہو تم" وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ "یہ دیکھو تمہارے گاؤں کے راستے نے کیا حال کیا ہے میرا۔" اس کا لباس اور چہرہ کیچڑ کے چھینٹوں سے لتھڑا ہوا تھا۔ غالباً پہیہ گڑھے کے اندر گھومتا رہا تھا اور اس نے دھکا لگانے والوں کا حشر کر دیا تھا۔ ہم دونوں بھی موٹر سائیکل سے اتر آئے۔ عشرت نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھا اور السلام علیکم کہہ کر خاموش ہو گئی۔ عشرت کے ساتھ گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ ایک ملازم بھی تھا۔ ڈرائیور اندر بیٹھا تھا اور ملازم عشرت کے ساتھ مل کر دھکا لگا رہا تھا۔ اب ہم دونوں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد گاڑی نکل آئی۔ عشرت نے مجھ سے کہا کہ میں ان کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔ سلیم موٹر سائیکل پر پیچھے پیچھے آنے لگا۔ عشرت نے بتایا کہ چار روز پہلے منگنی پر ہی یہ پروگرام بن چکا تھا کہ شاہ صاحب اور وہ یہاں آئیں گے اور دس بارہ روز قیام کریں گے۔ خان رحیمی اور شاہ دین کے درمیان شکار وغیرہ کی منصوبہ بندی بھی ہوئی تھی۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ چھت پر صندوق کیسا ہے اور کل شام خان رحیمی نے مجھے بالائی منزل کے دو کمرے صاف کروانے کو کیوں کہا تھا۔ میں نے عشرت سے پوچھا کہ شاہ صاحب کیوں نہیں آئے۔ وہ بولی۔ "بیٹھے ہوں گے اس ننھے کٹنی کے پاس اسے خیر سے آج کل دماغی دورے پڑ رہے ہیں کہہ رہے تھے اسے لاہور میو ہسپتال لے کر جانا ہے فارغ ہو کر آ جاؤں گا۔"

میں سمجھ گئی کہ یہ ذکر بے چاری عابدہ کا ہو رہا ہے۔ عشرت کی باتوں سے پتہ چلا کہ جب سے شاہ دین کے ڈیرے پر یوسف کو مارا پیٹا گیا تھا عابدہ کی ذہنی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ دیوانگی کی حالت میں اس نے اپنی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سرمہ سلائیاں پھیر لیں تھیں اور کہا تھا کہ جو آنکھیں اپنے گمشدہ اسلم کو نہیں دیکھ سکتیں وہ کسی اور کو بھی کیوں دیکھیں۔ اس کوشش میں اس کی ایک آنکھ بالکل ضائع ہو گئی تھی اور دوسری بھی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اس کی حالت سے خوف کھا کر شاہ دین ٹوانہ گوپور سے یوسف کو پکڑ کر لے گیا تھا۔ اب وہ سارا دن یوسف کو سامنے بٹھائے آنکھیں کھول کھول کر دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ جب ٹھیک طرح دیکھ نہیں پاتی تھی تو رونے لگتی تھی اور اس پر تشنج

دورہ پڑ جاتا تھا۔ ترسی ہوئی ماستا کا یہ انجام میرے کلیجے کو دہلا گیا۔ کاش اپنے کالے ہاتھوں سے ماؤں کے جگر گوشے نوچنے والے جان جائیں کہ بچے کو کھو کر ماں کا کیا حال ہوتا ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت سلیم نے آ کر مجھے اطلاع دی کہ وہ اس پولٹری فارم میں گیا تھا اس نے بتایا کہ اس وقت خان رحیمی بھی وہاں ہے۔ پولٹری فارم کے وسیع احاطے میں وہ باز اڑانے کی مشق کر رہا ہے۔ سلیم نے جو کچھ بتایا وہ مختصراً یوں تھا کہ وہ پولٹری فارم سے کچھ فاصلے پر درختوں میں چھپ کر سب کچھ دیکھتا رہا ہے۔ خان رحیمی کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک شکل و صورت سے انگریز دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے ربڑ یا کپڑے کا مصنوعی پرندہ بنا کر ایک تار سے لٹکایا ہوا تھا۔ خان رحیمی بار بار باز کو اس پرندے پر چھوڑتا تھا اور پھر ٹانگ پر بندھی رسی سے جا کر پکڑ لیتا تھا۔ بعدازاں انہوں نے باز کو ایک اصلی پرندے پر بھی چھوڑا اور وہ اسے شکار کرنے میں کامیاب رہا۔ سلیم نے بتایا کہ یہ شیخ والا باز نہیں تھا۔ سلیم کی اطلاع کافی حیران کن تھی۔ اس کوٹھی میں بھی کافی جگہ تھی پھر خان رحیمی باز اڑانے کے لئے مرغی خانے میں کیوں جاتا تھا۔ سلیم نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ مرغی خانے سے واپس آ رہا تھا ایک شخص نے اسے روک کر اس کا نام پتہ پوچھا وہ ایک مشکوک سا آدمی تھا............ کوٹھی کے طول و عرض میں نورے گاڈی کی گمشدگی کا چرچا ہو چکا تھا۔ سب لوگ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ بیل گاڑی کا دھرا ٹھیک کرانے جھنگ گیا ہوا ہے۔ کوئی کہتا تھا کہ اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ شام کو خان رحیمی بھی واپس آ گیا۔ نورے گاڈی کی گمشدگی نے اسے بھی بہت پریشان کیا۔ اس نے سب ملازمین سے پوچھ گچھ کی اور اپنے کارندے چاروں طرف دوڑائے۔ میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ معلوم نہیں سلیم نے اسے کہاں چھپایا ہے اور وہ چھپا رہ بھی سکے گا یا نہیں اگر وہ کہیں سے برآمد ہو جاتا تو سارا کھیل ہی بگڑ جاتا تھا۔ سلیم مطلق فکرمند نہیں تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ اور عشرت ایک دوسرے سے کافی کھل کر باتیں کرتے ہیں۔ شاہ دین ٹوانہ ابھی تک کوٹھی نہیں پہنچا تھا اور وہ ذلیل عورت اس موقع سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔ شاید وہ شاہ دین کے بغیر یہاں آئی ہی اس لئے تھی کہ سلیم کے ساتھ کھل کھیلنے کا موقع مل سکے۔ میں کوئی بچی نہیں تھی، میں صاف اندازہ کر سکتی تھی کہ سلیم مجھے دکھانے

کے لئے عشرت سے میل جول بڑھا رہا ہے۔ اس کی یہ حرکت بالکل بچکانہ تھی۔ میری صحت پر اس کی اس بے راہروی کا کیا اثر پڑتا تھا لیکن ایک روز بات حد سے گزر گئی وہ دونوں سرشام چہل قدمی کے لئے باہر نکلے اور رات کے کھانے تک واپس نہیں آئے۔ خان رحیمی پہلے ہی نورے گاڈی کی وجہ سے پریشان تھا اس واقعہ نے اسے مزید ڈسٹرب کیا۔ میں نے پہلی دفعہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے فکر و تردد کے آثار دیکھے۔ ساڑھے آٹھ بجے تک وہ دونوں واپس تو آ گئے مگر میں نے صاف طور پر محسوس کیا کہ خان رحیمی کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری ہے اور وہ صرف میری وجہ سے چپ ہے۔ اگلے روز میں نے کوٹھی کی چھت پر سلیم کو جا لیا بات کرنے کے لئے موقع اچھا تھا میں نے کہا۔

"سلیم یہ جو کچھ تم کر رہے ہو کیا ہے؟"

وہ بولا۔ "تم سے مطلب؟"

میں نے کہا۔ "کوئی مطلب نہیں مگر یاد رکھو میں یہاں ایک مقصد سے آئی ہوں تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس مقصد کے حصول سے پہلے حالات کو اتنا خراب کر دو کہ خان رحیمی ہمیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دے۔ اگر تم میری مدد نہیں کر سکتے تو نہ کرو مگر میرے لئے مشکلیں تو پیدا نہ کرو۔"

وہ غصے سے بولا۔ "ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں دو تین گھنٹے کی مہلت دینا تو تم گوارا کر لو گی۔" اس کا لہجہ آتش فشاں تھا۔

میں نے کہا۔ "دیکھو سلیم سمجھنے کی کوشش کرو میں تمہاری دشمن نہیں۔ میں تو خوش ہوں کہ تم اپنی زندگی کے بارے میں سوچو کسی کا ہاتھ تھامو............ مگر عشرت جیسی لڑکی کا نہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ تمہاری زندگی قابل رشک ہو۔"

وہ بولا۔ "صرف چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا میں نے بھی بہت کچھ چاہا تھا مگر پاگل تھا کہ امیدوں کے سہارے جیتا رہا اب میں حقیقتوں کے سہارے جینا چاہتا ہوں جو کچھ باقی بچ رہا ہے اسے سمیٹنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم کچھ سمیٹ نہیں رہے بکھیر رہے ہو سلیم۔ سنبھل جاؤ زندگی ابھی اتنی بے کار نہیں ہوئی۔"

"میرے لئے ہو چکی ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا اتنے میں عشرت آتی دکھائی

دی۔ جب سے وہ آئی تھی اس کی آنکھوں میں گلاب سے کھلے ہوئے تھے۔ جسم لچک لچک جاتا تھا اور سانس جیسے ہر وقت چڑھی رہتی تھی۔ دیکھنے والے کو صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس کی دزدیدہ نگاہیں سلیم کے توانا بازوؤں اور کشادہ سینے پر رینگتی رہتی ہیں۔ آج اس نے سرخ پھولوں والا ریشمی جوڑا پہن رکھا تھا۔ بالوں میں سلیقے سے پھول لگائے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر سلیم مسکرانے لگا اور وہ دونوں ایک دوسرے میں یوں کھو کر باتیں کرنے لگے کہ مجھے بیچ جاتے ہی بنی۔

اس رات میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔ سلیم کا جو مجسمہ میرے دل کی زمین پر وقت کے ہاتھوں خود بخود تراشا گیا تھا اپنی شکل و صورت کھونے لگا۔ رات کوئی دس بجے کا وقت تھا جب میرے کمرے سے باہر قدموں کی چاپ گونجی۔ پھر کسی نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے دروازے پر دستک دی۔ میں نے بستر سے اٹھ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

جواب میں سلیم کی بدلی بدلی سی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو بُو کا ایک بھبکا میرے سانس کے ساتھ اندر چلا آیا۔ سلیم کی آنکھیں نیم وا تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ ایک قدم اندر آ کر سرسراتے لہجے میں بولا۔ "روک سکتی ہے مجھ کو روک سکتی ہے تو؟ بالکل بے بس ہے مجبور ہے کچھ نہیں ہے تیرے پاس۔ لے دیکھ میں جا رہا ہوں' تیری آنکھوں کے سامنے جا رہا ہوں۔" وہ بری طرح بہک رہا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جہاں دل چاہے گا جاؤں گا' جہاں مجھے سکون ملے گا' خوشی ملے گی.......... بہت سے ٹھکانے ہیں میرے پاس' تو کیا چیز ہے' تیری وقعت کیا ہے۔ کچلی مسلی عورت' مجھے کچھ نہیں لینا ہے تجھ سے' کبھی آئینے میں اپنی صورت دیکھ' بڑی حور پری بنتی ہے تو' بھول ہے تیری' سب بھول ہے تیری۔"

میں نے اسے بازو سے تھامنا چاہا۔ اس نے ایک وحشیانہ جھٹکے سے میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔ میری کئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ سرگوشی میں غرایا۔ "خبردار! مجھے ہاتھ مت لگا۔ مجھے نفرت ہے تیرے وجود سے۔"

اس نے ایک طرف منہ کر کے دیوار پر تھوکا اور باہر نکل گیا۔ میں نے دیکھا وہ برآمدہ پار کر کے سیدھا عشرت کے کمرے کی طرف جا رہا ہے۔ عشرت کے کمرے کی بتی

ابھی تک روشن تھی۔ غالباً دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا۔ کیونکہ جونہی وہ دروازے پر پہنچا برآمدے میں ایک روشن مستطیل سی چمکی اور وہ دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا۔
میں اپنے کمرے میں بستر پر گم صم بیٹھی کلائی سے رستا خون روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ رات زخمی ناگن کی طرح سوچ کی بھول بھلیوں میں رینگتی رہی۔ رینگتی اور ڈنک مارتی رہی۔ مجھے پہلی بار سلیم کی عقل پر رونا آ رہا تھا۔ وہ مجھے لعنت ملامت کا نشانہ بنا رہا تھا اور اپنی بربادیوں کا ذمے دار قرار دیتا تھا۔ وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا اس معاملے کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ نادرہ بیگم نے میرے لئے چنگیزیوں کا رشتہ کیوں ڈھونڈا؟ میرے ساتھ اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس کی دشمنی سلیم سے تھی۔ وہ سلیم کو چنگیزیوں کے مقابل لا کر اس کا قصہ تمام کرانا چاہتی تھی۔ اس عورت نے اس ذلیل مقصد کے لئے میری زندگی کو بھینٹ چڑھایا تھا۔ سلیم اپنی خواہشات کے ابال میں یہ بات بالکل بھول رہا تھا..........
گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرکتی رہیں۔ پچھلے پہر جب شبنم روتے چاند کا چہرہ مغربی جانب سفیدے کے درختوں میں چھپ رہا تھا' سلیم کا ہیولا برآمد ہوا اور اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے زینے چڑھنے لگا۔

اس رات میں ایک اہم فیصلے پر پہنچ گئی۔ دل میں جو رہا سہا خوف تھا وہ بھی ناپید ہو گیا۔ میری ماماتا نے تہیہ کر لیا کہ اپنے مقصد کے لئے اب خطرے کے ہر دریا میں کود پڑنا ہے۔ اگلے روز صبح سویرے نہا دھو کر میں نے خود کو تر و تازہ کیا۔ تر و تازگی ضروری تھی کیونکہ خان رحیمی صرف مسکراہٹوں کا طالب تھا۔ ساری رات رونے والے چہرے کے ساتھ اس کے سامنے جانے کا مطلب بدمزگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دل پر کیا کچھ بھی بیت رہی ہو اس کے روبرو ہر شخص کو مسکرانا پڑتا تھا اور یہی اس کے کردار کا سب سے عجیب پہلو تھا۔

باورچن سلطانہ سے خان کا ناشتہ تیار کروا کے میں ٹرالی میں دھکیلتی ہوئی اندر لے گئی۔ خان حسب معمول بیڈ پر پھیلا ہوا انگریزی اخبار دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی بے ترتیبی سے لیٹا رہتا تھا لیکن وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت غیر رسمی موڈ میں رہنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ میری آہٹ پر اس نے حسب معمول مجھے سرتاپا تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ لباس کے رنگ ڈھنگ اور بالوں کے سٹائل پر ایک دو فقرے کہے۔ پھر گلدستے

سے گلاب کا ایک تروتازہ پھول لے کر مجھے بالوں میں بائیں جانب لگانے کی ہدایت کی۔

"یو آر رئیلی چارمنگ۔" وہ چہکا۔ "کاش میں نے پیدا ہونے میں اتنی جلد نہ کی ہوتی۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "سر! اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ اتنی ٹھنڈی سانسیں بھریں گے تو نصیب دشمناں بیمار پڑ جائیں گے اور شاہ دین صاحب بھی آج کل میں آنے والے ہیں۔ شکار کا پروگرام دھرا رہ جائے گا۔"

اس نے ہنس کر کہا۔ "میں بیمار ہونے کے خوف سے اپنی آنکھوں کو بند نہیں رکھ سکتا۔"

میں بولی۔ "سر! میں نے تو ٹھنڈی سانسوں کی بات کی تھی۔"

اس نے کہا۔ "ایک ہی بات ہے۔"

میں نے ناشتہ اس کے سامنے میز پر سجا دیا۔ "سر! نورے کا کچھ پتہ چلا؟"

خان رحیمی نے نفی میں سر ہلا دیا اور اپنی ان کوششوں کے بارے میں بتانے لگا جو وہ اب تک نورے کی تلاش کے سلسلے میں کر چکا تھا۔ خان رحیمی بڑی سے بڑی الجھن کو ہلکے پھلکے انداز میں لیتا تھا مگر نورے کے سلسلے میں وہ بڑی حد تک سنجیدہ تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے گفتگو کا رخ شکار اور شاہین بازی کی طرف موڑ دیا۔ میں نے کہا۔

"سر! سنا ہے آپ بازوں اور شاہینوں کو شکار کی ٹریننگ بھی دیتے ہیں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "میں نے کہا۔ "سر! میری بڑی خواہش ہے کبھی دکھایئے نا مجھے بھی کہ کیسے ٹریننگ ہوتی ہے۔"

وہ بولا۔ "چلی چلو............ آج ہی چلی چلو۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تھینک یو سر' تھینک یو ویری مچ' لیکن کہاں جانا ہو گا؟"

وہ مسکرایا۔ "افق کے اس پار' جہاں بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔"

میں نے کہا۔ "سر! یہ تو بڑے خطرے کی بات ہے۔"

وہ بولا۔ "یہ بات تم مجھے خوش کرنے کے لئے کہہ رہی ہو میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں سر! حقیقت بیان کر رہی ہوں کوئی چور ڈاکو ٹکر گیا تو میں اکیلی کہاں تک مقابلہ کروں گی۔"

وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور اپنے بازوؤں کے نادیدہ مسل ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"یو آر رانگ' اتنا گیا گزرا نہیں ہوں میں' کبھی وقت آیا تو دیکھ لینا۔"

اس روز خان رحیمی مجھے اپنے ساتھ ہی مرغی خانے لے گیا۔ مرغی خانے کا مالک بڑی توند والا ایک کالا سا شخص تھا۔ غالباً اس کے گردے میں درد تھا۔ وہ چلتے ہوئے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتا تھا اور دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ مرغی خانے کے دو مدقوق ملازموں کے علاوہ مجھے وہ انگریز بھی نظر آیا جس کا ذکر سلیم نے کیا تھا۔ خان رحیمی نے بتایا کہ یہ پرندوں کا ایک ماہر ڈاکٹر ہے۔ اس اجاڑ بدحال مرغی خانے میں انگلش ڈاکٹر کی موجودگی معنی خیز تھی اور بات صرف ڈاکٹر تک محدود نہیں تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ مرغی خانے کے اردگرد درختوں میں کچھ پراسرار نقل و حرکت جاری ہے۔ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو کمبل کی بکل مارے ایک درخت کے نیچے ٹہل رہا تھا۔ پھر مجھے سخت نقوش والا ایک دیہاتی نظر آیا جس نے دو بکریوں کو گھاس پر منہ مارنے کے لئے چھوڑ رکھا تھا اور خود گرم چادر لئے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ شخص مسلح ہے۔ مرغی خانے کے صحن میں کیکر کے درخت پر بھی ایک شخص چڑھا ہوا تھا۔ بظاہر وہ شاخوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھا مگر گمان ہوتا تھا کہ وہ پہریداری کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے۔ یقیناً اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہوں گے جو مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بڑی خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی' ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ خان رحیمی کا ایک ملازم ایک پنجرہ لے کر آیا۔ اس میں شاہین بند تھا۔ پروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک کم عمر پرندہ ہے۔ اس کے پاؤں میں خوبصورت گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ سخت بے تابی سے پنجرے میں چکرا رہا تھا۔ خان رحیمی نے بتایا کہ اسے دو روز سے بھوکا رکھا گیا ہے۔ پرندے کو پنجرے سے نکال کر اس کے سر پر ایک سیاہ تھیلی چڑھا دی گئی۔ اس کے پاؤں سے رسی نہیں باندھی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ وہ پرندہ نہیں جسے کل سلیم نے دیکھا تھا۔ خان رحیمی نے بتایا کہ یہ شاہین تربیت کے دوسرے مرحلے میں ہے۔ اب یہ شکار کو دبوچ کر شکاری کے پاس واپس لانا سیکھ رہا ہے۔ مرغی خانے کا احاطہ کافی وسیع تھا اور اس میں گھاس اور جھاڑ

جھنکار کثرت سے تھا۔ خان رحیمی کا ایک ملازم لکڑی کا ڈربہ لے کر آیا۔ اس میں چند جنگلی خرگوش بند تھے۔ خان رحیمی شاہین کو اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی پر بٹھا کر تیار ہو گیا۔ ملازم نے ڈربے کا دروازہ کھولا۔ ایک قسمت کا مارا خرگوش ڈربے سے نکل کر گھاس پر بھاگا۔ خان رحیمی نے شاہین کے سر سے کالی تھیلی اتار کر منہ سے ایک مخصوص آواز نکالی۔ شاہین اڑا اور تیر کی طرح جنگلی خرگوش کی طرف گیا۔ خرگوش گھاس میں گھس گیا۔ شاہین اس کے اوپر اڑنے لگا۔ خرگوش کے ہر پینترے کے ساتھ وہ قابل داد انداز میں پینترہ بدلتا تھا۔ پھر اس نے غوطہ لگایا اور کمال ہوشیاری کے ساتھ گھاس کے اندر سے خرگوش کو اچک لیا۔ میرے لئے یہ منظر سنسنی خیز تھا۔ خرگوش شاہین کے پنجوں میں تڑپ رہا تھا۔ اس کی دونوں پچھلی ٹانگیں پنجوں کی گرفت سے نکل کر نیچے لٹک گئی تھیں اور جسم پر خون کی دھاریاں نظر آ رہی تھیں۔ شاہین' خان رحیمی کے سر پر چکرانے لگا۔ خان رحیمی نے منہ سے بار بار مخصوص آواز نکالی۔ آخر شاہین شکار کو لے کر خان رحیمی کے سامنے آ بیٹھا۔ خان رحیمی نے آگے بڑھ کر جاں بلب خرگوش کو شاہین کے پنجے سے چھڑانا چاہا تو اس نے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ بار بار اس پر چونچ آزما رہا تھا۔ ابھی اس کی تربیت ادھوری تھی۔ خان رحیمی نے بمشکل اس کی آنکھوں پر سیاہ تھیلی چڑھائی اور اسے خرگوش سے جدا کیا۔ ایک ملازم نے جلدی سے خرگوش کے گلے پر تکبیر پھیری اور اسے ایک تھیلے میں ڈال دیا۔ خان رحیمی نے قریب رکھی پلیٹ میں سے کلیجی کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر شاہین کی چونچ میں دینے شروع کئے اور اس کی ٹانگوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ پرندے کو سکھلانے کا یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ میں گہری نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ دوپہر کے وقت جب سورج سر پر آ گیا تو خان رحیمی کو اپنے سیاہ چشمے کی ضرورت پڑی۔ یہ چشمہ اس کے بیگ میں پڑا تھا۔ بیگ مرغی خانے کے آفس نما کمرے میں رکھا تھا۔ خان رحیمی نے مخصوص انداز میں کہا۔

"گرل جاؤ چشمہ لے کر آؤ۔"

میں خود کسی ایسے موقعے کی متلاشی تھی۔ آفس نما کمرے میں جا کر میں نے دیکھا ایک بے رنگ و روغن تپائی کے گرد تین خستہ حال کرسیاں رکھی تھیں۔ پلاستر ادھڑی دیواروں پر دو پوسٹر جھول رہے تھے۔ ایک پوسٹر میں چند چوزوں کی تصویریں تھیں۔ جب

کہ دوسرے میں ایک توانا مرغ نے چونچ میں سو روپے کا نوٹ دبا رکھا تھا۔ پولٹری فارمز سے کہا گیا تھا کہ وہ اس نسل کی مرغی پالیں۔ اب معلوم نہیں مرغ سو کے نوٹ کھاتا تھا یا اگلتا تھا۔ اس دفتر میں میری دلچسپی کی چیز لوہے کا ایک دروازہ تھی۔ میں گمان کر سکتی تھی کہ یہ دروازہ کسی اٹیچ باتھ روم یا چھوٹے کمرے میں کھلتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک کوتاہ قد شخص کو بالٹی میں ایک چیز لئے تیز قدموں سے اس آفس میں گھستے دیکھا تھا۔ اس بالٹی میں نظر آنے والی شے مجھے چونکا گئی تھی۔ یہ ویسا ہی قیمہ نما گوشت تھا جو میں دو روز پہلے نورے کے مکان میں دیکھ چکی تھی۔ اس آفس میں گھسنے کے بعد جب وہ ٹھگنا شخص واپس آیا تھا تو خالی بالٹی اس کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ اس آفس میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ گوشت رکھ کر چلا گیا ہو۔ اس کا مطلب تھا آفس کے اندر سے کھلنے والے چھوٹے آہنی دروازے کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہے........... آخر وہ کیا چیز تھی جسے گوشت کھلایا گیا تھا۔

خان کے بیگ سے عینک نکالتے نکالتے میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اس آہنی دروازے کو ضرور دیکھنا ہے۔ خوش بختی سے دروازے کے ہاشمی قفل میں چابی موجود تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا پھر سب اندیشوں اور وسوسوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے نیم تاریک سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سیڑھیاں نیچے کسی تہہ خانے میں جاتی تھیں۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ سنبھل سنبھل کر اتری اور ایک ہال نما کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرے میں پہنچتے ہی خون میری رگوں میں جمنے لگا۔ میں نے تین آدمیوں کو دیکھا ان کے کندھوں سے طاقتور رائفلیں لٹک رہی تھیں اور وہ فرش پر کپڑا بچھائے تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے سر کو جنبش دیتا تو مجھے دیکھ لیتا۔ میں تیزی سے واپس مڑی مگر واپس مڑنے سے پہلے میں نے ایک نظر اس پنجرے پر ضرور ڈال لی جو ایک دیوار کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ پنجرہ تقریباً آٹھ فٹ اونچا اور پندرہ سولہ فٹ لمبا تھا۔ اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ ان خانوں میں باز' عقاب اور شاہین تھے۔ خدا کی پناہ........... ایک ساعت کے لئے مجھے لگا کہ دل دھڑکنا بھول گیا ہے۔ وہ ایک مشرقی شہباز جس کی قیمت چالیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اس پنجرے میں موجود تھا۔ مگر وہ ایک نہیں تھا اس جیسے کئی پرندے اس پنجرے میں بند

تھے۔ اس کے علاوہ گولڈن ایگل تھے اور شاہین تھے.......... میرے ابتدائی اندازے کے مطابق ان بیش قیمت پرندوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ اس کا مطلب تھا یہ کروڑوں روپے کا مال ہے۔ میں اپنی کیلکولیشن پر خود ہی چکرا گئی۔ اس وقت اس خستہ حال چار دیوار کو غالباً دنیا کا قیمتی ترین مرغی خانہ کہا جا سکتا تھا۔ اپنے حواس کو بحال کرتی ہوئی میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے دروازے کو بے آواز کھولا تھا ورنہ تہہ خانے میں بیٹھے ہوئے خونی شکلوں والے محافظ مجھے یوں واپس نہ آنے دیتے۔ میں لرزتے قدموں سے باہر نکلی۔ خان رحیمی نے پوچھا۔ "اتنی دیر لگا دی؟" میں نے کہا۔ "مل نہیں رہی تھی کپڑوں کے نیچے پڑی تھی۔" وہ عینک چڑھا کر نو آموز شاہین کی پرواز دیکھنے لگا۔

☆------------☆------------☆

صبح کا وقت تھا ابھی اجالا پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔ کوٹھی کے زیادہ تر مکین سو رہے تھے۔ میں پھولوں کی کیاریوں کو پانی دے رہی تھی۔ آہٹ ہوئی مڑ کر دیکھا تو سلیم تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ لگتا تھا جاگتا رہا ہے۔ کہنے لگا۔ "ثنا! مجھے کل رات والے واقعے پر افسوس ہے میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "سلیم میں تمہیں اتنا کمزور نہیں سمجھتی تھی۔ سچ پوچھتے ہو تو تم میری نظروں سے گر گئے ہو۔"

اس نے کہا۔ "میں تمہاری نظروں میں کبھی سربلند ہی نہیں ہوا تو گروں گا کیا' بہرحال تمہارے لئے ایک بہت اہم اطلاع ہے۔ تمہیں میرے ساتھ یوسف کے گاؤں گوپور تک جانا ہو گا۔" میں نے پوچھنے کی کوشش کی مگر سلیم یکسر ٹال گیا۔ بولا۔ "وہیں جا کر سب کچھ معلوم ہو گا۔" جب اس نے کسی طور پر نہیں بتایا تو میں نے کہا "ٹھیک ہے میں سہ پہر کو خان رحیمی سے ڈاکٹر ماڑی کی طرف جانے کی اجازت لے لوں گی تم موٹر سائیکل پر مجھے لے چلنا۔"

اس شام ہم دونوں گوپور کی طرف جا رہے تھے۔ سلیم ایک شارٹ کٹ راستہ استعمال کر رہا تھا۔ ہچکولوں سے جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا مگر امید تھی کہ ہم آدھے وقت میں گوپور پہنچ جائیں گے۔ میرے ذہن میں ان گنت سوال تھے۔ گوپور میں آخر کیا بات تھی۔ یوسف اور اس کی ماں تو خیریت سے تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے پوچھا۔ "سلیم، کہیں نورا، یوسفے کے گھر تو نہیں؟" سلیم نے اثبات میں جواب دیا۔ میں سناٹے میں رہ گئی۔ سلیم نے بتایا کہ اس نے نورے گاڑی کو ایک جگہ باندھ کر ڈال دیا تھا۔

بعد ازاں راتوں رات یوسف کے گھر پہنچا دیا۔

میں نے کہا۔ "سلیم یہ اچھا نہیں ہوا کہیں یوسف پر کوئی مصیبت نہ آ جائے۔"

وہ اعتماد سے بولا۔ "تم بے فکر رہو' یوسف پر کوئی آنچ نہیں آئے گی یہ میری ذمہ داری ہے۔"

ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم یوسف کے گھر ایک تنگ تاریک کمرے میں نورے کے سامنے بیٹھے تھے۔ نورے کے دونوں ہاتھ رسی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے پاؤں بھی ایک آزار بند میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا اس کی اکڑ فوں بالکل ختم ہو چکی ہے۔ سلیم کو دیکھتے ہی اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ لگتا تھا سلیم نے پچھلے دنوں میں اسے آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ سلیم نے چٹکی بجا کے کہا۔

"چل نورے' جو کچھ کل بتایا تھا فٹافٹ پھر دہرا دے۔ چل شاباش۔"

نورے نے پٹیوں میں جکڑی ہوئی اپنی ٹانگ کو سہلایا اور ٹیپ ریکارڈر کی طرح بولنے لگا۔ اس نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ "خان رحیمی کسی لمبے چکر میں ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس سیزن میں اس نے بہت سے شکاریوں سے باز' عقاب وغیرہ خریدے ہیں اور انہیں تربیت دی ہے۔ کچھ کو تربیت کے بغیر ہی رکھا ہوا تھا۔ یوسف کی منگنی کی رات سندھی لباس والا جو شخص کوٹھی پہنچا تھا وہ بخشو سولنگی نامی ایک مفرور ڈاکو ہے۔ وہ بیس پرندوں کی ایک کھیپ لے کر شمالی سندھ سے آیا تھا۔ وائلڈ لائف والوں کو مخبری ہو چکی تھی نتیجے میں پولیس نے سخت ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ دوسری طرف بخشو کو وعدے کے مطابق مال بھی یہاں لانا تھا۔ مجرموں کے حلقوں میں بخشو وعدے کا بہت پکا سمجھا جاتا ہے۔ اپنی اس شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے اس نے نیا ڈھنگ اختیار کیا۔ اس نے اپنے ایک شناسا انگریز ڈاکٹر کو اپنا آلہ کار بنایا۔ (یہ وہی ڈاکٹر تھا جسے سلیم نے اور پھر میں نے مرغی خانے میں دیکھا تھا) پرندوں کو ایسے انجکشن لگائے جو انہیں دیر تک بے ہوش رکھ سکتے تھے۔ بعد ازاں ان پرندوں کو ایک کفن میں رکھ کر باندھ دیا گیا۔ مردے کی صحیح جسامت دکھانے کے لئے پرندوں کے ساتھ روئی وغیرہ بھی رکھی گئی۔ اس "لاش" کو ایک چارپائی پر ڈال کر ٹرک میں رکھا گیا۔ دو تین عورتوں کا انتظام کیا گیا جنہیں لاش کے سرہانے منہ چھپائے بیٹھے رہنا تھا۔ بخشو سولنگی بھی اپنے دو خاص

کارندوں کے ساتھ ٹرک میں سوار ہو گیا۔ یوں وہ اپنے "باپ کی لاش" کو اس کی وصیت کے مطابق آبائی گاؤں میں دفنانے کے لئے ملتان سے جھنگ روانہ ہوا۔ اس کا منصوبہ کامیاب رہا اور وہ ناکہ بندیوں کے باوجود جھنگ تک پہنچ گیا مگر یہاں ایک پولیس پارٹی کو اس پر شبہ ہوا۔ نتیجے میں فائرنگ ہوئی بخشو اور اس کے دو ساتھی کسی طرح کفن سمیت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور کرائے کی عورتیں ٹرک سمیت پکڑی گئیں۔ اس شب میں نے جو کفن پوش لاش دیکھی تھی وہ دراصل یہی مسروقہ پرندے تھے۔ ان میں سے کچھ تو بے ہوش تھے لیکن کچھ ہوش میں آ رہے تھے اور پھڑپھڑا رہے تھے......... نورے نے بتایا کہ اس رات وہ پرندے بھی دوسرے پرندوں کے ساتھ مرغی خانے میں پہنچا دیئے گئے تھے اور یہ کام نورے گاڈی نے خود کیا تھا۔

ہمارے بار بار پوچھنے کے باوجود نورا اور کچھ نہیں بتا سکا۔ اس نے قسمیں کھا کر اور برگزیدہ ہستیوں کو گواہ بنا کر یقین دلایا کہ وہ اور کچھ نہیں جانتا۔ میں نے پوچھا اس کا اندازہ کیا ہے۔ خان رحیمی ان پرندوں کا کیا کرنا چاہتا ہے؟ نورے نے کہا۔

"ظاہر ہے جی' وہ ان سے پیسہ کمانا چاہتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تم کہتے ہو کہ اس نے پرندے شکاریوں سے خریدے ہیں۔ اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ گیا۔ یہ تو کروڑوں کا کھیل ہے؟"

نورے نے کہا۔ "اس بات کا کچھ پتہ نہیں جی' اس نے کئی شکاریوں کو جھولیاں بھر کر رقمیں دی ہیں۔ کوئی بڑا اثر و رسوخ والا بندہ اس کی بیک پر ہے جی' یہ کام ایسے ہی نہیں ہو رہا۔"

نورے کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سمجھا رہا ہے کہ ہم نے اس پر ہاتھ ڈال کر بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے۔

نورے سے گفتگو ختم کر کے ہم باہر آئے۔ سلیم نے یوسف کو نورے کے بارے میں ضروری ہدایات دیں اور مجھے لے کر باہر آ گیا۔ ہمیں جلد از جلد کوٹھی واپس پہنچنا تھا۔ راستے میں میں نے سلیم کو بتایا کہ کل میں مرغی خانے میں کیا دیکھ کر آئی ہوں۔ میری پوری بات سننے کے بعد وہ سخت حیران نظر آنے لگا۔ اب ہمارے لئے اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ اس علاقے میں ایک سنگین چکر چل رہا ہے اور

خان رحیمی اس پراسرار معاملے کا مرکزی کردار ہے۔ فارسٹ گارڈ جان محمد نے جو کچھ بتایا تھا وہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "سلیم! مجھے ایک اور شک ہو رہا ہے۔"

"کیسا شک؟"

"میرا خیال ہے کہ خان رحیمی ہماری اصلیت سے آگاہ ہو چکا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا نہیں.......... ہے۔ ہم دونوں ہی بڑے بے وقوف ہیں۔ وہ مرغی خانہ چاروں طرف سے سخت نگرانی میں ہے۔ پہلے میں اور تم دونوں وہاں منڈلاتے رہے پھر میں نے تمہیں تنہا سن گن لینے کے لئے بھیجا۔ وہ لوگ ضرور ہمیں دیکھ چکے ہیں۔"

سلیم نے موٹر سائیکل ایک جانب درختوں میں روک دی۔ جیکٹ کی جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔ "مجھے بھی وہ شخص یاد آ رہا ہے جس نے مرغی خانے سے واپسی پر میرا نام پتہ پوچھا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ مرغی خانے کے نگرانوں میں سے ہو۔"

"یقیناً ایسا ہی ہو گا۔" میں نے اس کی تائید کی۔ کچھ دیر ہم دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم رہے۔ "اب کیا کرنا چاہئے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اوپر تلے گہرے کش لئے اور بولا۔ "ان حالات میں تو چودھری شباب کا خیال آ رہا ہے۔ وہی کچھ مشورہ دے سکتا ہے۔"

معلوم نہیں سلیم ایسا طنز سے کہہ رہا تھا یا سنجیدگی سے رائے دے رہا تھا۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ اب خان رحیمی کی چار دیواری میں ہمارے لئے بہت سے خطرات پوشیدہ ہیں۔ بظاہر خان رحیمی کا رویہ اب تک نارمل تھا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ بے خبر ہے۔ وہ ایک گہرا شخص تھا اور درست موقعے پر درست فیصلہ کرنا جانتا تھا.......... ہم کوٹھی سے تقریباً تین فرلانگ کی دوری پر پہنچ چکے تھے۔ میری رسٹ واچ کی سوئیاں آٹھ بجے کا وقت دکھا رہی تھیں۔ پوری رات کا چاند آہستہ آہستہ جنگل پر طلوع ہو رہا تھا۔ اس کی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا سیاہ زمین پر کسی نے سفیدی کے چھینٹے اڑا دیئے ہوں۔ ہوا مشرق سے مغرب کی طرف چل رہی تھی اور یہی وجہ تھی کہ تین فرلانگ دور کوٹھی میں بھونکنے والے سینٹ برنارڈ کتوں کی آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ کوٹھی کی بالائی منزل کی روشنیاں بھی بہت

نیچے جھکے ہوئے ستاروں کی مانند دکھائی دیتی تھیں.......... ہم موٹر سائیکل کے پاس کھڑے آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہے تھے کہ اچانک جیپ کا ہارن سنائی دیا۔ میں ایک لمحے میں پہچان گئی کہ یہ خان رحیمی کی ٹویوٹا جیپ ہے۔ ہوا کا رخ مخالف تھا اس لئے جیپ کی آواز اس وقت آئی جب وہ بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بھاگ نکلنے کا فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ ایسے کاموں کے لئے پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم نے ابھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر ایک دفعہ ہم بھاگ اٹھتے تو پھر واپسی کے راستے بند ہو جاتے تھے۔ ہمارے سوچتے ہی سوچتے جیپ سر پر پہنچ گئی۔ ہم نیم پختہ راستے سے تھوڑا سا ہٹ کر کھڑے تھے' تھوڑا سا اور ہٹ گئے' جیپ ہچکولے کھاتی ہمارے پاس سے گزری۔ ایک دو لمحوں کے لئے امید بندھی کی شاید وہ لوگ ہمیں دیکھے بغیر گزر جائیں.......... مگر کچھ آگے جا کر جیپ رک گئی۔ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ہماری موٹر سائیکل جیپ سواروں کی نظر سے اوجھل نہیں رہی تھی۔ جیپ کو رکتے دیکھ کر سلیم نے زور سے آواز دی۔

"غازی.......... غازی۔"

"غازی" جیپ کے ڈرائیور کا نام تھا۔ جیپ سے دو سائے چھلانگیں لگا کر اترے اور ہمارے طرف بڑھے۔ سلیم نے پھرتی سے جھک کر موٹر سائیکل کا پلگ والا تار کھینچ دیا۔

"کیا ہوا؟" ڈرائیور غازی نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" سلیم نے جواب دیا۔ "پلگ کا تار ٹوٹ گیا تھا۔"

"ہم تو پریشان ہو رہے تھے آپ دونوں کے لئے۔" غازی نے کہا۔

اتنے میں خان رحیمی بھی موقعے پر پہنچ گیا۔ وہ حسب معمول مسکراتی نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کلینک سے واپس آتے ہوئے موٹر سائیکل خراب ہو گئی ہے۔ وہ بولا۔ "بوڑھی چیز کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا اور جب اسے جوانوں کے ساتھ چلنا پڑے تو بریک ڈاؤن تو ہو کر رہتا ہے۔" پھر اس نے غازی کو ہدایت کی کہ وہ موٹر سائیکل کو ٹھیک کر کے لے آئے۔ مجھے اور سلیم کو اس نے جیپ میں سوار کرا لیا۔ غازی کا ساتھی بھی موٹر سائیکل کے پاس ہی رہ گیا تھا۔ جیپ میں اب ہم تینوں تھے۔ یعنی میں' سلیم

اور خان رحیمی۔ خان رحیمی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہنس کر بولا۔

"میں تو فکر مند ہو گیا تھا۔ ابھی ڈاکٹر ماڑی کے کلینک سے آ رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ وہ تو چھ بجے ہی چلے گئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ موٹر سائیکل خراب ہو گئی ہو گی' آئی تھنک قصور میرا ہی ہے۔ اس موٹر سائیکل کی خطاب معاف ہو جانی چاہئے......... میں تمہیں کل دوسری موٹر سائیکل دلوا دوں گا۔ اس موٹر سائیکل کا حال تو اس کار جیسا ہے جسے دیکھ کر کسی نے اس کے مالک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس میں تھوڑے سے پیسے ڈال کر نئی سائیکل کیوں نہیں لے لیتا۔"

میں نے کہا۔ "سر! آپ بھی اس موٹر سائیکل میں پیسے ڈال کر دیتو کو سیکنڈ ہینڈ سائیکل لے دیں۔"

وہ بولا۔ "ایسا ہی کرنا پڑے گا ورنہ پھر کسی روز تم دونوں کے پیچھے بھاگوں گا۔"

میں نے کہا۔ "سر! بہت افسوس ہے آپ کو اتنی سردی میں ہمارے لئے تکلیف اٹھانا پڑی۔"

"نو فار میلیٹیز۔" اس نے انگلی اٹھائی۔ "میں' تمہیں بتا چکا ہوں' میں تکلف کرنے والے کا سر پھاڑ دیتا ہوں........."

خان رحیمی کے رویے سے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا۔ کبھی لگتا وہ بالکل بے خبر ہے۔ کبھی لگتا کہ وہ ہم سے بلی چوہے کا کھیل کھیل رہا ہے۔ میں نے کن انکھیوں سے سلیم کی طرف دیکھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور پوری طرح چوکنا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کرنے والا ہے۔ اس کے نتھنے غیر محسوس طور پر پھولے ہوئے تھے اور آنکھوں میں تیز چمک تھی......... اور پھر یکایک وہ سب کچھ ہو گیا جس کی توقع میں کر رہی تھی۔ سلیم نے اپنی جیکٹ کی جیب سے 38 بور کا ریوالور نکالا اور خطرناک لہجے میں بولا۔

"خان رحیمی! جیپ روک دو۔"

خان رحیمی کے جسم کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے مڑ کر سلیم کی طرف دیکھا۔ جیپ خودبخود رستے سے اتر گئی۔ خان رحیمی نے بریک لگا کر اسے روک لیا۔ خان کا ہاتھ جیپ کے ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں بھرا ہوا پستول ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

"سوری سر!" میرے منہ سے نکلا۔

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے نے ایک لمحے میں کئی رنگ بدلے۔ سلیم نے غرا کر کہا۔ "شاہدہ! ڈیش بورڈ سے ریوالور نکال لو۔" میں نے ایسا ہی کیا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر خان رحیمی کی جیبوں کی تلاشی لی اور سخت لہجے میں بولا۔ "خان! جیپ کو موڑو' بائیں طرف چلو۔"

بائیں طرف ایک کچا راستہ تھا جو غالباً گورپور کی طرف جاتا تھا۔ خان نے سنبھل کر کہا۔ "بابری وٹ از گوئنگ آن' یہ کیا پاگل پن ہے!؟"

سلیم غرایا۔ "زیادہ بھولا مت بن خان' چالاکی دکھائے گا تو بڑھاپا خراب کر دوں گا' جیپ اسٹارٹ کر۔"

خان رحیمی نے ایک گہری سانس لی "تو میرا اندازہ درست تھا تم دونوں وہ نہیں جو ظاہر کر رہے ہو۔"

سلیم نے کہا۔ "تمہارا اندازہ درست تھا اور ہمارا بھی غلط نہیں تھا......... تم جیپ اسٹارٹ کرو۔" اس نے ریوالور خان رحیمی کی گردن پر رکھ دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی شخص کی گردن پر پستول دیکھا اور اس نظارے نے دل پر عجیب سی ہیبت طاری کر دی۔

سلیم کی ہدایت پر خان رحیمی نے جیپ اسٹارٹ کی اور بائیں طرف جانے والے رستے پر موڑ لی ایک فرلانگ آگے جا کر اس نے جیپ پھر روک لی اور بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں آپس میں چند ضروری باتیں کر لینی چاہئیں۔ ایسا کرنے میں تینوں کا فائدہ ہے۔"

"کیسی باتیں؟" سلیم نے پوچھا۔

خان رحیمی ریوالور کی نال سے قطعی خوفزدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالکل عام سے لہجے میں ریوالور کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اس باسٹرڈ کو پیچھے ہٹاؤ تو کچھ عرض کروں مجھ سے تم جوانوں کو خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔"

سلیم نے ریوالور کی نال اس کی گردن سے ہٹا لی مگر رخ خان رحیمی کی طرف ہی رکھا۔ خان رحیمی نے کہا۔ "ہاں مسٹر سلیم! اب بتاؤ کیا بات ہے مجھے معلوم ہے تم غصے کے

بہت تیز ہو۔ کیوں شاہ واصف میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" ہم دونوں شدید حیرت کے عالم میں خان رحیمی کا منہ تکنے لگے۔ اس نے کہا۔ "ڈونٹ وری۔ میں تم دونوں کے بارے اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم اپنے بارے میں جانتے ہو۔ تم دونوں لاہور میں موہنی روڈ کے رہنے والے ہو۔ تمہاری پہلی ملاقات آج سے ساڑھے تین برس پہلے گورنمنٹ گرلز کالج کے سامنے ہوئی تھی۔ ہوئی تھی یا نہیں؟" ہم دونوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ بولا۔ "اب تم پوچھو گے کہ مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟ اس کا جواب بہت طویل بھی ہے اور بہت مختصر بھی ہے۔ میں جس پیشے میں ہوں اس میں نہ صرف آنکھیں کھلی رکھنی پڑتی ہیں بلکہ ان آنکھوں کو بہت احتیاط سے استعمال بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں نے تم دونوں کو اس وقت پہچانا جب تم گمشدہ باز لے کر میرے پاس پہنچے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ تم دونوں میں پہلے سے کوئی تعلق موجود رہا ہے۔ میں نے اپنے طور پر تحقیق کرائی اس دوران تم دونوں مرغی خانے کے گردونواح میں گھومتے پائے گئے اور تمہارے بارے میں میرے شکوک اور پختہ ہو گئے۔ بہرحال اس وقت میں تمہارے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں اب تم مانو یا نہ مانو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

خان رحیمی کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے اور اس سے کچھ بھی چھپانا فضول ہے۔

سلیم نے کہا۔ "اگر تم بہت کچھ جانتے ہو تو ہم بھی کچھ نہ کچھ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ تم بتا دو گے' دوسری صورت میں.........."

"دوسری صورت میں تم مجھ کو ٹارچر کرو گے۔ مجھے مارو پیٹو گے؟" سلیم نے اثبات میں جواب دیا۔ خان رحیمی نے تمباکو کی پوٹلی نکالی اور اطمینان سے پائپ بھرنے لگا۔ وہ ہم سے بچوں جیسا برتاؤ کر رہا تھا۔ اس کا یہ انداز سلیم کو کسی بھی وقت غصے سے بے قابو کر سکتا تھا۔ میں اس صورت حال سے ڈر رہی تھی۔ خان رحیمی نے پائپ سلگا کر کہا۔

"مجھے یہاں سے لے جا کر تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔ یوں سمجھو کہ تم اپنا مشن اپنے ہاتھوں سے برباد کر لو گے۔ میں اس وقت تمہیں تفصیل سے کچھ نہیں بتا سکتا۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ تم مجھے اپنا حریف سمجھ رہے ہو اور یہ بالکل غلط ہے۔"

سلیم نے بھنا کر کہا۔ "خان رحیمی یہ چکر کسی اور کو دینا فی الحال تم یہ جیپ اسٹارٹ

کرو اور میرے کہنے کے مطابق چلو۔"

سلیم ہر صورت خان رحیمی کو اپنے ساتھ

خان رحیمی نے فوراً اس کی بات نہ مانی تو وہ خان

[illegible] تھا کہ ایسا نہ ہو۔ گو اب خان رحیمی کی بار

[illegible] سے پولٹری فارم کا تہہ خانہ دیکھ چکی تھی

[illegible] مگر خان رحیمی جو اشارہ دے رہا تھا وہ بھی قابل

[illegible] جو بظاہر نظر آ رہا تھا۔ سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ

[illegible] جان چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ابھی تک ہم پر ہاتھ

[illegible] جانتے بوجھتے ڈھیل دیتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ میرے

[illegible] کا چہرہ بھی گھوم رہا تھا۔ اس نے عرصہ پہلے جاگیردار واصف

[illegible] ہونے والی جس گفتگو کا ذکر کیا تھا اس سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ

[illegible] کا کرتا دھرتا نہیں بلکہ ایک پرزہ ہے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا

[illegible] خان رحیمی پر اعتبار کیا جائے۔

میں نے کہا۔ "خان صاحب یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ آپ کے تعلقات چنگیزیوں سے [illegible] ان سے چوری چھپے ملاقاتیں کرتے ہیں اس مرغی خانے میں آپ نے کروڑوں [illegible] ناجائز پرندے رکھے ہوئے ہیں۔ ملک کے بدنام ترین لوگ آپ کے لئے کام کر [illegible] ابھی پچھلے ہی دنوں مفرور ڈاکو بخشو سولنگی ایک کفن میں پرندے چھپا کر آپ [illegible] ہے۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا قانون شکنی یہاں ہو رہی ہے۔ آپ [illegible] دھندے کی نگہبانی کر رہے ہیں جو ملک کو کروڑوں روپے کا نقصان پہنچا رہا

خان رحیمی کے چہرے پر حیرت تھی۔ وہ مسکرایا۔ "ویل ڈن! تم دونوں نے کافی [illegible] کر لی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تم میں قابلیت ہے۔ میں تمہارے [illegible] جواب ضرور دوں گا مگر اس وقت نہیں۔ یہ ایک بہت سنگین کھیل ہے۔ تم [illegible] بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے۔ اگر جلد بازی کرو گے تو [illegible] جائے گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو میں وہی کروں گا جو ہم سب کے لئے بہتر ہو گا۔